مضامینِ اختر جوناگڑھی

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ، کراچی۔

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

مضامین اختر جوناگڑھی

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ کراچی ۱

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان، نمبر ۴۷۵

ISBN. 969-403-007-2.

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح انجمن کو بھی اشاعتِ
کتب کے لیے اکادمی ادبیاتِ پاکستان سے امداد ملتی ہے)

/13/262

اشاعتِ اوّل: ۱۹۸۹ء

تعداد: ایک ہزار

طابع: انجمن پریس، نشتر روڈ، کراچی

قیمت: ساٹھ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

۱۔ حرفے چند	۷
۲۔ ولی گجراتی	۱۷
۳۔ ولی گجراتی (تصحیح و استدراک)	۷۲
۴۔ ولی گجراتی (استدراک)	۸۹
۵۔ ولی کا سنِ وفات	۱۰۳
۶۔ دیوانِ ولی کا قدیم ترین مخطوطہ	۱۱۶
۷۔ کلیاتِ ولی (طبع دوم پر ایک نظر)	۱۳۱
۸۔ تذکرۂ ولی	۱۷۸
۹۔ گجرات کے چند قدیم شعرائے اردو	۲۱۴
۱۰۔ اشرف گجراتی	۲۳۱
۱۱۔ نثر اردو کا مجدد۔ غالب	۲۶۷
۱۲۔ غالب کا ایک شعر	۲۷۸
۱۳۔ مرزا غالب اور امیر مینائی	۲۸۱
۱۴۔ اردو ادب کے معمار۔ شبلی نعمانی	۲۸۸
۱۵۔ علامہ شبلی کا سفرنامہ	۲۹۷
۱۶۔ علامہ شبلی، بحیثیت شاعر	۳۰۸
۱۷۔ اسلامی ادبیات کا ناشرِ اعظم۔ منشی نول کشور	۳۴۲
۱۸۔ اردو زبان، صحیح تلفظ اور صحیح ترجمہ	۳۶۳
۱۹۔ گزشتہ سو سال کا اردو ادب	۳۷۰
۲۰۔ انگریزی ادبیات اور ہندوستان	۳۷۹
۲۱۔ اردو کا صحافتی ادب	۳۹۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی،
انجمن ترقی اردو پاکستان

حرفے چند

یہ اشاعت ایک خاص تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔

یہ سطریں نہ تو اس کتاب کے ساتھ انصاف کر سکیں گی، نہ صاحبِ کتاب کے ساتھ، لیکن پیش کرنی ضروری ہیں۔ بعض اہلِ علم و تحقیق قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے حوالے اب بھی دیتے ہیں، لیکن اکثر لوگ ان کے علمی کارناموں سے واقف ہی نہیں۔ بیشتر اشاعتیں نایاب اور حالات نئی نسلوں کے لیے تو بالکل نامعلوم۔ ہم نے سوچا قارئین کو کچھ نہ کچھ تو بتا دیا جائے۔

اس کتاب میں ۲۰ مقالے ہیں۔ کتابی شکل میں غیر مطبوعہ، مگر بیشتر شائع شدہ اور بعض ریڈیائی تقریریں، جن کی علمی اہمیت مسلّم ہے۔۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے انتقال پر بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق جیسے محتاط اور غلو سے بری شخصیت کی تقریر سے اقتباس ملاحظہ ہو جو "قومی زبان" کے بابائے اردو نمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ ان مرحوم کے بیان فضائل میں اسے سب سے اچھا خلاصہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

"ایسا صاحبِ فضل و کمال، ایسا محقق، اسلامی تاریخ کا ایسا ماہر، ایسا صاحبِ نظر اب ہم میں کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ سراسر علمی شخص تھے۔"

اس بیان میں بابائے اردو سے کسی قدر جذباتیت منسوب کی جا سکتی ہے

کیوں کہ قاضی صاحب انجمن کے بُرے وقت میں انجمن اور بابائے اُردو کے ساتھی بھی رہے ۔ یہ بھی ہے کہ تحقیق ایک مستقل کاوش ہے جو مسلسل انکشافات کرتی رہتی ہے اور اس لیے بعض معاملات میں مثلاً ولی دکنی سے متعلق یا اُردو سانیٹ کی اوّلیت کے بارے میں قاضی صاحب کے بعض دعاوی پر جدید تحقیقات کچھ اضافے کرے، مگر اس میں شک نہیں کہ بابائے اُردو نے ان کی فضیلت اور محنت سے متعلق کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے۔

قاضی صاحب مرحوم کا کام بھی بہت پھیلا ہوا ہے اور ان کی شخصیت بھی اتنی دل چسپ اور کئی لحاظ سے اہم ہے کہ وہ ایک پورے مقالے، پوری کتاب کے مستحق ہو چکے ہیں (انجمن دعوت دیتی ہے کہ کوئی صاحب ان پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھیں تو وہ انہیں ضروری امداد اور معاونت پیش کرے گی) آزادی کے حوالے سے ان کا نام تقسیم کے دو ڈھائی برس بعد تک پاکستان میں نہیں ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں بھی ایک افسانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ انہیں ریاست جوناگڑھ سے فرار ہو کر پرتگال کے زیرِ انتظام بحرِ ہند کے ایک جزیرے "دیو" میں پناہ لینی پڑی تھی۔ مشہور یہ رہا کہ وہ وہاں سے ایک انقلابی ریڈیو اسٹیشن چلاتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں تھا۔ ان مخصوص حالات میں جو ریاست جوناگڑھ کے پاکستان میں رضاکارانہ انضمام کے نتیجے میں پیدا ہوئے ۔ قاضی صاحب بہت سی غلط فہمیوں کی بنا پر اور اس بنا پر بھی کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ گجرات کے صدر رہ چکے تھے۔ حکومتِ ہند قاضی صاحب کو مواخذے یا وضاحت کے لیے طلب کر رہی تھی۔ وہ مفرور قرار دے دیئے گئے تھے۔ "جزیرہ دیو" میں طرح طرح کی مشکلات سے گزر رہے تھے کہ بعد میں یہ سب کہانی انہوں نے انگریزی میں تحریر بھی کر دی تھی اور اسے کتابی صورت میں آنا تھا لیکن نہ معلوم کیوں وہ یہاں نہ چھپ سکی (چھپی ہو تو راقم الحروف کو دستیاب نہیں)

نہ جانے کن طریقوں سے، جن کی تفصیل معلوم نہیں، وہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان پہنچے اور یہاں ہم نے، ہماری حکومت نے۔۔۔ پورے معاشرے نے۔۔۔ ان کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا کسی قدر تذکرہ بھی آگے آئے گا۔

راقم الحروف کو اس امر پر ہی فخر ہے کہ اس نے قاضی صاحب کو دیکھا۔ یہ ۵۱-۱۹۵۰ء کی بات ہے جب وہ کبھی کبھی انجمن میں کام کرنے والے مشاہیر کی زیارت کرنے چلا جاتا تھا، لیکن تفاوت عمر و مزاج اور ابتدائے ہجرت میں اپنے پریشان کن مسائل کے سبب نہ ان سے اتنا قریب ہو سکا نہ فیض اٹھا سکا کہ ذاتی معلومات یا تاثرات کی بنیاد پر ان کا اور ان کے فضائل کا ایک خاکہ مرتب کر سکے۔ سوانح کے باب میں جو کچھ عرض کیا جائے گا وہ بزرگوں سے استفادے اور ان کے بارے میں مندرجہ ذیل شائع شدہ مواد کے مطالعے سے اخذ کردہ مواد پر مبنی ہے اختصار و انتخاب راقم الحروف کی صوابدید سمجھیے۔۔۔

"راہی اور رہنما" از: مولانا سید الطاف علی بریلوی مرحوم۔

"مقالاتِ اختر" شائع کردہ ترقی اردو بورڈ، کراچی پر مقدمہ

از: ممتاز حسن مرحوم

"قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کی یادیں"

از: ممتاز حسن مرحوم (ماہنامہ "العلم" کراچی، جولائی، ستمبر ۱۹۵۹ء)

"پیر حسام الدین مرحوم کی یادداشتیں" (ماہنامہ "العلم"، کراچی " ")

"کیا قافلہ جاتا ہے" (خاکوں پر مبنی تصنیف) از: جناب نصر اللہ خاں

"قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی" از: جناب تحسین سروری مرحوم

(مطبوعہ سہ ماہی "اردو" شمارہ ۴)

"اردو کا پہلا سانیٹ" از: قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم۔

(بعد وفات نومبر ۱۹۷۲ء کے ماہنامہ "طلوع افکار" میں شائع ہوا)

"اختر جوناگڑھی کے سانیٹ کی مزید تحقیق" از: جناب سید ایچ ترمذی

("العلم"، کراچی ۔ قائداعظم نمبر، جولائی، ستمبر ۱۹۷۶ء)

قاضی صاحب ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۶ اگست ۱۹۵۵ء کو بہ عارضہ قلب حیدرآباد میں انتقال کیا ان کے آباؤ اجداد کا وطن سندھ تھا، مگر عہدِ فرخ سیر میں سندھ سے جاکر جوناگڑھ میں مقیم ہوگئے تھے اس لیے چند پشت سے گجراتی کاٹھیاواڑی کہلاتے تھے ۔اس خاندان کی مادری زبان گجراتی ہو چکی تھی، لیکن اس زمانے کی اعلیٰ روایات کے مطابق وہ فارسی عربی میں بھی فضیلت سے متصف تھے ۔قاضی صاحب نے رواجی تعلیم انٹرمیڈیٹ تک حاصل کی ۔ (جو اس وقت اس علاقے کے لیے بڑی بات تھی) اور فارسی، عربی کا ذوق .. اور اس میں مہارت . . . . فیضِ بزرگاں کے عطیے تھے ۔ وہ جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن ملازمت بھی کی اور کئی علمی، سماجی اداروں کے فعال عہدہ دار بھی رہے (ان معلومات کا اشاریہ کتاب کے آخر میں دیا جا رہا ہے)

قاضی صاحب کثیر التصانیف تھے ۔مطبوعہ وغیر مطبوعہ کاموں کی تفصیل جو معلوم ہوسکی درجِ ذیل ہوگی ۔یہ ملاحظہ کرتے وقت دھیان رہے کہ وہ پاکستان آنے تک تصنیف و تالیف کے پیشے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ملازمت پیشہ بھی تھے ۔اپنی زمینات کا انتظام بھی کرتے تھے ۔سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے اور اتنا لکھنے کے لیے کتنا پڑھنا پڑتا ہوگا . . . . . یہ بھی کہ تصنیف و تالیف (اور اشاعت) کا سلسلہ ۱۹۱۴ء سے یعنی بہ عمر سترہ برس شروع ہو گیا تھا جو تقسیم ہند تک بڑے زور و شور سے جاری رہا . . . .

مطبوعہ تصانیف

(۱) حیاتِ نظامی گنجوی، الناظر پریس لکھنؤ (۱۹۱۴ء)

(۲) اسلام کا اثر یورپ پر ۔ دائرہ ادبیہ لکھنؤ (۱۹۲۰ء)

(۳) زرگل (ادبی مقالات) آگرہ اخبار پریس، آگرہ (۱۹۲۸ء)

(۴) مترجمات (عربی اور انگریزی سے علمی مضامین کے تراجم) آگرہ اخبار پریس آگرہ (۱۹۲۸ء)

(۵) طبقات الامم (اردو ترجمہ) معارف پریس، اعظم گڑھ (۱۹۲۸ء)

(۶) علم اور اسلام (فرنچ پروفیسر ارنسٹ رنے کا ترجمہ) معارف پریس اعظم گڑھ (اس مقالہ میں اسلام پر جو اعتراضات کیے گئے تھے۔ ان کا جواب بھی دیا گیا ہے) (۱۹۳۰ء)

(۷) لمعاتِ اختر (انگریزی شعرا کی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ) (۱۹۲۸ء)

(۸) اسلامی کتب خانے (اطالوی مصنف مس اولگا پنٹو کے مضمون کا ترجمہ مع حواشی)

(۹) سی پارۂ دل (رئیس اردو غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۴۵ء۔

(۱۰) "اسٹڈی ان اسلامک اینڈ اورینٹل (" اسلامک کلچر" میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ) اشرف پریس لاہور (۱۹۴۵ء)۔

(۱۱) اقبالیات کا جائزہ، اقبال اکیڈیمی، کراچی (۱۹۵۵ء)

(۱۲) تذکرۂ اہلِ دہلی (آثار الصنادید کا چوتھا باب مع حواشی) انجمن ترقی اردو کراچی (۱۹۵۵ء)

غیر مطبوعہ تصانیف / مجموعے۔

(۱) مقالاتِ اختر (اردو مضامین، تین جلدیں)

(۴) مقالاتِ اختر، فارسی، (۵) مقالاتِ اختر، گجراتی۔

(۶) مقالاتِ اختر (اسلامیات پر مضامین) غزلیات نظامی گنجوی (مختلف نسخوں سے ایڈیٹ کیا ہوا مجموعہ، جسے انہوں نے ایران کے محقق وحید دستگردی مرحوم کو دے دیا اور انہوں نے اسے گنجینۂ گنجوی میں قاضی صاحب کے حوالے سے شامل کیا)

(۷) گجراتی تاریخ پر کام (یہ تین جلدوں میں مکمل ہونا تھا)

(۸) صنعتِ دراقہ، صحرا نشین اور ولی گجراتی پر مقالات۔

(۹) گجرات کے کتب خانہ پیر محمد شاہ کی مفصّل فہرست۔

یہ ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں، لیکن راقم الحروف نے ممتاز حسن مرحوم اور پیر حسام الدین راشدی مرحوم سے بار بار سنا کہ قاضی صاحب نے اس سے بھی کہیں زیادہ لکھا تھا۔ کچھ حصّہ مہاجرت میں ضائع ہوا اور کچھ حصّہ جو یہاں بھی لکھا گیا وہ بھی ان کی وفات کے بعد حالات کی نذر ہو گیا۔

جب قاضی صاحب بصد پریشانی و خرابی پاکستان پہنچے (۱۹۴۹ء) تو غالباً ان کی خود داری کے سبب ان کے لیے کوئی مناسب بندوبست نہ ہو سکا۔ راقم الحروف عینی گواہ ہے اور آج لاکھوں نہیں تو ہزاروں دوسرے بھی عینی گواہ زندہ ہوں گے جو یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہندوستان سے آنے والے بہت سے بے حیثیت لوگوں نے کس بری طرح ہجرت فروشی کر کے اپنے استحقاق سے کہیں زیادہ جائداد اور مفادات پر قبضہ کیا اور بہت سے بڑے بڑے باحیثیت لوگ اس زرگری کی دوڑ سے گریزاں رہے۔

قاضی صاحب دوسرے طبقے میں آتے ہیں۔ انہیں بہ مشکل ایک تنگ محلّے میں ایک عمارت کی پانچویں منزل پر (جبکہ عمارت میں لفٹ نہیں تھا) ایک مختصر سا فلیٹ ملا (بعد میں جب ان کی چند سو کتابیں کسی نہ کسی طرح جوناگڑھ سے آگئیں تو ان کے لیے ایک الگ اور خراب ..... جگہ لینی پڑی تھی) ایک کاروباری ادارے میں معینہ طور پر ایک ہزار روپے کی ملازمت بہ صیغہ حساب داری بھی ملی، مگر وہ اس مزاج کے نہ تھے (راقم الحروف کو اس روایت میں شک ہے کہ اس وقت کوئی اکاؤنٹنٹ کو ایک ہزار روپے ماہوار پیش کرے گا) بہر حال وہ بے کار رہے۔ کچھ مدّت بعد بابائے اُردو، جو اُن کی فضیلت اور علمی کارناموں سے واقف تھے خود جا کر انہیں انجمن میں کام کرنے کے لیے لے آئے لیکن انجمن کی مالی حالت بہت سقیم تھی۔ گزارہ مشکل رہا۔ خاندان سات بچوں پر

مشتمل تھا۔ دوسرے متوسلین بھی تھے۔ بہرحال اس زمانے میں انہوں نے انجمن کے علمی منصوبوں کو خوب سنبھالا۔ ان سب کا اعتراف بابائے اُردو اور دوسرے محترم متعلقین انجمن وار دو نے بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔

۱۹۵۲ء میں غالباً پیر حسام الدین راشدی مرحوم اور ممتاز حسن مرحوم اور ڈاکٹر آئی۔ آئی۔ قاضی مرحوم کی کوششوں سے وہ جامعہ سندھ میں بطور استاد مقرر ہوگئے۔ یافت وہاں تھی کم بھی۔ حیدر آباد سے کراچی آنا جانا بھی رہتا تھا۔ مالی طور پر دن اب بھی اچھے نہیں گزرے۔ صدر شعبہ ہوئے تو کسی طور اطمینان کا زمانہ آیا۔ مگر وہ دور زیادہ دن تک نہ چلا اور وہ اس کے بعد بہت جلد (۱۹۵۵ء میں) انتقال کر گئے۔

"ہم" نے اردو، فارسی، عربی، اسلامیات کے ایک مستند عالم اور کثیر التصانیف بزرگ اور تحریکِ پاکستان کے ایک نہایت فعال کارکن (صدر گجرات مسلم لیگ) کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ . . . اب بھی موقع ملے تو ایسا ہی کرتے ہیں تاوقتیکہ کوئی خود بڑھ کر مینا نہ اُٹھالے (اور خود دار لوگ اب بھی ایسا کم کرتے ہیں) . . . قاضی صاحب کی فضیلت ممتاز حسن مرحوم کے مضمون میں ان کے ایک قول سے عجیب طرح ظاہر ہوتی ہے:

> "میں نے مولانا میمن (علامہ عبدالعزیز میمن راج کوٹی مرحوم) کو یہ کہتے سنا ہے کہ جو میری کمزوریاں ہیں وہ قاضی صاحب کے کمالات ہیں۔"

اسی مضمون سے ممتاز صاحب کا ایک اور قول ملاحظہ ہو:-

> "ایک بات جو مولانا اور قاضی صاحب میں مشترک دیکھی۔ وہ یہ تھی کہ دونوں میں سے کسی کے ہاں سرسری اور سطحی کام کی گنجائش نہیں تھی۔"

سیّد الطاف علی بریلوی مرحوم نے اپنے مضمون میں کہا ہے:-

> "مملکتِ پاکستان میں علامہ سیّد سلیمان ندوی کے

بعد صحیح معنیٰ میں علمی شخصیت اگر کوئی تھی تو وہ قاضی صاحب کی تھی ایسا مستحضر علم ہم نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ قریب قریب ہر علم وفن پر قیمتی سے قیمتی معلومات ان کی نوکِ زبان تھیں۔"

جناب نصر اللہ خاں، ڈاکٹر وفا راشدی اور جناب تحسین سروری (مرحوم) کے مضامین قاضی صاحب کے تبحرِ علم اور ان کی گفتگو سے ہی بے شمار موضوعات پر بڑے بڑے ذخائر علمی و ادبی کا پتہ مل جانے کا تذکرہ سناتے ہیں۔ ایک یہ بات بھی تا حال ناقابلِ تردید لگتی ہے کہ اردو کا پہلا باقاعدہ سانیٹ قاضی احمد میاں اختر نے لکھا تھا۔ بہاء الدین کالج میگزین، جوناگڑھ ۱۹۱۵ء) اور رسالہ زبان مانگرول (کاٹھیاواڑ) اگست ۱۹۲۱ء کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ن۔م۔ راشد صاحب کی خودنوشت سوانح سے بھی یہ نقل کیا گیا ہے کہ اردو میں پہلا سانیٹ قاضی صاحب نے لکھا تھا (ملاحظہ ہو سیدوی ایم ترمذی صاحب کا محولہ بالا مضمون)۔ . . . یہ الگ بات کہ اپنے استاد کی فہمائش پر جو روایت سے انحراف پسند نہیں کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے مزید سانیٹ نہیں لکھے۔ روایتی اصناف میں شعر کہتے رہے۔

اس فضیلت اور متنوع طبعیت کی شخصیت ہمارے مطالعے کے لیے بہت اہم ہو جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں بیس مقالات ہیں۔ ولی دکنی (گجراتی) سے متعلق ہی سات مضامین اور اس موضوع پر قاضی صاحب کا اختصاص سب اہلِ علم کو معلوم ہے۔ ان مقالات کی علمی ادبی حیثیت پر راقم الحروف کچھ بھی عرض کرنے کا اہل نہیں سوائے اس کے کہ اپنی بساط کے مطابق خوشہ چینی کرے۔ ہاں قاضی صاحب کا مختصر احوال اور ان کے خصائص پر چند مستند و محترم بزرگوں سے جو ملا۔ اس کا خلاصہ اس لیے کر دیا ہے کہ قاضی صاحب کے شخصی اور علمی پس منظر کا کسی قدر ریکارڈ تو محفوظ ہو جائے۔ اس بہلانے سہی . . . . افسوس کہ ہم

بعض مقالوں کے متعلق ایسی مستند معلومات جمع نہیں کر سکے جو نشان دہی کرتیں کہ وہ کب اور کہاں چھپے تھے۔ جہاں ممکن تھا مقالے کے آخر میں بتادیا گیا ہے۔
ریڈیائی تقریریں مختصر ہی ہوتی ہیں۔ ایک آدھ مقالے میں کتابیات موجود نہیں (مثلاً "گذشتہ سو سال کا اردو ادب") اور قاضی صاحب مرحوم کی اپنی پسند ناپسند بیان وانتخاب واقعات میں آمیز بھی ہو جاتی ہے جو ان کا حق ہے (اور موجودہ روشِ وقائع نگاری کو دیکھتے ہوئے تو وہ بڑے محتاط نظر آتے ہیں) لیکن یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایسے مقالے قاضی صاحب کو فرمائش پر اور مختصر مدّت میں لکھنے پڑے۔
حالی و شبلی پر بعد میں بہت کام ہوا اور بڑے فاضلانہ موازنے آج جاری ہیں۔ (اور رہیں گے) غالب سے متعلق تقریباً ہر موضوع اور ہر فرد پر نئے سے نئے تحقیقی خزانوں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ . . .

مختصراً ان مقالوں کے بہت سے موضوعات آج بھی نئی تحقیق اور نئے (مختلف) آرا کا مضمون بنے ہوئے ہیں اور ان کی اہمیت اور ضرورت . . . . . .
میں کلام نہیں، لیکن قاضی صاحب کا کام تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے اگر ہم ان کا دور اور وسائل سامنے رکھیں تو ہمیں ان کی جستجو اور گفتگو کو صدق دل سے خراجِ تحسین پیش کرنا پڑے گا . . . . . .

اس خراجِ تحسین سے ہماری مالی حیثیت کے مطابق یہ کتاب ایک نذرانہ ہے جو انجمن بڑی خوشی کے ساتھ احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم کے عظیم الشان ذخیرے سے لے کر اردو قارئین کے سامنے پیش کر رہی ہے۔

امید ہے کہ اس کی اہمیت اور خصوصیات کے سبب اس کتاب کو علمی ادبی حلقوں میں قرار واقعی پذیرائی حاصل ہوگی۔

انجمن کوشش کرے گی کہ قاضی صاحب کے بعض دوسرے کارنامے بھی منظرِ عام پر آئیں . . . . . انشاء اللہ . . . . . .

ولی گجراتی

ریختہ گوئی کے موجد اور اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی احمدآبادی آج سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے گزرے ہیں، لیکن اُن کی زندگی کے حالات ہم کو معلوم نہیں ہو سکے۔ اس کو تذکرہ نویسوں کی غفلت کہئے یا ہماری ناقدر شناسی کہ ہم نے اس نامور شخص کو قابل اعتنا نہ سمجھا جس نے ہماری زبان کے ارتقا اور اس کی اصلاح و ترقی میں بہت بڑا حصّہ لیا اور اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ آج دُنیا کی دیگر زندہ زبانوں کے ہمدوش ہو رہی ہے۔ اس کی نسبت آزاد مرحوم اپنے مخصوص اندازِ بیان میں اس طرح شکوہ سنج ہیں۔

"افسوس یہ ہے کہ ہماری زبان کے مؤرّخ اور ہمارے شعرا کے تذکرہ نویسوں نے اس کے ولی اور خدا رسیدہ ثابت کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کی لیکن ایسے حال نہ لکھے جس سے اس کے ذاتی خصائل و حالات مثلاً دنیا داری یا گوشہ گیری، اقامت یا سیّاحی، راہِ علم و عمل کی نشیب و فراز منزلیں یا اس کی صحبتوں کی مزہ مزہ کی کیفیتیں معلوم ہوں بلکہ برخلاف اس کے سنہ ولادت اور سالِ فوت تک بھی نہ بتایا" [1]

---

[1] آبِ حیات صـ ۹۲ مطبع کریمی لاہور

ولی کے صحیح حالاتِ زندگی کا جمع کرنا تو درکنار اُن کے صحیح نام تک کا ہمیں علم نہیں ہو سکا، بلکہ ان کے اصلی وطن تک سے ہم بے خبر ہیں اور اب تک ان کے حالات سے عدم واقفیت کی وجہ سے اُن کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں اور ان کے کلام سے کھینچ تان کر دہ مطالب پیدا کئے جا رہے ہیں جن کا وہ حامل نہیں ہے۔ ع

چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند!

ولی کے وطن کی بحث

خود ولی کے وطن کی بحث ایک مدت دراز سے چلی آ رہی ہے اور آج تک کئی مصنفین اور اہلِ قلم اس پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں، لیکن اب تک کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکے، جیسا کہ شعراءِ اُردو کے فارسی تذکروں سے متبادر ہوتا ہے، ولی کی وفات کے کوئی چالیس، پچاس برس کے بعد ان کے وطن کی نسبت اختلاف پیدا ہوا، اور اس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد اس قدر طویل مدت کے اثنا میں کسی نے ان کے حالات سے اعتنا نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان کے وطن بلکہ خاندان، نام، سنہ ولادت و وفات تک معرضِ خفا میں رہے، اور اسی ناواقفیت کے باعث جس تذکرہ نویس نے جو کچھ معلوم کیا اور سُنا سنایا وہ لکھ ڈالا۔ چنانچہ بعض نے ان کو گجراتی لکھا اور بعض نے دکنی۔

کسی ادیب یا شاعر کا وطن کوئی سا بھی ہو، صرف اس کے کمالِ فن سے عموماً سروکار ہونا چاہیئے، لیکن جس ماحول میں اُس نے پرورش پائی، جن لوگوں سے اکتسابِ فیض اور استفادہ اور جو ملکی و وطنی حالات و واقعات اس کی زندگی پر اثر انداز ہوئے، ان کو معلوم کرنا اس کے ادبی اور شعری کارناموں کے مطالعہ و تنقید کے لئے ناگزیر ہے، اور اس لئے

ضرورت ہے کہ ولی کے نام، وطن اور صحیح حالاتِ زندگی پر سیر حاصل بحث کی جائے۔ اُردو زبان و ادب کے محققین بھی اب تک اس مسئلہ میں خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں، اور بعض متردد ہیں اس لئے کہ ان کو کوئی قطعی ثبوت اب تک نہیں ملا۔ مولوی عبدالحق صاحب ۲۳ء میں رقمطراز ہیں :۔

"ولی کو سب سے پہلے اورنگ آبادی میر صاحب ہی نے لکھا ہے، اگرچہ یہ امر متنازع فیہ ہے اور کوئی قطعی ثبوت ابتک بہم نہیں پہنچا کہ ولی اورنگ آبادی تھا یا احمد آبادی"۔[1]

۳۵ء میں مولوی صاحب نے اپنی مذبذب رائے کا اظہار یوں کیا ہے،

"یہ اختلاف ایک مدت سے چلا آرہا ہے اور اس وقت اس کا قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے"۔[2]

بایں ہمہ اسی زمانہ میں انہوں نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں ولی کو دکنی اور اورنگ آبادی بھی لکھ دیا ہے۔[3] لیکن بعض محققین[4] جنہوں نے

---

[1] نکات الشعرا، مقدمہ صد-ک طبع ثانی، انجمن ترقی اُردو [2] مخزنِ شعراء، مقدمہ ص۶
[3] دیکھو مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون "اُردو" پر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ج ۴ ص ۱۰۲۶) میں، "موجودہ اُردو شاعری کی ابتدا محمد شاہ (۱۱۳۱ھ، ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں ہوئی حتیٰ کہ ولی دکنی اورنگ آبادی (۱۰۶۹ھ؟ ۱۱۵۶ھ؟) نے بھی اُس وقت جو اساتذہ دہلی میں تھے اُن سے سیکھا"۔ [4] ہماری مُراد اپنے فاضل دوستوں پروفیسر شیرانی، مولانا ابوظفر ندوی اور پروفیسر نجیب اشرف سے ہے۔ جنہوں نے گجرات کے اُردو ادبیات کی تحقیق کی ہے۔ ہمیں اس بات کے اظہار سے مسرت ہوتی ہے کہ اب ہمارے گجراتی بھائیوں نے اس طرف توجہ کی ہے، خاص کر ولی کے متعلق اب تحقیقات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں ہمارے محترم دوست سیّد منظور حسن صاحب

(باقی اگلے پر)

اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی ہے اور ولی کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ولی گجراتی تھے۔

دکنی پروپیگنڈا دوسری طرف بعض دکنی مصنفین اور اہل قلم نے حبِّ وطن کی بنا پر یا عصبیت کے جوش میں آکر ولی کو دکنی ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ انہوں نے بعض تذکرہ نویسوں کے بیانات اور خود ولی کے بعض اشعار کو اپنی قیاس آرائیوں کا ماخذ بنا کر ولی کو دکنی بلکہ اورنگ آبادی بنا دیا، حالانکہ ان کے پاس کوئی ثبوت اس بات کا موجود نہیں ہے جو قطعی اور یقینی ہو، صرف استقرائی اور قیاسی استدلال سے انہوں نے ولی کے متعلق دُور از کار نظریے قائم کیے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی تحقیقات نے "کوہ کندن" کا عجیب مضحکہ انگیز پیرایہ اختیار کیا ہے، جس سے ولی کے وطن اور ان کے خاندانی حالات پر اور بھی پردہ پڑا رہا اور لوگوں کی توجہ ان کے دکنی ہونے کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئی چنانچہ وہ "کعبہ" پہنچنے کی بجائے "ترکستان" پہنچ گئے! جو بات زیادہ شہرت پکڑ جاتی ہے عموماً اس کی تاریخی صحت مشتبہ ہوتی ہے۔ یہی حال ولی کے دکنی ہونے کا ہے جس کی شہرت و تشہیر نے ان کے اصلی وطن اور خاندانی حالات کو پوشیدہ اور نظر انداز کر دیا ہے۔ صرف موجودہ معلومات کی روشنی میں اگر حالات و واقعات پر ایک نظر غائر ڈالی جائے تو ولی کو ہرگز دکنی نہیں تسلیم کیا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ بعض محققین ادب

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ) علوی ہیں جو خود ولی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں حال ہی میں ہمارے ایک عزیز سید ظہیر الدین مدنی (لکچرار گجرات کالج) نے بمبئی یونیورسٹی کو ڈاکٹریٹ کے لیے "اردو شعرائے گجرات" پر ایک محققانہ مقالہ پیش کیا ہے۔

اُردو نے اس کی نسبت صرف اپنی مذبذب رائے کا اظہار کیا ہے۔ بایں ہمہ وؔلی کے دکنی ہونے کو اب اس قدر مسلّم مان لیا گیا ہے کہ گویا اب اس میں چون وچرا کی گنجائش باقی نہیں رہی، اور دکن کے بعض ادیبوں نے جو "ماہر دکنیات" سمجھے جاتے ہیں، وؔلی کے دکنی ہونے پر گویا اتمام حجّت کر دی ہے اور اس بارے میں اپنی تحقیقات کو انہوں نے قول فیصل کا رتبہ دیدیا ہے چنانچہ ان کے پیش کردہ دلائل کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔ لے

(۱) تذکرہ نویسوں نے وؔلی کو دکنی اور اورنگ آبادی لکھا ہے۔

(۲) خود وؔلی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دکنی تھے۔

(۳) وؔلی نے فراق گجرات والے قطعے میں لفظ "سیر" لکھا ہے جس سے صرف بطور سیر و سیاحت ان کا گجرات جانا ثابت ہوتا ہے۔

(۴) وؔلی کے کلام میں دکنی الفاظ و محاورات بکثرت پائے جاتے ہیں۔

(۵) وؔلی نے اپنے کلام میں اپنے ہمعصر دکنی شعرا کا ذکر کیا ہے۔

(۶) دیوانِ وؔلی کے ایک قلمی نسخہ (موجودہ کتب خانۂ انڈیا آفس) کے آخر میں کاتب نے جو وؔلی کے دوست ابوالمعالی کا بیٹا ہے وؔلی کو "متوطن دکن" لکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ دلائل صرف ضمنی اور جزوی شہادت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تردید مناسب مقام پر کر دی جائے گی۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی وؔلی اورنگ آباد دکن کے تھے

لے ۱۹۳۷ء میں سٹی کالج حیدرآباد کے طلبہ نے یادگارِ وؔلی کا جشن منایا تھا اور اس تقریب پر کئی مقالات وؔلی کے وطن اور ان کی شاعری وغیرہ پر پڑھے گئے تھے۔ ان مقالات کا مجموعہ کالج مذکور کے رسالہ "المو سیٰ" کے یادگارِ وؔلی نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ دلائل اسی سے ماخوذ ہیں۔

تو آخر کیوں ان کے خاندانی اور ذاتی حالات کا پتہ نہیں لگایا جاسکا؟ جبکہ "ماہرینِ دکنیات" بیسیوں قدیم دکنی شعرا کو ہم سے روشناس کر چکے ہیں۔ اور ان کے کلام کو انہوں نے قعرِ گمنامی سے باہر نکالا ہے۔ سوائے گجرات میں ولی کی تعلیم و تربیت، طویل قیام اور وفات کے جو تیقن کا درجہ رکھتے ہیں اُن کے حالاتِ زندگی نہیں معلوم ہو سکے حتیٰ کہ ان کے نام اور سنہ ولادت و وفات تک پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ [1] جو لوگ ولی کو دکنی ماننے اور ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان کا فرض تھا کہ وہ اُن کے حالات کا سُراغ لگاتے، یا کم از کم اتنا ہی ثابت کر دیتے کہ وہ اُن کے مفروضہ وطن اورنگ آباد کے کس خاندان سے تھے اور کس سنہ میں پیدا ہوئے تھے؟ مگر جبکہ ولی دکن کے ہی نہ تھے تو ان کے حالات کا کیسے پتہ لگتا۔ اور چونکہ وہ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اس لیے ان کے خاندانی حالات کی تحقیق خود ان کے وطن میں کی جاتی تو بہت کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں احمد آباد سے ہمیں ایسی معتبر شہادتیں حاصل ہوئی ہیں جو ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں اور جن سے ان کا گجراتی ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ اب سے چند سال بیشتر اگر کوشش کی جاتی تو ولی سے متعلق بہت سا قلمی ذخیرۂ معلومات ہاتھ آتا جو بدقسمتی سے خاندانِ ولی کے بعض ہم نسب بزرگوں کے پاس سے پچھلے چند برسوں میں تلف ہو گیا۔ تاہم اب بھی جو کچھ بچا کھچا سرمایہ موجود ہے اُس سے ولی کے حالاتِ زندگی مرتب کرنے کے لیے کافی مواد مل سکتا ہے۔ چنانچہ اسی کی بنا پر ہم نے ولی کے خاندانی اور ذاتی حالات مرتب کیے ہیں جو ایک علیحدہ

---

[1] ولی کا سنہ وفات گجرات ہی کی بدولت اب یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے۔

131262

مقالہ میں آیندہ شائع کیے جائیں گے

اگرچہ اس وقت جبکہ ولی کے حالات معتبر اسناد اور مخطوطات کے ذریعہ سے معلوم ہو چکے ہیں، جو اس موضوع پر آخری لفظ اور فیصلہ کُن شہادت کا حکم رکھتے ہیں، اس لئے اب اُن کے دکنی یا گجراتی ہونے کے شواہد سے بحث کرنا تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے، تاہم چونکہ عرصۂ دراز سے ولی کے دکنی اور اورنگ آبادی ہونے کی تشہیر کی جارہی ہے اور اس پر متعدد دلائل قائم کیے جا چکے ہیں، اس لئے ان پر صرف موجودہ معلومات کی روشنی میں تنقید کرنے اور ان غلط بیانیوں کی تردید کرنے کے خیال سے جو ہماری ادبی تاریخوں میں جگہ پا چکی ہیں، یہ مضمون تحریر کیا گیا ہے ولی کے ذاتی حالات پر ایک علیحدہ مقالہ لکھا گیا ہے، لہذا اس مضمون کو اس کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے۔

شعرائے اُردو کے تذکرے اور ذکر ولی

حالاتِ ولی کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو چیز سامنے آتی ہے وہ شعرائے اُردو کے تذکرے ہیں، اُردو شعراء کا کوئی تذکرہ ۱۱۶۵ھ سے پہلے نہیں لکھا گیا، اس طرح وفات ولی سے تقریباً پینتالیس برس تک ولی کا تذکرہ کسی نے نہیں لکھا۔ اس طویل مدت میں ان تذکرہ نویسوں نے سنی سنائی معلومات اور ولی کے بعض اشعار پر اعتماد کرکے چند سطروں میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، ان میں سے بعض نے محض قیاس آرائی کرکے دکنی کو دکنی بلکہ اورنگ آبادی لکھ دیا، جیسے میر گردیزی اور شفیق جن میں سے دونوں مؤخر الذکر دکنی تھے اور اوّل الذکر کے متبع، لیکن ان کے مقابلہ میں بعض انہی کے ہمعصر اور مابعد کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ولی کے گجراتی خاندان سے اور ساکن گجرات ہونے کا ذکر کیا ہے جیسے حمید اورنگ آبادی، قائم چاندپوری

میر حسن دہلوی، منشی قدرت اللہ، شیخ غلام محی الدین، علی ابراہیم خاں، نساخ آزاد وغیرہم۔ یہاں ان تذکروں کے بیانات نقل کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ **گلشن گفتار** مصنفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی، سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ "ولی محمد احمد آبادی" ۱؎

یہ دکن کا سب سے پہلا تذکرہ ہے ۲؎۔ بقولِ مرتب "گلشنِ گفتار کی اطلاعات اس لحاظ سے کہ مؤلف خود دکن کا باشندہ تھا اور اکثر دکنی شاعروں سے شخصی طور پر واقف تھا، زیادہ مستند و معتبر ہیں۔" (مقدمہ)

۲۔ **مخزنِ نکات** مصنفہ شیخ محمد قیام الدین قائم چاندپوری سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ "مولدش گجرات است، گویند بہ نسبت فرزندی) شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از اولیائے مشاہیر است، افتخار ہا داشت" ۳؎

۳۔ **تذکرہ شعرائے اردو** مؤلفہ میر حسن دہلوی سنہ تالیف ۱۱۸۸ھ

"مردے بود از خاکِ گجرات" ۴؎

۴۔ **طبقات الشعراء** مؤلفہ منشی قدرت اللہ صدیقی مراد آبادی سنہ تالیف ۱۱۸۸ھ

۱؎ ص ۸، ۲؎ مقالاتِ ہاشمی ص ۱۵۵،

۳؎ ص ۱۰ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، قائم کو اپنے پیشرو میر تقی اور گردیزی کے تذکروں کا علم نہ تھا، اور اسی لئے اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا۔ (دیکھو مقدمہ) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائم نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر ولی کو گجراتی لکھا ہے، ۴؎ ص ۲۰۴ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو،

"طبقات الشعراء میں اس غزل کو حضرت شاہ گلشن کی طرف منسوب کیا ہے جس کو حضرت نے بطور تبرک ولی گجراتی کو مرحمت فرمائی تھی اور اس پر ولی کے ریختہ کی بنیاد ہے" ۱؎

۵۔ تذکرۂ طبقاتِ سخن، مؤلفہ شیخ غلام محی الدین قریشی تخلص عشق و مبتلا میرٹھی سنہ تالیف ۱۲۲۲ھ۔ آبرو کے ذکر میں لکھا ہے:

"چوں دیوانِ ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بعصر محمد شاہ بہ دہلی رسید تتبع آں شد" ۲؎

۶۔ مخزنِ شعراء مؤلفہ قاضی نورالدین حسین رضوی سنہ تالیف ۱۲۶۸ھ مؤلف خود گجرات کے باشندہ اور بھروچ کے مشہور سادات اور قضاۃ میں سے نہایت ثقہ اور معتبر، ان کی تحقیق کے مطابق ولی گجراتی تھے:

"محققانِ این فن را درحالِ او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است ویا از دکن، بہ راقم آثم از زبانی ثقات بلدۂ احمدآباد بہ ثبوت چناں پیوستہ کہ شاعر مزبور از بلدۂ مسطور بودہ و سالہا بدکن ہم گورانیدہ" ۳؎

۷۔ سخن شعراء از عبدالغفور خاں نساخ، سنہ تالیف ۱۲۸۱ھ "ولی تخلص، شاہ ولی اللہ، اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمۃ کے تھے" ۴؎

۱؎ دیکھو کلیات ولی ضمیمہ نمبر ۲ ص۸۷، ۲؎ ہندوستانی بابت جولائی ۱۹۳۲ء "دہلی میں اردو شاعری کا آغاز ص۳۲۵" اس تذکرہ کی نسبت ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے "مؤلف نے ذاتی تحقیق سے حالات لکھے ہیں" (یادگار شعراء ص۸) ۳؎ ص۱۱۰، ص۱۱۱، انجمن ترقی اردو، ۴؎ ص۵۵۶، طبع نولکشور،

۸۔ **گلشن ہند** مؤلفہ میرزا علی لطف، سنہ تالیف ۱۸۰۱ء
" ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام دکنی، وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے"۔[۱]

۹۔ **یادگار شعراء**، مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر
" ولی شاہ ولی اللہ (شورش وذکا) ساکن گجرات شاہ وجیہ الدین کی اولاد سے تھے"۔[۲]

۱۰۔ **تذکرہ آثار الشعرائے ہنود** مؤلفہ منشی دیبی پرشاد ۱۸۸۵ء
" اور جو ولی گجراتی موجد شعر اُردو کا مشہور ہے"۔[۳]

۱۱۔ **آثار الشعراء** از حافظ سید ممتاز علی بھوپالی، میں
ولی کو احمد آبادی اور شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے لکھا ہے۔

۱۲۔ **آبِ حیات**، از آزاد دہلوی۔
" ولی احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں سے تھے"۔[۴]

متذکرہ بالا تذکروں میں، جن میں گلشن گفتار، مخزن نکات، تذکرہ میر حسن دہلوی بارہویں صدی کے نصف آخر کے لکھے ہوئے ہیں۔

---

[۱] ص ۱۷۵، انجمن ترقی اُردو۔

[۲] ص ۲۱۷ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد، مترجم صاحب نے اس کے نیچے یہ نوٹ اضافہ کیا ہے " ولی کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ اورنگ آبادی تھے"۔ ۹!

[۳] جلد دوم ص ۱۴۱ مطبوعہ نولکشور پریس، [۴] ص ۹۳ مطبع کریمی لاہور۔

جن کو زیادہ قربت زمانی حاصل ہے، ولی کو گجراتی لکھا گیا ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کلیاتِ ولی، کے مرتب نے یہ دعویٰ کیسے کر دیا کہ "بارہویں صدی کے تمام تذکروں میں جن کو ان حالات سے زیادہ قربت زمانی حاصل ہے، ولی کو دکنی اور اورنگ آبادی لکھا ہے"۔ لہ بارہویں صدی کے تمام تذکروں میں صرف تین تذکرے ہیں جن کی حقیقت حسب ذیل ہے۔

۱۔ نکات الشعرا مؤلفہ میر تقی میر، سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ "و شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد است

...... از کمالِ شہرت احتیاج تعریف ندارد، و احوالش کما ینبغی معلوم من نیست"، ۲ے

گویا ولی کی نسبت مشہور باتیں سنکر حضرت نے ان کو اورنگ آبادی لکھ دیا۔

۲۔ تذکرہ ریختہ گویاں، از فتح علی الحسینی گردیزی، سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ۔ اس میں

"در دکن چہرۂ ہستی افروختہ"، ۳ے کے سوا ولی کے حالات میں ایک لفظ نہیں لکھا، اور صرف سُنی سنائی معلومات کی بنا پر ولی کو دکنی لکھ دیا۔

۳۔ چمنستانِ شعرا از لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ، شفیق نے میر کے تتبع میں ولی کو "خاک پاک اورنگ آباد"، سے منسوب کیا ہے ۴ے اس کے سوا کسی تذکرہ نویس نے ان کو اورنگ آبادی

لہ۔ کلیاتِ ولی، مقدمہ ص ۱۵، ۲ے ص ۸۹، ص ۹ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، ۳ے، ص ۱۴۴ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، ۴ے ص ۱۰۴ مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، بقول مرتب اس تذکرہ کی بنیاد میر صاحب اور فتح علی گردیزی کے تذکروں پر رکھی ہے (دیکھو مقدمۂ عبدالحق ص ۲)

نہیں لکھا۔

ان تین تذکروں کے علاوہ **مجموعۂ نغز** از قدرت اللہ قاسم، میں صرف "دی عزیزی بود از سکنۂ دیارِ دکن"[۱] لکھا ہے، فتوت نے اپنے تذکرہ **ریاضِ حسنی** میں ان کو دکنی بنایا ہے، ایک اور تذکرہ **جلوۂ خضر** (۱۳۰۲ھ) میں صرف ولی کے نام کے ساتھ دکنی لکھا ہے تاہم ان کے وطن کے سلسلہ میں دوسرے تذکروں سے ان کے گجراتی ہونے کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں[۲]۔ غرضکہ بارہویں صدی اور مابعد کے کوئی درجن بھر تذکروں کے بیانات کو نظر انداز کر کے صرف دو ایک تذکروں کے بیان پر اعتماد کر لینا سراسر دیانت کے خلاف اور انصاف سے بعید ہے۔

زمانۂ حال کی تصانیف میں ذکرِ ولی

ولی کے جو حالات ان تذکروں میں درج ہیں ان میں نام، وطن صاحب دیوان ہونا، عہدِ عالمگیر اور پھر محمد شاہ کے زمانہ میں، سید ابو المعالی کے ہمراہ دہلی جانا، وہاں شاہ گلشن سے ملاقات، مدرسۂ شاہ وجیہ الدین میں تعلیم پانا، ریختہ کی ایجاد، برہان پور کا قیام اور احمد آباد میں وفات کے سوا ولی کے حالاتِ زندگی کی تفصیل کسی تذکرہ میں نہیں لکھی گئی۔ لیکن زمانۂ حال کے بعض مصنفین اور اہل قلم نے کلام ولی کے مطالعہ نیز بعض شعرائے اردو کے بیانات کی بنا پر چند باتوں کا اضافہ کیا ہے، مثلاً ۱۰۷۹ھ میں اورنگ آباد میں ولی کی ولادت، اور احمد آباد میں ۱۱۵۵ھ (یا ۱۱۴۱ھ کے بعد) میں ان کی وفات ۱۱۴۰ھ میں مثنوی دہ مجلس کی تصنیف ۱۱۴۱ھ میں دہلی سے واپسی، مولانا

---

[۱] جلد ۲ ص ۲۹۶، [۲] دیکھو جلد اوّل ص ۶۸،

نورالدین احمد آبادی سے بیعت، اورنگ آباد میں بیس سال کی عمر تک تحصیل علم، اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے ہونا شاہ وجیہ الدین صاحب کے خاندان میں بیعت ہونا سفر حجاز اور حج بیت اللہ، ان میں سے سفر حجاز اور حج بیت اللہ کا پتہ ان کی مدح بیت الحرام سے چلتا ہے، اس کے سوا کوئی یقینی شہادت موجود نہیں ہے۔ سنہ وفات غلط ثابت ہو چکا ہے، اسی طرح سنہ ولادت بھی صحیح نہیں ہے، اور نہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ کے خاندان سے ہونا اور وہاں بیس برس تک تحصیل علم کرنا ثابت ہے۔" وہ مجلس کے انتساب کی بھی تردید ہو چکی ہے، مولانا نورالدین سے بیعت بھی غلط ہے غرضیکہ مابعد کے تذکرہ نویسوں نے جتنی باتیں لکھی ہیں تقریباً سب ہی غلط ہیں۔

زمانۂ حال کے مؤرخین ادب اردو اور اہل قلم نے بھی تحقیق کی محنت گوارا نہ کرکے محض یکطرفہ شہرت واشاعت کی بنا پر ولی کو نہ صرف اورنگ آبادی اور دکنی بتایا ہے، بلکہ اپنی کتابوں اور تحریروں میں ولی سے متعلق بعض ایسے بیانات درج کئے ہیں جو تحقیق سے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ ولی کے نام میں اختلاف کو دیکھ کر ادب اردو کا ایک مؤرخ لکھتا ہے:۔

"ہمارے نزدیک اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اسی عہد میں شمس ولی اللہ نام ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ خلط ملط واقع ہو گیا۔" [۱]

[۱] تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ اردو ترجمہ ص ۸۳ و ص ۸۴ مطبوعہ نولکشور پریس، اس کتاب میں ولی سے متعلق بعض عجیب وغریب ایرادات ہوئے ہیں، جنکی بنیاد تمامتر آصفی کے تذکرۂ شعرائے دکن پر ہے۔

اس بیان کے لئے نہ تو کوئی حوالہ دیا گیا ہے، نہ کوئی سند پیش کی گئی ہے، لیکن ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس نام کے کوئی بزرگ احمد آباد میں ولی سے پہلے یا اُن کے زمانہ میں، بلکہ ان کے بعد بھی نہیں گزرے۔

زمانۂ حال کی تصانیف میں جو ادب اردو کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں، ولی کی نسبت متعدد غلط بیانیاں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہر مصنف نے ولی کو اورنگ آبادی اور دکنی لکھا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے حالات کے ضمن میں غیر محققانہ اور قیاسی باتیں بھی درج کر دی ہیں۔ یہاں ہم ایسی کتابوں کے نام پیش کرتے ہیں جو ہماری نظر سے گزر چکی ہیں:۔

۱۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن

از عبد الجبار خاں آصفی ملکاپوری ۱۳۲۹ھ میں

یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ولی کے اشعار اور تذکروں سے ولی کے حالات لکھنے اور اُن کو دکنی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ولی کو دکنی بنانے کی غالباً یہ پہلی باضابطہ کوشش ہے اور بعد کی تمام غلط بیانیوں کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

۲۔ گلِ رعنا

از مولوی عبد الحی ناظم ندوہ، یہ ۲۱ء میں لکھی گئی ہے۔ اور اس میں بھی ولی سے متعلق آصفی کا تتبع کیا گیا ہے۔

۳۔ دکن میں اردو

از نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ ۱۹۲۵ء اس میں ولی کا دکنی ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اور بعض غلط باتیں اُن سے منسوب کی گئی ہیں۔

۴۔ تاریخ ادب اردو

از رام بابو سکسینہ (انگریزی) مطبوعہ

۱۹۲۷ء اس میں ولی سے متعلق آصفی کی غلطیوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔

۵۔ کلیاتِ ولی مرتبہ احسن مارہروی مطبوعہ ۱۹۲۷ء مرتب نے مقدمہ میں ولی کے حالات اکثر غلط لکھے ہیں اور اُن کو دکنی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۶۔ اُردو شہپارے، از محی الدین قادری زورؔ مطبوعہ ۱۹۲۹ء قدیم دکنی شعرا کے کلام کا انتخاب، اس میں دکنی شعرا کے حالات بھی دیئے گئے ہیں۔ ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے اور بعض حالات بھی غلط لکھے ہیں۔

۷۔ تاریخ ادب اُردو از گراہم بیلی مطبوعہ ۱۹۳۲ء بشرح صدر

۸۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مطبوعہ ۱۹۳۴ء جلد چہارم میں "اردو" پر ایک مبسوط مقالہ مولوی عبدالحق صاحب کے قلم سے درج ہوا ہے جس میں ولی کو اورنگ آبادی بتا کر ان کا سنہ ولادت و وفات دونوں غلط لکھے ہیں۔

۹۔ یادگار ولی سٹی کالج حیدر آباد کے طلبہ نے ۳۷ء میں ولی کی یادگار منائی تھی۔ اس موقعہ پر جو مقالات ولی پر پڑھے گئے تھے اُن کا مجموعہ ولی کے حالات اور وطن کی بحث اور پیشرو تحریرات کا اعادہ خصوصاً آصفی تتبع۔

۱۰۔ دی پامس اسماعیل کالج جوگیشوری (بمبئی) کے طلبہ کا سہ ماہی اور سہ زبانی رسالہ۔ کالج مذکور کی بزم ادب نے ۱۹۳۷ء میں یوم ولی بصدارت پروفیسر سید نواب علی منایا تھا۔ اس میں ولی پر چند مقالات پڑھے گئے تھے ان کا مجموعہ اس رسالہ کے حصۂ اُردو میں شائع ہوا ہے جن میں ولی کے مشہور حالات کا اعادہ کیا گیا

ہے۔ صدر جلسہ اور بعض طلبہ کی ولی کو گجراتی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کے ساتھ ان کے دکنی ہونے کا اعتراف۔

۱۱۔ نذرِ ولی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے درجۂ ایم اے کی طالبات کے ولی پر چند مضامین کا مجموعہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۸ء۔

ممکن ہے ان کے علاوہ اور کتابیں بھی ہوں جن میں دکنی کی نسبت غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہو یا ان کی نقل در نقل کی گئی ہو۔ بہر حال اس سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ دکنی سے متعلق غیر محققانہ باتوں نے ہماری ادبی تاریخوں میں ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی ہے جن کی تردید ایک ضروری امر ہے، اور اس لئے ہم پر یہ ادبی فرض عائد ہوتا ہے کہ صحیح تحقیق کے بعد جو امور دریافت ہوئے ہیں ان سے ان غلط بیانیوں کی تصحیح کریں اور اس موضوع پر مزید معلومات کا اضافہ کر کے اس عام ہوا کا رُخ پلٹ دیں تاکہ اس موضوع پر ہمارے مصنفین اور اہلِ قلم جو ایک غلط راستے پر جا پڑے ہیں، آیندہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر اردو شاعری کے اس "محسنِ اعظم" کے کارناموں پر اپنے شبدیز قلم کی جولانیاں دکھا سکیں۔

ولی کو دکنی کہنے سے کیا مراد ہے؟ خود ولی کے بعض اشعار نیز بعض تذکروں میں ولی کو "شاعر ملک دکن" یا "متوطن دکن" لکھا گیا ہے۔ اس سے ولی کے دکنی ہونے پر استشہاد کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں ملک دکن سے وہ خاص خطہ مراد نہیں ہے جو گجرات سے الگ نربدا کے جنوب میں واقع ہے بلکہ عام طور پر دکن کا اطلاق گجرات پر بھی ہوتا رہا ہے اور جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا کہ خود مصنفین گجرات

اپنے ملک کو دکن میں شمار کرنے کے عادی تھے[1] ولی نے خود کو اور دوسروں نے اُن کو ملکِ دکن سے کیوں منسوب کیا اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ شمالی ہندوستان سے گجرات جنوب یا دکن کی سمت میں پڑتا ہے اس لئے اس کو دکن کہا گیا ہے جیسا کہ گجرات کے ایک تذکرہ نویس نے ولی کے تذکرہ میں اس کی تصریح کی ہے۔

"وخطا کردہ میر تقی میر کہ در تذکرۂ خود او را از اورنگ آباد نوشت، شاید بدیں شعر او را از دکھن خیال کرد۔ فرد

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

امّا گروہ کہ ولایت گجرات بہ نسبت دہلی و اکبرآباد سمت جنوب کہ ہندیان دکھن گویند واقع است"[2]

اور یوں بھی جغرافیائی قرب کی وجہ سے گجرات دکن میں شامل ہے اس لحاظ سے گجرات پر دکن کا اطلاق ہوتا چلا آیا ہے چنانچہ مرہٹہ حکومت سے قبل دہلی والے گجرات کو دکن میں شمار کرتے تھے کیونکہ گجرات دہلی سے جنوب مغرب میں واقع ہے، عرب جغرافیہ نویسوں کی تقسیم ملکِ ہند بھی اسی طرح پر ہے۔ سندھ، ہند اور دکن ہند سے مراد راوی سے برہم پتر تک اور دونوں کے نیچے سب دکن ہے۔ گجرات دکن میں شامل سمجھا جاتا تھا، اس کی متعدد مثالیں موجود

---

[1] آج سے چالیس برس پیشتر احمد آباد کے بعض لوگوں کے نام جو خطوط ہندوستان سے آیا کرتے تھے ان پر پتہ میں احمد آباد دکن لکھا جاتا تھا۔

[2] مخزن شعرائے اُردو صلاا "گروہ کہ ولایت گجرات" صحیح نہیں معلوم ہوتا یہ گرد کہ ولایت گجرات ہونا چاہیئے۔

ہیں جن کو ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

۱۔ گجرات کی تاریخ فارسی "مرآۃ احمدی" میں اس کا استعمال ہوا ہے مثلاً شیخ کمال مالویؒ کی زبانی ان کا یہ قول نقل کیا ہے جو انہوں نے حضرت قطبِ عالمؒ کے جواب میں کہا تھا:۔

"بر لوح محفوظ نظر کنید کہ ملک گجرات از حیطۂ بادشاہانِ دکن بر آمدہ بنام سلطان محمود خلجی ثبت گشتہ۔" [1]

یعنی کارکنانِ قضا و قدر کے ہاتھوں ملک گجرات شاہانِ دکن کے ہاتھ سے نکل کر سلطان محمود خلجی کو مل چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں سلاطینِ گجرات ہی کو شاہانِ دکن کہا گیا ہے، حالانکہ نسل و وطن دونوں کے اعتبار سے یہ سلاطین گجراتی تھے۔

۲۔ مشہور مؤرخ صدرِ جہاں گجراتی جو محمود بیگڑہ کے زمانہ میں تھے انہوں نے اپنی تاریخ "طبقات محمود شاہی" کے آخری صفحہ پر "دار الملک دکن محمد آباد (چانپانیر) گجرات" لکھا ہے۔ چاپانیر خاص گجرات میں واقع ہے نہ کہ دکن میں۔

۳۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کے پوتے کے ایک شاگرد جنہوں نے مُلّا جامی کی شرح لکھی ہے اس کے آخر میں خود کو احمد نگری اور دکن گجرات کا بتاتے ہیں۔ احمد نگر وہی ہے جو ایڈر کے پاس احمد شاہ اوّل نے آباد کیا تھا، آج اس کو ہمت سنگھ کے قبضہ کی وجہ سے "ہمت نگر" کہتے ہیں۔

۴۔ میر حسن دہلوی نے ولی کو از "خاکِ گجرات" لکھا ہے، پھر بھی وہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] مرآۃ احمدی (خاتمہ) ص ۹۵ طبع کلکتہ۔

"چوں دکنی است اکثر بزبان خود حرف زدہ است"۔ ؎۱

اسی کے تتبع میں آزاد نے لکھا ہے:-

"وہ خود دکنی تھے اس لیے ان کے کلام میں بعض الفاظ دکنی بھی ہوتے ہیں"۔ ؎۲

۵ — آزاد نے "آبِ حیات" میں ولیؔ کو خاص احمد آباد گجرات کا باشندہ لکھا ہے، ان کی مندرجہ ذیل تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دکن کو گجرات کی جگہ استعمال کرتے ہیں، ولیؔ کے دیوان کی ترتیب کی نسبت تذکرۂ فائقؔ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دیکھو تذکرۂ فائقؔ کہ خاص شعرائے دکن کے حال میں ہے اور وہیں تصنیف ہوا ہے"۔ ؎۳

ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مخزن شعرا، فائقؔ گجرات کے اُردو شعرا کا تذکرہ ہے جو گجرات کے شہر بھروچ میں لکھا گیا ہے اور جس کے مصنف خاص گجراتی ہیں۔ ذکر ولیؔ کے سلسلہ میں آزاد رقمطراز ہیں :-

"شاعر قدرت کے دیوان میں ایک سے ایک مضمون نیا ہے، مگر یہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں کہ شاعری کا چراغ تو دکن میں روشن ہو اور ستارے اس کے دلّی کے افق سے طلوع ہوا کریں"۔ ؎۴

۶ — حال ہی میں مولوی عبدالحق صاحب نے بھی گجرات کو دکن میں شمار کیا ہے اپنے انگریزی مقالہ "اردو"، مندرجہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں لکھتے ہیں :-

---

؎۱ تذکرۂ میر حسن صہ ۲۰۴ ، ؎۲ آبِ حیات ،

؎۳ آبِ حیات ، ؎۴ آبِ حیات ،

"اور جب یہ صوفیائے کرام اپنے دوران سیاحت
میں دکن کے ان حصوں؛ دولت آباد، گلبرگہ، احمد آباد ،
بیجاپور اور پٹن (گجرات) وغیرہ میں پہنچے"
"دکن میں اردو کے تین بڑے مرکز تھے، گولکنڈہ قطب
شاہیوں کا پایۂ تخت ، بیجاپور، عادل شاہیوں کا پایۂ
تخت اور احمد آباد (گجرات)" [۱]

مندرجۂ بالا مثالوں سے واضح ہوگا کہ خود ولی نے اپنے تئیں اور دوسروں نے ان کو شاعر ملکِ دکن لکھا ہے تو اس سے مراد گجرات ہے جو ملکِ دکن میں شامل سمجھا گیا ہے۔

دیوانِ ولی کے ایک مخطوطہ موجودہ "کتب خانۂ انڈیا آفس" مکتوبہ ۱۱۵۶ھ کے آخر میں اس کے کاتب محمد تقی نامی نے جو اپنے تئیں "ولد سید المعالی" لکھتا ہے، "تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکن" لکھا ہے، جس کو آخری حجت اور فیصلہ کن شہادت ولی کے دکنی ہونے کی مان کر گویا ولی کے وطن کی بحث کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا ہے۔

اوپر متعدد مثالیں دکن سے گجرات مراد لینے کی پیش کی گئی ہیں لہٰذا یہی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں بھی متوطن دکن سے مراد متوطن گجرات ہے، البتہ متوطن اورنگ آباد لکھا ہوتا تو اور بات تھی، ابوالمعالی کے حالات معلوم نہیں ہیں نہ یہ معلوم ہے کہ ان کی اولاد میں سے کون کون تھا۔ ایسی صورت میں اس کا کیا ثبوت ہے۔ کہ یہ محمد تقی انہی ابوالمعالی کے بیٹے ہیں جو ولی کے محب خاص تھے۔

---

[۱] جلد چہارم صفحہ ۱۰۲۴ مطبوعہ ۱۹۳۴ء۔

محض اس لئے کہ انہوں نے دیوان ولیؔ کی کتابت کی ہے؟ بالفرض اگر یہاں دکن ہی مراد لی جائے تو یہ لازم نہیں آتا، نہ اس کی نوبت وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ کاتب کو ولیؔ کے وطن کا علم تھا۔ اور اس نے تحقیق کرکے متوطن دکن لکھا ہے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ کسی نسخۂ دیوان کی نقل ہو اور کاتب نے اس میں متوطن دکن والی عبارت بعینہٖ نقل کرلی ہو؟ جیسا کہ اکثر قلمی نسخوں میں یہ صورت پیش آتی ہے۔ علاوہ ازیں محمد تقی نے ولیؔ کا نام "ولی محمد" لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ نسبت نامہ میں ان کا نام شاہ ولی اللہ لکھا ہے۔ خود ولیؔ کی مُہر موجود ہے جس میں ان کا نام "ولی اللہ" چھپا ہوا ہے، حالانکہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ "ابوالمعالی ولیؔ کے خاص دوست اور رفیق تھے اس لئے ان کے بیٹے کا ولیؔ کے نام کو غلط لکھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔" [1] جبکہ ولیؔ کے خاص دوست کا بیٹا ان کے صحیح نام تک سے واقف نہیں ہے تو اس کی تحریر پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ یہ شہادت امور متذکرۂ بالا کے اعتبار سے بالکل بیکار اور تنکے کا سہارا لینے کے برابر ہے۔

کیا ولیؔ کا کلام دکنی زبان میں ہے؟

ولیؔ کے دکنی ہونے کے ثبوت میں خود ولیؔ کا یہ شعر ایک مستقل شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے :-

دکنی زباں میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولیؔ
لیکن نہیں بولیا ہے کئی ایک شعر شیریں زیں نمط

تاریخ زبانِ اردو کا ہر متعلم جانتا ہے کہ دتیؔ کی اردو کے مقابلہ میں

---

[1] مقالات ہاشمی صفحہ ۱۵۵،

دکن اور گجرات کی اُردو کو دکنی کہا جاتا تھا، اور خود اس ملک کے لوگ بھی اس کو ہندی یا دکنی کہتے تھے، چنانچہ اسی معنیٰ میں یہاں ولی نے بھی اپنی زبان کو دکنی کہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی بعض غزلیں ٹھیٹھ قدیم دکنی زبان اور لب و لہجہ میں ہیں، لیکن موجودہ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا معتدبہ حصّہ دکنی شعراء کا کلام ہے جو دیوان ولی کے بعض نسخوں میں درج کر دیا گیا ہے خود کلیات ولی کے مرتب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

"ان واقعات و اختلافات کی بے ترتیبوں کے بعد دیوان پر نظر ڈالی جائے تو وہاں کا عالم ہی دوسرا ہے۔ ہر صفحہ نہیں بلکہ ہر ہر غزل میں اکثر مصرعے و اشعار ایک دیوان سے دوسرے دیوان میں مختلف پائے جاتے ہیں، کسی میں غزلیں کی غزلیں ندارد ہیں، بعض دیوانوں میں مرتّب کرنے والوں نے اصلاحیں دیکر دَورِ عالمگیر کے شاعر کو حکومت برطانیہ کے عہد کا شاعر بنا دیا ہے کسی سماعی اور جلد باز مؤلف نے انتخاب اشعار میں یہ کتر بیونت کی ہے کہ دوسروں کے اشعار ولی سے منسوب کر دیئے ہیں" [۱]

لیکن خود مُرتّب صاحب نے کیا ستم ڈھایا ہے کہ ایسے سب کلام کو جو ولی کے نام سے منسوب تھا، یا جو کسی نسخۂ دیوانِ ولی میں پایا گیا، انہوں نے لیکر "کلیاتِ ولی" میں شامل کر دیا ہے جس سے بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی اور یہ جاننا مشکل ہو گیا ہے کہ کونسا کلام ولی

---

[۱] مقدمہ کلیاتِ ولی ص۵ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو،

کا ہے اور کونسا غیروں کا ایک دکنی اہلِ قلم نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

"کلیات ولی کے فاضل مرتب مولوی احسن مارہروی نے بڑی تلاش و جستجو کے ساتھ دیوانِ ولی کے متعدد نسخوں کے مطالعہ اور کم و بیش تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں کے بیانات پر محققانہ نظر ڈال کر جو کلام اس کے نام سے منسوب کیا ہے اور جو حالات اس کے بیان کئے ہیں۔ دونوں میں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔[۱]

بقول صفیر بلگرامی دیوان ولی میں ایک ثلث اشعار دکنی زبان میں ہیں، باقی تمام کلام میر و مرزا کی زبان میں جس کی اس وقت تک اصلاح نہیں ہوئی تھی، اور پھر ناسخ اور ان کے بعد آنے والوں کی زبان میں ہے[۲] اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس ایک ثلث کا بھی یہ حال ہے کہ اس میں غزلیں اور اشعار دوسرے شعرائے ولی سے منسوب کر دیئے گئے ہیں، اسی لئے خود مرتب کلیات کو لکھنا پڑا کہ:۔

"ردیف الف میں بیاسی غزلیں ہیں جن میں حسب ذیل غزلیں عام زبان اور پرانے مشترک محاورات سے الگ خالص دکنی زبان میں کہی گئی ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ غزلیں دلی آنے سے پہلے اپنی وطنی صحبتوں میں کہی ہوں گی، ممکن ہے کہ متعاقبین نے کسی اور قدیم شاعر کی کہی ہوئی ولی کے دیوان میں شامل کر دی ہوں۔"[۳]

---

[۱] مقدمہ گلشن گفتار ص۸، [۲] تذکرۂ جلوہ خضر جلد اول ص۱۴، [۳] کلیاتِ ولی ص۵۹ کا نوٹ،

ہمارے ایک فاضل دوست کا خیال ہے کہ عزلت کا کلام بھی مرتّب نے کلّیات میں شامل کر دیا ہے، ان الحاقی اشعار کو وَلی کے کلام سے دُور کرنا بہت مشکل ہے۔ احسنؔ صاحب نے تو یہ کلیّہ قایم کر دیا ہے کہ "جس غزل میں طاق سے زیادہ اشعار ہیں ان میں ضرور الحاق ہوا ہے"۔ [1]

کلامِ وَلی میں بعض محاورات والفاظ یا روزمرہ اور لب و لہجہ پر دکنی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے وہ دراصل دکنی نہیں ہیں اور جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں گجرات اور دکن دونوں میں مشترک ہیں بلکہ جو الفاظ اور محاورے خاص گجرات سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بھی دکنی سمجھ لیا گیا ہے۔ مثلاً کلّیات کے مرتّب نے شعر مندرجۂ ذیل کو دکنی زبان کے نمونے کے طور پر پیش کیا ہے: ؎

تمہیں ملنے سوں گر اپنے سُہاگن نا کر وگے مجھ
تو جوڑا گجگری کا اور کریلا دھار کرنا کیا

اس کے متعلق انہوں نے یہ تصریح کی ہے کہ:۔

"اس غزل کی ردیف بھی دکنی لہجہ کا پتا دے رہی ہے ..... گجگری جوڑا اور کریلا دھار جوڑے اور چوٹی کی خاص بناوٹ اور وضع کو صوبۂ دکن میں کہتے ہیں"۔ [2]

لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہی لب و لہجہ گجرات کا ہے۔ یہاں انہوں نے اس شعر کا جو مطلب سمجھا ہے وہ محض غلط ہے۔ اوّل تو سہاگن نہ ہونے کی حالت میں جوڑا یا چوٹی نہ باندھنا یا نہ گوندھنا کسی جگہ کی رسم نہیں ہے۔ صرف لفظ "جوڑا" دیکھ کر اس کو وہ معنی پہنا دئے جو عرفِ عام میں مشہور ہیں، اور اس کی وضع اور بناوٹ "گجگری اور

---

[1] کلّیات ص۵۳ کا نوٹ، [2] مقدمۂ کلیات ص۸۵،

کریلا دھار" بھی صوبۂ دکن میں بتادی جواب تک تشنۂ ثبوت ہے۔
اصل میں یہ لفظ "چوڑا" نہیں بلکہ "چوڑا" (بجیم فارسی) ؎۱ اور لفظ "گجگری" صحیح طور پر "گجکری" ہے صفیر بلگرامی نے ولی کے زمانہ کے الفاظ کی تبدیلی میر و مرزا کے زمانہ کے الفاظ سے بتاتے ہوئے ایک فہرستِ الفاظ پیش کی ہے، اس میں "چوڑا گجکری" کا بدل "کچکڑے کی چوڑی" دیا ہے ؎۲، اہل گجرات "چوڑی" کا مذکر "چوڑ" اُس کو کہتے ہیں جو ہاتھی دانت سے بنایا جاتا ہے اور یہ نسبت چوڑی کے زیادہ چوڑا ہوتا ہے اور شادی کے وقت دلہنوں کو پہنایا جاتا ہے۔ گجکری مرکب ہے گج بمعنی ہاتھی اور کر بمعنی ہاتھ سے یعنی ہاتھی ذانت کا بنا ہوا، اور اگر کچکڑے پڑھا جائے تو کچھوے کی کھال مراد ہوگی۔ ہاتھی دانت اور کچکڑے کی چوڑیاں گجرات اور کاٹھیاواڑ، خصوصاً ڈیلو میں بہت خوبصورت بنتی ہیں۔ اور آج بھی یہ صنعت اِن مقامات میں رائج ہے "کریلا دھار" دراصل ایک قسم کا کنگن ہے جس پر کریلے کے سے اُبھرے ہوئے نقش ونگار بنے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں گجرات کے مشہور زیور ہیں اور عورتوں کے سہاگ کی علامت ہے غرضیکہ ولی کا کلام دراصل گجراتی ہے جسے دکنی سمجھ لینے میں بڑا مغالطہ ہوا ہے جو گجراتی اور دکنی اُردو کے فرق پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گجراتی اور دکنی اُردو کے فرق پر روشنی ڈالی جائے۔

گجراتی اُردو اور اس کا اثر دکنی اُردو پر

ہر شخص جس نے اُردو کے ارتقائے لسانی کا مطالعہ کیا ہے، وہ

؎۱ دیکھو فہرست اختلافاتِ نسخ ضمیمۂ کلیاتِ ولی صـ ۴۴۔
؎۲ جلوۂ خضر جلد اوّل صـ ۷۳، اس میں کریلا دھار کی بجائے "گلے کا ہار" لکھا ہے۔

جاتا ہے کہ ہندوستان میں اُردو زبان کا ہندی ڈھانچہ ہر صوبہ میں یکساں رہا ہے، البتہ مقامی پراکرتوں نے اس کو مقامی رنگ دے دیا تھا۔ گجرات میں ۱۶ھ کے بعد سے برابر چھ صدیوں تک مسلمانوں کی آمد و رفت رہی ہے اور اس طویل مدت میں ممالک غیر سے مسلمانوں کے کئی خاندان یہاں آکر آباد ہو گئے تھے سواحل گجرات سے عرب و عجم کے لوگوں کی بکثرت آمد و رفت کی وجہ سے عربی فارسی زبانوں کے اثرات گجرات کی مقامی بولیوں پر ہوتے رہے اور خاص کر روزمرہ کی تمدّنی اور معاشرتی ضروریات اور بول چال کے لئے ابتداً یہاں کے مسلمانوں نے جو زبان اختیار کی وہ گویا گجراتی اُردو کی ابتدائی شکل تھی، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تاریخی حیثیت سے اُردو کا پہلا مرکز ہونے کا فخر گجرات کو حاصل ہے جہاں اُردو کا سنگِ بنیاد سب سے پہلے نصب ہوا، ساتویں صدی کے بعد خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ سے گجرات حکومت دہلی سے وابستہ ہو گیا، اسی زمانہ سے یہاں اُردو کی اس ابتدائی شکل نے ترقی کرنی شروع کی اور آٹھویں صدی تک ایک ایسی زبان وجود میں آچکی تھی جس کو گوجری یا ہندی کہا جاتا تھا، شاہانِ گجرات کے زمانہ میں بھی یہی زبان عوام کی بول چال میں رائج تھی، اگرچہ علمی اغراض کے لئے عربی اور فارسی مستعمل تھیں، سلاطین مغلیہ کے عہد میں یہاں اُردو نے خاصی ترقی کر لی تھی، اور اورنگ زیب کے عہد تک یہ زبان اپنی ارتقائی منزلیں طے کر کے بہت صاف، ستھری ہو چکی تھی، اور اس کی ادبی تشکیل بھی اسی جگہ ہوئی، چنانچہ وَلی نے اس زبان کی اصلاح کر کے اسکو اس قابل بنا دیا کہ وہ شعراء اُردو کی مستقل زبان بن گئی اور ان کے جدید رنگِ تغزل نے تمام ملک۔

کے شعراکو ایسا گرویدہ کر دیا کہ انہی کے نہج اور اسلوب پر اُردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی۔

دکن میں اُردو کی اصلاح و ترقی گجرات کے صوفیائے کرام اور شعرا و اُدبا کی رہینِ منّت ہے۔ اہل دکن کی آمد و رفت گجرات میں رہی ہے اور عہدِ اکبری میں کئی اہل علم و ادب گجرات سے دکن گئے ہیں۔ اسی سبب سے گجرات کی اُردو نے دکن کی زبان و ادب پر گہرا اور پائدار اثر ڈالا ہے۔ اُردو شہپارے کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

"اس عہد کی تواریخ دکن سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات سے بہت سے ادیب اور عالم بیجاپور آیا کرتے تھے۔ وہاں کی سلطنت کے زوال پر ابراہیم عادل شاہ نے وہاں کے تمام ادیبوں کو اپنے دربار میں بلا لیا، چنانچہ گجرات کے ان پناہ گزینوں نے دکن میں اُردو کا ادبی ذوق بڑھانے میں بڑا حصّہ لیا ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بیجاپور کے بعض اُردو مصنّفین اپنی زبان کو گجراتی کہتے ہیں۔" [1]

گجرات اور شمالی ہند کی طرح دکن کی اُردو میں بھی ولی نے ایک نیا دبستان قائم کر کے دکنی شاعری کا انداز اور اسلوب بدل دیا اور شعرائے دکن انہی کے تتبّع میں صاف اُردو لکھنے لگے، ورنہ اس سے پہلے دکنی شعرا کے کلام کو شعرائے ہند کسی وقعت کا مستحق نہ سمجھتے تھے، جیسا کہ میر تقی، میر حسن اور قائم وغیرہ کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے اور جداگانہ اظہارِ خیال چاہتا ہے۔

---

[1] حصّہ اوّل صد ۱۲

دکنی اور گجراتی اُردو کا فرق

دکنی اور گجراتی اُردو میں جو فرق ہے وہ بہت باریک ہے اور جبتک کوئی شخص اُردو زبان کی ارتقائی کیفیت سے واقف نہ ہو، اس کو نہیں سمجھ سکتا، یہ عام طور سے معلوم ہے کہ شمالی ہند سے بہت پہلے گجرات اور دکن میں اُردو زبان میں شعر و سخن کا آغاز ہو چکا تھا، اور جبکہ سلاطین دہلی کے دربار میں فارسی زبان کو دفتری زبان کا رتبہ حاصل تھا، گجرات اور دکن میں ہندی آمیز اُردو نشو و نما پا رہی تھی جو گجراتی اور مرہٹی کے اثر سے خاصی ترقی کر چکی تھی، یہی زبان جو شمالی ہند میں آگے چل کر اُردو کے نام سے موسوم ہوئی، دکن میں ہندی یا دکنی اور گجرات میں گوجری یا ہندی کہلائی، لیکن قواعد اور محاوروں کے لحاظ سے ان میں مقامی الفاظ و محاورات کے سوا کوئی زائد فرق نہیں ہے، گجرات اور دکن یا بالفاظِ دیگر صوبہ بمبئی اور صوبہ مدراس کے مسلمانوں میں جو زبان مروّج ہے وہ یہی دکنی ہے اور دونوں صوبوں کی زبان میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے۔ دکن اور گجرات دونوں ہمسایہ ملک ہیں اس کی وجہ سے گجرات اور دکن میں ایک ہی زبان رائج ہے، البتہ ان میں مقامی رنگ کی جھلک موجود ہے اس لئے اگر ولی کی زبان دکنی سے مشابہ ہے تو محض اس مشابہت کی وجہ سے اس کو دکن سے مخصوص کر دینا انصاف سے بعید ہے اس سلسلہ میں احسن مرحوم کا یہ قول ان کے علی الرغم ہماری تائید کرتا ہے کہ :-

"بعض الفاظ گجرات و دکن میں ضرور مشترک ہیں مگر اس شاذ اشتراک کو کثرتِ اختصاص پر ترجیح دینا تحقیق کا خون کرنا ہے۔"[1]

---

[1] مقدمہ کلیاتِ ولی صفحہ ۱۵،

مرحوم کو یہ تسلیم تھا کہ:۔

"ان کی غزلیں نامانوس تراکیب اور دکنی روزمرّہ کی بہتات سے پاک ہیں"۔ ۱؎

آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں:۔

"ولی کی عمر کا قریب قریب سارا حصّہ دکن و گجرات ہی میں گزرا ہے اس لئے بہت ممکن تھا کہ ان کے تمام اشعار نصرتی وغیرہم کی طرح از سرتا پا دکنی محاورات کا لباس پہنے ہوتے، لیکن اہل نظر دیکھیں گے کہ عالمگیری اُردو کا جو اثر شاہجہاں آباد میں تھا وہی اورنگ آباد اور احمد آباد میں پایا جاتا ہے"۔ ۲؎

اس سلسلہ میں دکنی ادب کا یہ نظریہ بھی قابل غور ہے کہ شعرائے اورنگ آباد کی زبان بہ نسبت دکنی کے بہت ترقی یافتہ تھی اور اس لئے وہ عموماً اپنی زبان کو دکنی نہیں کہتے تھے ۳؎، انہیں کا ثبوت ان کے کلام سے ملتا ہے اس نظریہ کے پیش نظر ولی کو جو اپنی زبان کو "دکنی" کہتے ہیں اورنگ آبادی نہیں کہا جا سکتا۔

بہر حال یہ مسلّمہ امر ہے کہ ولی کے کلام میں جو بعض الفاظ و محاورات آئے ہیں وہ گجرات کی قدیم اُردو میں اور دکنی میں مشترک ہیں، اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اکثر حصّہ ایسی زبان میں ہے جو میر و مرزا کی زبان بن گئی تھی، لہٰذا ان کے کلام پر "دکنی" کا اطلاق کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

۱؎ مقدمۂ کلیاتِ ولی صـ۶۵، ۲؎ مقدمۂ کلیاتِ ولی صـ۹۱

۳؎ دیکھو رسالۂ اُردو بابت اکتوبر ۱۹۳۲ء صـ۷۰۸،

گجراتی الفاظ و محاورات ولیؔ کے کلام میں

یہاں ہم ایک خاص بات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر بہت کم غور کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ولیؔ کے کلام میں خالص گجراتی الفاظ اور محاورے پائے جاتے ہیں جو ایک گجراتی کے سوا دوسرا استعمال نہیں کر سکتا، دکنی اور گجراتی اردو میں صرف ایسے الفاظ و محاورات مابہ الامتیاز ہیں جو مقامی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے کئی گجراتی اردو کے الفاظ خود دکنی میں بھی مشترک ہیں جس کا سبب اہلِ گجرات کا قیام دکن اور ان کی تصانیف اور شعرائے گجرات کے کلام کے اثرات ہیں، لیکن ولیؔ کے کلام میں جو خاص گجراتی الفاظ و محاورات ہم کو ملتے ہیں۔ وہ دکنی زبان میں کہیں نہیں پائے جاتے ہیں چونکہ ولیؔ کے گجراتی ہونے کی یہ ایک زبردست اندرونی شہادت ہے اس لئے ہم یہاں "کلیاتِ ولیؔ" سے بقیدِ صفحات ایسے الفاظ کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں۔

ص ۱۹ کُپٹ = یہ لفظ اگرچہ ہندی الاصل ہے مگر زیادہ تر گجرات میں مستعمل ہے، فرہنگِ کلیات میں اس کے معنی حسد و رنج لکھے ہیں، لیکن یہ لفظ بغض و کینہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔

ص ۱۵۳، نال = فرہنگ میں اس کے یہ معنی بیان کئے گئے ہیں "نال: پاس پنجاب میں بھی بولتے ہیں"، لیکن یہ پنجابی لفظ نہیں ہے بلکہ یہاں آنول کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ولیؔ فرماتے ہیں: ؎

نہ جاوے ملک بیتابی سوں یک لمحہ کدھی باہر
زمیں بیقراری میں گڑیا ہے نال عشق کا

"نال گڑنا" محاورۃً بولا جاتا ہے یعنی وہ سرزمین جہاں کسی کی ولادت ہوئی ہو اور وہاں اس کی نال گڑی ہو تو وہ گویا اس کا وطن ہو جاتا ہے، یہ محاورہ وؔلی کی اُردو میں بھی مستعمل ہے۔

ص ۲۳ بستار = یہ لفظ سنسکرت विस्तार بمعنی پہنائی، وسعت، اور تفصیل و تشریح، ہے

تجھ زلف کا بستار لکھا آج وؔلی نے
اس سحر کے طومار کوں پڑھ کون سکے گا۔

طومار گجرات میں مسل کو کہتے ہیں، فرہنگ میں اس کا مطلب غلط اور قیاساً لکھ دیا ہے۔

"بستار: ساز و سامان، طول کلامی، دفتر"۔

ص ۲۴، سینے کا سال = سال ایک چیز کو دوسری چیز میں بٹھانا جیسے ایک لکڑی میں سوراخ کرکے دوسری لکڑی کو اس میں بٹھایا جائے تو اس کو سال کہتے ہیں اور سینہ میں کوئی چیز مثل رنج و غم کے بیٹھ جائے تو اس کو سینے کا سال کہتے ہیں فرہنگ میں لکھا ہے "سال: کانٹا، مگر وؔلی نے سِل کی جگہ لکھا ہے"۔

۳۱ دھرم کا کام = بمعنی کارِ ثواب، خاص گجراتی محاورہ ہے اور گجراتی زبان میں "دھرم نو کام چھے" محاورۃً بولا جاتا ہے۔

۳۹ بھار = بمعنی وزن۔ ع

مور ضعیف ہے وؔلی خاک قدم بھار اُسے

یعنی ایک مور ضعیف کو جتنی مٹی لگ جاتی ہے وہ بھی اس کے لئے بار ہے، فرہنگ میں اس کے معنی لکھے ہیں "بھار بر وزن بار، باہر"

ص۴۸ اڑکا = بمعنی اٹکا، اڑکنا اور اڑکانا عام طور سے گجرات میں بولا جاتا ہے۔

ص۴۹ وِسواس = اصل سنسکرت विश्वास بمعنی اعتبار و اعتماد، یہ لفظ فرہنگ میں نہیں دیا گیا۔

ص۵۶ آدھار کرنا = دار و مدار رکھنا۔ ولی ؎

جو کئی جالے پیرت کی آگ میں تن من کو یوں اپنے
ولی سنگم بنا ایسے کوں پھر آدھار کرنا کیا

فرہنگ میں اس کی غلط تشریح کی گئی ہے۔
"ہندی بھاشا کا لفظ ہے بمعنی غذا، خوراک، ادھار بغیر مد بھی بولتے ہیں" لیکن اس میں مغالطہ ہوا ہے، غذا کے معنی میں جو لفظ آیا ہے وہ आहार ہے۔

ص۵۷ چِترنا = تصویر بنانا، سنسکرت اور گجراتی میں चित्र بمعنی تصویر مستعمل ہے۔ ولی ؎

تیری کمر مصور چِترا ہے کس ادا سوں

فرہنگ میں اس کا صرف مفہوم کھینچنا، لکھنا بتایا ہے۔

ص۶۶/۱۴۲ جھلجھلاٹ = جگمگاہٹ، استعارۃً رعب و جلال۔ ولی ؎

مکھ اوپر تیرے ہے ایسی جھلجھلاٹ
جس کے دیکھے ہوش نے باندھا ہے رخت

فرہنگ میں "غصہ، غیظ و غضب کا اثر"

ص۷۱ میاء = بمعنی رحم۔ ولی ؎

شوخ میرا بے میا ہے الغیاث
صاحب جور و جفا ہے الغیاث

فرہنگ میں اس کے معنی "مروت، لحاظ، محبت" لکھے

ہیں جو صرف قیاسی ہیں۔ ایک اور گجراتی شاعر غلامی (۱۷۲۵ء) لکھتا ہے ؎

رو رو حرم میاسین او س طفل کو سناتے
ہر یک لے بریں اس کوں چھاتی سیتیں لگاتے [۱]

صـ۷۶ چونل ہے = ٹپکتا ہے۔ ولی۔ ع
چوتا ہے اُس کی نین سے رنگ شراب آج۔

فرہنگ میں اس کے معنی نہیں لکھے، آنچک کو گجرات میں چواک کہتے ہیں۔

صـ۷۸/۱۶۵ چیرا = غالباً یہ ہندی لفظ چیر سے بنا ہے جس کے معنی کپڑے یا لباس کے ہیں، ہندوستان میں عام طور سے پگڑی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ امیر خسروؒ نے بھی اس کو باندھا ہے۔ ؎

اے دہلی وائے بتان سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

غیاث اللغات میں چیرہ کے معنی دستار منقش لکھے ہیں، شاید اسی پر سے فرہنگ میں اس کی تعریف "منقش پگڑی" کی گئی ہے۔ اصل میں گجرات میں یہ پگڑی زیادہ مروج رہی ہے اور اب تک اس کا رواج ہے۔ یہ عرض میں بہت کم اور کناروں پر زریں بنی ہوئی ہے اور مختلف طریقوں سے باندھی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ولی کے کئی اشعار ہیں[۲] جن سے اس پگڑی کا رنگ، طرز بندش، اور وضع قطع سب معلوم ہوتے ہیں، ایک اور پگڑی ہے جس کو پھینٹہ کہتے ہیں، یہ چیرے سے زیادہ چوڑا ہوتا ہے اور رنگین باندھا جاتا ہے ولی۔ ع وہ باندھا جب گلابی سر پہ پھینٹہ۔

۱؎ اُردو شہپارے، جلد اوّل، صـ۳۰،

۲؎ دیکھو کلیاتِ، صـ۸۷، صـ۲۶۰، ضمیمہ صـ۱۰، صـ۱۱،

ص۸۳ پٹکا = ایک لمبا چوڑا رومال جو کمر میں باندھا جاتا ہے۔ ولی

مژہ بتاں کی ہیں تجھ غم میں خوب مخمل سُرخ
لگی ہے پٹکے کوں گجرات کی یا ململ سُرخ

متن کلیات میں (ص۸۳) مصرعۂ ثانی اس طرح چھپا ہے :- ع

لگی ہے ترک کے پٹکے کوں یا مسلسل سُرخ

لیکن حاشیہ اور دیوان کے دیگر نسخوں میں اسی طرح ہے۔ کمر میں سُرخ ململ کا پٹکا باندھنے کی رسم گجرات میں پائی جاتی ہے اور مدراس کی سُرخ ململ کی طرح گجرات کی ململ بھی مشہور رہی ہے۔

ص۱۲۲ بتہ = یعنی سِل کا بٹّا، گجرات میں اس کو بتّا کہتے ہیں، ولی نے تخفیف باندھا ہے، سیہ رنگ کا پتھر، اور کسوٹی کے سیہ پتھر کو بھی بتّا کہتے ہیں۔ بٹّا اور بٹّی اسی پتھر سے بہ تبدیل واو کس وٹی یا کسوٹی بنا ہے یہاں اسی دوسرے معنی میں ولی نے استعمال کیا ہے

؎ دین کے خالص وہ زرِ غم کے بتّے کے اوپر
حق نے کیا امتحان آہ دریغا دریغ

فرہنگ میں لکھا ہے : " بتا، بوتہ بواو مجہول فارسی والے سونا چاندی گلانے والی گھریا کو کہتے ہیں۔ ولی نے بحذف واو کہا ہے "

ص۱۲۹ آل = خاص گجراتی لفظ، بمعنی گزند، آنچ، ولی ع

کہ آلِ نبیؐ پر نہ آوے گی آل۔

فرہنگ میں اس کے معنی " تری، نمی، سیلابی " غلط لکھے ہیں۔

ص۱۹۸ کان دھرنا = توجہ سے سُننا۔ ولی ع

ٹک کان دھر کے حال کسی کا سُنا کرو۔

ص۱۵۲ سُرمے کی سَلی = سلائی کو گجرات میں سَلی کہتے ہیں۔

صگ اُچُرج = आश्चर्य کی بگڑی ہوئی صورت، گجرات

میں اس کو اچُرت بھی کہتے ہیں۔

ص ۱۶۶، سنجاب = اُردو میں اس کو سنجاف بھی کہتے ہیں، چوڑی گوٹ، اہلِ گجرات کی اصطلاح میں وہ رنگین ریشمی رطلس کی گوٹ جو کرتے یا پشواز کے دامن کے نیچے بطور استر ڈالی جاتی ہے وؔلی اسی معنی میں کہتے ہیں ؎

اے دل پرخوں کو میں لایا ہوں تیرے پیشکش
کر خرچ اگر درکار ہے اطلس تجھے سنجاب کوں

اسی معنی میں کسی شاعر کا شعر ہے: ؎

نہیں ہے گرد دامن سُرخ سنجاف
لہو میرا ہے دامن گیر دیکھو

ص ۲۱۹/۳۶۸، بھوئیں = زمین۔ اصل بھوم یا بھُومی ہے گجراتی میں اس کو भोम کہتے ہیں

ص ۲۲۰، جوکھا = بمعنی تولا، گجراتی لفظ ہے۔

ص ۲۳۷ حیاتی = بمعنی حیات، زندگی، عمر، وؔلی۔ ع

تا حشر کرے سیر حیاتی کے چمن میں۔

ص ۲۴۰ چپل = پھرتیلا، چالاک، ع

جہاں مانند بجلی کے مرا چنچل چپل جاوے۔

فرہنگ میں اس کے معنی "طفل مزاج اور شوخ" لکھے ہیں۔

ص ۲۴۰، پور = سیلاب، فرہنگ میں: "پور، پر پہلا لفظ بمعنی طفل اور پُر (دریہ)، اور دوسرا پُرے کا مخفف" لکھا ہے۔ وؔلی ع

میری انکھیاں کی انجھواں سوں ندی کا پور چل جاوے۔

دوسرا شعر ہے: ؎

آج تجھ غم سوں ہے وؔلی گریاں   دیکھ چل پور کا تماشا ہے۔

یہ لفظ خاص گجراتی ہے فرہنگ میں "پنگھٹ، پانی کی جگہ"، غلط لکھا ہے

ص ۲۵۳، ہُلاس = بمعنی خوشی، موجودہ گجراتی میں اس کو उल्लास کہتے ہیں۔

ص ۲۶۰، فتنے کی جڑ = باعثِ فتنہ۔ خاص محاورہ اہل گجرات کا ہے۔

ع رقیب رُوسیہ فتنہ کی جڑ ہے۔

ص ۲۶۱ ڈاڑم = انار۔ فرہنگ میں اس کو حرف واو کے تحت میں داڑم لکھا ہے جو غلط ہے۔

ص ۲۸۸/۳۰۸ ہٹ چُھٹا = ہٹ چھٹ، چھکیت۔ ولی: ؎

نظر کرتا ہے مجھ پر یار کج کر

بھلا راوت سپاہی ہٹ چھٹا ہے

ص ۲۸۸، اَجانا = انجان۔ گجراتی لفظ अजाण्य ہے۔

ص ۳۲۳ ناٹھ گئے = بھاگ گئے، ٹھیٹھ گجرات کا محاورہ ہے۔

ص ۳۵۲ کسبل = اصل میں یہ کسبن کی خرابی ہے، بمعنی قحبہ۔ دیوان میں اس کو کسمل لکھا ہے۔ گجرات میں کسبی کو کسبن کہتے ہیں۔ ولی: ؎

یہ کسی سوں وفا نہ کی ہرگز

بے وفا ہے مُدام یہ کسمل

ص ۷۳۵ کُنواں = کنویں کا یہ تلفظ خاص گجراتی ہے، بلکہ عام طور پر کُوا بولتے ہیں۔

ص ۳۸۰ ہاٹ = دوکان۔ اس کی تصغیر ہٹڑی بھی آتی ہے۔

ص ۳۵۵، اوجھل = پردہ کے معنی میں خاص گجرات میں مستعمل ہے۔ ولی ؎

دُور کر مکھ اد پرسوں یہ گھونگھٹ

پاکباز اں سوں کیوں رہتا اوجھل

اس لفظ کو فرہنگ میں چھوڑ دیا ہے۔

ص ۹ ضمیمہ کاڑنا = نکالنا۔ جیسے جیب میں سے پیسے کاڑنا۔ خاص گجرات کا محاورہ ہے

صہ ۳۱ پھند = مکر و فریب، چالاکی۔

صہ ۴۴ گھانے کا بیل = کولھو کا بیل۔ خاص گجراتی محاورہ ہے۔

صہ ۴۶ ادھر = معلّق۔ اصل سنسکرت میں اس کے معنی ہونٹ کے ہیں۔
جیو ادھر آرہا ہے۔ یعنی جان معلّق رکی ہوئی ہے۔

صہ ۵۰ لڑاہنا = ٹھیٹھ گجراتی محاورہ ہے۔ اس کو لڈانا بھی بولتے ہیں۔
اس کے معنی فرہنگ میں نہیں بتائے گئے۔ کسی چیز کو ہاتھوں پر اچھالنا، جھلانا، زیادہ ہاتھ ہلانے کو لڈانا کہتے ہیں۔ ولی: ؎

چھبیلی چھب سوں درزن کا ہلانا ہاتھ ٹک دیکھو
یو کچھ سیتی نہیں لیکن میرے دل کو لڑاتی ہے

سلائی کے وقت ہاتھ کی حرکت کا ذکر ہے۔

صہ ۵۱ دیوی = چھوٹا چراغ: ؎

مہ جبیں پر لگائے کیوں ٹیکا
ماہ میں کام کیا ہے "دیوی" کا

یہ لفظ دکنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ عشرتی: ؎

دیویاں سوں کنگراں ایسے سنوارے
کہ جیوں قوسِ قزح میانی ستارے

اس فہرست میں صرف وہی الفاظ دیئے گئے ہیں جو خاص گجرات میں مستعمل ہیں، ورنہ ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست دی جاسکتی ہے جو دکن و گجرات میں مشترک ہیں۔

ولی کا قیام دکن اور اُس کے اسباب

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے غالباً ایک سے زائد مرتبہ دکن کا سفر کیا تھا۔ مگر بعض دکنی مصنّفین نے ولی کا دکن سے گجرات محض سیر و تفریح کی غرض سے جانا بیان کیا ہے اور سند میں ولی کا فراق

گجرات والے قطعہ کا ایک شعر پیش کیا ہے جس میں لفظ "سیر" استعمال ہوا ہے[۱]

اس سیر کے نشہ سوں اوّل تر دماغ تھا
آخر کو اس فراق میں کھینچا خمارِ دل

جو شہادت دلی کے گجراتی ہونے کی ہے اسی میں حرفِ مطلب ڈھونڈھ کر حسب منشا بنالیا گیا ہے۔ فراق وطن کا ہوا کرتا ہے نہ کہ اُن شہروں کا جہاں انسان محض سیر و تفریح کے لئے جائے، اِس نظم کا ایک ایک شعر ولی کے حُبِّ وطن کی تصویر ہے، مثلاً:

ہجرت سوں دوستاں کے میرا دل ہوا گداز
عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل
ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں
ہر دم میں بیقرار ہے مثلِ شرار دل
سب عاشقاں حضور اچھے پاک سُرخ رو
اپنا اپس لہو سوں کیا ہے فگار دل

اس کے ایک شعر میں ولی نے لفظ "سیر" لکھا ہے تو اس سے مراد یہاں اپنے وطن کی سیر ہے انسان جب غربت و مسافرت میں ہوتا ہے تو اُسے اپنے وطن کی ایک ایک بات یاد آتی ہے، وہاں جو سیر و تفریح کی ہوتی ہے اس کی یاد غربت میں دلوں کو برماتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ ع

وطن کی یاد ہیں گلیاں جوانی جس میں کھوئی ہے!

دکن میں "قدر سخن" کا آوازہ سُنکر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی "دلی کی گلیاں" ذوق کی چشم تصور میں پھرنے لگ گئی تھیں۔ اگر ہمارے شاعر

---

[۱] محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن۔ جلد دوم، ص ۱۱۳۶۔

کو عالمِ مسافرت میں اپنے وطن کی سیر یاد آ گئی تو اس میں کونسا استعجاب اور استبعاد ہے؟ صرف ادنیٰ ملابست لفظ "سیر" سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ پھر ولیؔ کا آخری شعر میں اس قدر جزم کے ساتھ لکھنا کہ:

ع پھر اُس کے دیکھنے کا ہے اُمیدوار دل

بتاتا ہے کہ شاعر عنقریب وطن کو مراجعت کرنے والا ہے۔ اس کا یہ مفہوم پیدا کرنا کہ "ایک بار دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے" محض من گھڑت اور "تاویل مالا یرضٰی بہ قائلہٗ" کا مصداق ہے جس کو کوئی صاحبِ فہم تسلیم نہیں کر سکتا۔

عام طور سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ولیؔ نے یہ قطعہ دکن میں بیٹھ کر لکھا ہے اور یہ مفہوم اس شعر کا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اس قطعہ کی تحریر ان کے مفروضہ وطن میں فرض کی جائے، ورنہ کسی اور جگہ لکھنا ثابت ہو تو سوائے اپنے وطن گجرات کے فراق کے دوسرا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا لیکن کلیاتِ ولی کے مرتب لکھتے ہیں:۔

"شہر گجرات (؟) کے لئے یہ قطعہ کہا گیا ہے جبکہ وہ سیّد معالی کے ہمراہ صوبۂ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں" [1]

اس چند روزہ عارضی غیبت پر وطن کے فراق میں ایسی گرما گرم نظم لکھنے کی یہ صحیح وجہ نہیں معلوم ہوتی، چنانچہ ایک مضمون نگار مرتّب کلیّات سے اختلاف رائے کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: [2]

"احسن مارہروی کا قیاس ہے کہ شہر گجرات کے لئے یہ قصیدہ کہا گیا ہے جبکہ وہ سیّد ابوالمعالی کے ہمراہ صوبۂ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک گئے ہیں" ہماری رائے اس کے خلاف

---

[1] الموسیٰ یادگار ولی نمبر صفحہ ۲۰، [2] کلیاتِ ولی صفحہ ۳۸۵ کا نوٹ۔

ہے۔ ولی نے سیّد ابوالمعالی کے ہمراہ پہلا سفر جوانی کے زمانہ میں کیا ہے۔ ؎

اوّل سوں تھا ضعیف یہ پابستہ سوز میں
جوں بال ہے اگن کے اُوپر بیقرار دل

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بڑھاپے کی بات تھی۔
ولی نے زمانۂ شیب میں ایک دور دراز کا سفر حجاز مقدّس کا کیا۔ یہ سفر نہ صرف خطرناک تھا بلکہ طویل بھی، دل سے نہ رہا گیا، بے اختیار رو دیئے اور فراقِ گجرات میں مرثیہ پڑھا، لیکن حج کی برکت اور "فیض حق" سے انہیں یقین تھا کہ وہ گجرات واپس ہوں گے ؎

لیکن ہزار شکر ولیؔ حق کے فیض سوں
پھر اس کے دیکھنے کا ہے اُمیدوار دل"

ممکن ہے کہ ولیؔ نے فریضۂ حج اواخر عمر میں ادا کیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ارضِ مقدس میں بیٹھ کر انہوں نے فراق گجرات میں یہ آنسو بہائے ہوں، لیکن یہ سب باتیں قیاسی ہیں۔ اور اگر یہ صحیح ہوں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ولی نے فراق گجرات میں مرثیہ کیوں پڑھا؟ جبکہ یہ ان کا وطن نہ تھا؟ اگر اورنگ آباد ان کا وطن ہوتا تو اپنے طویل قیام گجرات کے زمانہ میں وہ ضرور اس کے فراق میں کوئی پرسوز وگداز قطعہ لکھ ڈالتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ تھا، ایسا نہ ہوا !!
ولی نے غالباً دو مرتبہ دکن کا سفر کیا، ممکن ہے اس سے بھی زیادہ بار آئے گئے ہوں، لیکن اس کی کوئی تحریری شہادت نہیں مل سکی، صرف قیاس ہی قیاس ہے۔ ولی کے خاندان کے بزرگ ولی سے تقریباً سو سال پہلے احمد آباد سے برہان پور اور بیجاپور جاکر وہاں سکونت پذیر

ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے برادر حقیقی شاہ برہان الدینؒ بھی برہان پور میں مقیم تھے اور وہیں انہوں نے وفات پائی [۱] خود حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے فرزندوں میں سے بعض نے آپ کے عین حیات میں سلاطین فاروقیہ کے عہد میں برہان پور اور بعض نے خاندیس میں سکونت اختیار کی تھی [۲] خود ولی کے قریبی رشتہ دار چچازاد بھائیوں کا خاندیس اور برہان پور میں بود و باش رکھنا پایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض کی شادیاں سلاطین فاروقی کے خاندان میں ہوئیں۔ اس وجہ سے ان کی اولاد کا اور ان کی آمد و رفت کا سلسلہ مدتوں قائم رہا۔ ولی کے ہمجدّی چچا شاہ حفیظ اللہ علوی [۳] کے لئے شجرۂ انساب میں لکھا ہے "در دکن رفتہ اند" اسی طرح ولی کے برادر نسبتی مولانا شیخ فرید ابن علّامہ شریف صدیقی، الاحمد آبادی المتوفی ۱۰۹۲ھ جو احمد آباد کے مشہور علما میں سے اور مولانا نور الدین صدیقی کے استاد تھے، ان کے فرزند جمیل اللہ اور ان کے بیٹے شیخ فرید کا قیام عالمگیر کے زمانہ میں اورنگ آباد میں رہا، اور موخر الذکر کا انتقال بھی اورنگ آباد میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے [۴] علاوہ ازیں

---

[۱] ان کا حال تاریخ برہان پور (مطبوعہ کوثر پرنٹنگ پریس) میں ہے۔ ان کے فرزند شاہ سید ہاشم حسینی علوی قدس سرہٗ مشاہیر اولیائے بیجاپور میں شمار کئے گئے ہیں ۱۰۵۶ھ میں آپکا وصال ہوا، آپکا اور آپکی اولاد کا حال روضۃ الاولیاء بیجاپور میں مفصل درج ہے۔ ضلع خاندیس میں شاہ برہان الدین کی اولاد اب بھی موجود ہے۔ [۲] ان کا حال رسالہ خلاصۃ الوجیہ عربی (قلمی) مصنفہ احمد بن محمد فاروقی (۱۰۵۲ھ) میں ہے مرآۃ احمدی میں بھی شاہ صاحب کی اولاد کا احمد آباد اور برہان پور میں قیام کرنے کا ذکر ہے۔ (دیکھو صفحہ خاتمہ) [۳] رشد و ہدایت کے سلسلہ میں شاہ حفیظ اللہ کا قیام حیدر آباد و اورنگ آباد میں رہا کرتا تھا (گلزار آصفیہ ۳۵۲ھ) [۴] "میاں شیخ فرید بن جمیل اللہ در اورنگ آباد مدفون شد ۲۶ ربیع الاول ۱۱۴۹ھ" (اعراس نامہ قلمی)

شیخ فرید ابن جمیل اللہ کی دو لڑکیاں ولی کے دو بیٹوں سے منسوب تھیں، ان وجوہات کی بنا پر ولی اور ان کے فرزندوں کا اورنگ آباد جانا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ولی کے پوتے شریف میاں نے اپنے نانا جمیل اللہ بن مولانا فرید صدیقی کی وفات کا قطعہ بھی کہا ہے۔ [1]

ولی کے کلام میں ان کے سفر یا اقامتِ دکن کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ ایک شعر میں صرف بطور تمثیل "بیجاپور کا گڑھ" آیا ہے۔ اس کے سوا دکن کے کسی مقام کا ذکر تک موجود نہیں ہے۔ حالانکہ ان کے دیوان میں گجرات کے بعض مقامات کے نام آئے ہیں۔ مثلاً دریائے تپتی، سورت، نربدا، اکرم کا باغ، دمن جو گجرات میں فرنگیوں کا ایک شہر ہے ؎

ہوئے ہیں دنگ تصویرِ فرنگ دیکھ
تری صورت کہ بہ رشکِ دمن ہے

ولی کے کچھ عرصہ تک برہان پور میں قیام کرنے کا ذکر حمید اورنگ آبادی نے کیا ہے۔ [2]

ان حالات و واقعات سے ولی کا دکن کے بعض شہروں میں آنے جانے کا حال اور اس کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً اسی طرح کے عارضی قیامِ دکن کے سبب بعض تذکرہ نویسوں نے ان کو اورنگ آبادی خیال کر لیا ہے جو یقیناً غلط ہے۔

---

[1] تاریخ یافتہ شریف میاں۔

شریفِ وقت فریدِ زماں جمیل اللہ — کہ بود شمع شبستانِ افضل الفضلا
نمود رحلتِ آں سرو بوستان امید — بسوئے روضۂ رضواں ازیں مقام بلا

(اعراس نامہ قلمی)

[2] گلشنِ گفتار ص ۸،

گجراتی اعزّہ اور احباب و تلامذہ کا ذکر دیوانِ ولی میں

ولی کے گجراتی ہونے کی ایک اور اندرونی

شہادت یہ ہے کہ ان کے بعض گجراتی اعزّہ، پیر طریقت، اور احباب و تلامذہ کا ذکر انہوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے اور اپنے خاندانی بزرگ حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ خاندانی اعزّہ میں کامل، اکمل، سراج اور شمس الدین کا ذکر آیا ہے۔ کامل ؎

ولی اس ماہ کامل کی حقیقت جو نہیں سمجھا
وہ ہرگز نیں سمجھا عالم میں اکمل کے معانی کوں

اکمل۔ ان کی شان میں ولی نے ایک غزل صنعت توشیح میں کہی ہے جس کا مقطع ہے۔ ؎

نام تیرا ولی نے اے اکمل
شوق سوں ورد صبح و شام کیا

شاہ کامل اور شاہ اکمل دونوں سگے بھائی حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے خاندان سے تھے۔ ولی کی ان سے خاندانی قرابت تھی۔ ان دونوں بھائیوں اولادیں آج بھی احمد آباد میں موجود ہیں۔

سراج۔ شاہ سراج الدین شاعر نہ تھے بلکہ ولی کے ہم نسب اور خاندانی رشتہ دار اور ہم عمر دوستوں میں سے تھے جن کی شادی کے موقع پر ولی نے یہ شعر کہے ہیں۔ ؎

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں
فانوس دل میں شوق ترا ہے سراج آج

وہ شوخ مجھ سے آ کے ملا اس سبب ولی
شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں لاج آج[1]

---

[1] کلیات میں "لاج" لکھا ہے لیکن بمبئی اڈیشن میں راج ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے یعنی کہ اپنے دوست کی شادی میں ولی نے آج حکومت کی، راج کرنا بھی گجرات کا محاورہ ہے۔

شاہ سراج نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور مادۂ تاریخ "شیخ قطب زماں" ہے[1] دکنی اہلِ قلم کی ستم ظریفی نے شاہ سراج الدین احمد آبادی کو سراج اورنگ آبادی بنا دیا۔[2] حالانکہ مؤخر الذکر وفات ولی کے ۸ سال بعد پیدا ہوا تھا! شمس الدین ؎

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا
چین میں ہے شور جن کی ابروئے پُر چین کا

یہ شاہ سراج الدین کے بیٹے تھے اور ولی کے عزیز۔ ان کی اولاد میں آج بھی کئی لوگ احمد آباد میں موجود ہیں۔

بعض تذکرہ نویسوں خصوصاً آزاد، صغیر بلگرامی اور آصفی نے شمس الدین کو ولی کا لقب یا اُن کے نام کا ایک جزو خیال کر لیا ہے۔[3]

ان خاندانی قرابت داروں کے علاوہ ولی کے اشعار میں ان کے پیر طریقت اور بعض مسلم و غیر مسلم احباب کا نام آیا ہے۔ علی رضا ؎

بعد شاہ نجف ولی اللہ
پیر کامل علی رضا پایا[4]

شاہ علی رضا گجراتی جن کے ہاتھ پر ولی نے بیعت کی تھی۔ فتوت نے "ریاض حسنی" میں ولی کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

"دوست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضا گجراتی قدس سرہ دارد"[5]

---

[1] دیکھو یادگارِ ولی ص۵۶، [2] شاہ سراج کے پوتے شاہ حامد بن علاء الدین ابن شاہ سراج علوی متوفی ۱۱۸۳ھ کی بیاض میں ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ موجود ہے۔

[3] جلوۂ خضر جلد اول ص۷۹، محبوب الزمن، ج ۲، ص۱۱۳۴،

[4] کلیات میں مصرعہ اولیٰ میں فقد چھپا ہے جو بعد کی تصحیف معلوم ہوتی ہے، یا پھر بخل سے نقد ہو گیا ہو۔ [5] مقالاتِ ہاشمی ص۴۲۵،

مرآۃ احمدی میں بھی ان کا تذکرہ آیا ہے [1] سید ابوالمعالی ؎

ہوا مجھ دل کی وحشت سوں ہر یک آہ جیوں طوبیٰ
لٹک چلنا جو دیکھا بسکہ میں سیّد معالی کا

حمید اورنگ آبادی نے ان کو گجرات کے مشائخ زادوں میں لکھا ہے
ولیؔ کے احباب خاص میں سے تھے۔ محمد مراد ؎

مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولیؔ مجھے
جو مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے

یہ عہد اورنگزیب میں پہلے احمد آباد صوبہ گجرات کے پرگنات کی وقائع نگاری اور سوانح نگاری سے ترقی کر کے گودھرا اور بڑھاسرا (گجرات) کے فوجدار ہو گئے تھے۔ ۱۱۲۲ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے [2] غالباً قیام گجرات کے زمانہ میں ولیؔ کے تعلقات ان سے قائم ہوئے ہونگے۔ محمد یار خاں ؎

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد یہ ہندوستاں
حسن کی دِلّی کا صوبہ ہے محمد یار خاں

یہ دہلی کے ناظم تھے اور غالباً ولیؔ کے قیام دہلی کے زمانہ میں ان سے تعلّقات رہے ہوں گے۔ یہاں ان کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ سفر دہلی کے سلسلہ میں بعض دکنی شعرا سے غالباً انہی کے ہاں ولیؔ کی ملاقات ہوئی ہوگی۔

ولیؔ کے زمرۂ احباب میں گجرات کے بعض ہندو دوستوں کے نام بھی نظر آتے ہیں جو ولیؔ ایسے صوفی اور وسیع المشرب شاعر سے کوئی بعد امر نہیں ہے۔ ان میں گوبند لال، امرت لال، بیر لال، اور کھیم داس بیراگی کے نام انہوں نے مستقل غزلیں کہی ہیں ؎ گوبند لال

ہے آج خوش قداں میں کمالِ گوبند لال
اُستاد چال سرو ہے چالِ گوبند لال

---

[1] خاتمہ ص ۱۰۵، [2] ماثر الامرا، ج ۳، ص ۶۸۲ تا ص ۶۹۲،

(امرت لال) شمع بزم وفا ہے امرت لال
سرو باغ دلا ہے امرت لال

(بیر لال) دیکھا ہے بیر لال کوں اکرم کے باغ میں
پہنچی ہے بوئے عشق کی اس کے دماغ میں

(اکرم سے مراد شیخ محمد اکرام الدین خاں شیخ الاسلام عبدالوہاب کے پوتے جنہوں نے احمد آباد میں ایک عالیشان مدرسہ "ہدایت بخش" کے نام سے تعمیر کرایا تھا جس میں علامہ نورالدین درس دیتے تھے۔ انہی کی مدح اور مدرسہ کی تعریف میں ولی نے رسالہ نورالمعرفت لکھا تھا۔)

مندرجۂ بالا تینوں احباب احمد آباد کے بنیئے معلوم ہوتے ہیں کہ لال کا لاحقہ عموماً گجراتی بنیوں کے ناموں کے ساتھ آتا ہے، جس طرح دکن میں راؤ اور جی ہندو ناموں کے آخر میں لگتا ہے، آصفی نے ان تینوں کو دلی کا بتایا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ سب گجراتی ہیں ؂ (کھیم داس)

ہے بسکہ آب و رنگ حیا کھیم داس میں
آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

گجرات ہر مذہب اور ہر فرقہ کے آدمیوں کا مرکز تھا خصوصاً ہندوؤں کے جتنے فرقے احمد آباد میں تھے شاید ہی ملک کے کسی اور حصہ میں ہوں یہ کھیم داس بھی بیراگیوں کے فرقہ کا کوئی نوجوان تھا جس سے ولی کے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے۔

تلامذہ میں سے صرف اشرف کا نام ولی نے اس کے ایک مصرعہ کو تضمین کرتے ہوئے لیا ہے۔ ؂

اشرف کا یو مصراع ولی مجھ کوں ہے دلچسپ
الفت ہے دل و جاں کو میرے سیم نگر سوں

سید محمد اشرف تخلص اشرفؔ احمد آباد کے رہنے اور ولیؔ کے شاگرد تھے۔ جیسا کہ حمیدؔ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے[1]۔ اشرفؔ کے متعلق بھی "دکنی" ہونے کا امکان بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب فرماتے "ممکن ہے کہ یہ اشرفؔ دکنی ہی ہو!"[2] حالانکہ آگے چل کر آپ نے اشرفؔ کے گجراتی ہونے کے متعلق حمیدؔ کا بیان بھی نقل کر دیا ہے!

---

[1] اشرفؔ کی چند غزلیں مخطوطہ دیوانِ ولیؔ کے حاشیہ پر چڑھی ہوئی ہیں جو احمد آباد کی بھولا ناتھ لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں صفحات ۳۱، ۴۳، ۴۴، ۵۴، ۶۰، ۶۳ پر کل چھ غزلیں ہیں۔ ان میں سے ایک غزل میں اشرفؔ نے بھی اپنے استاد کا ایک مصرعہ تضمین کیا ہے۔

> یو مصرعِ شعرِ ولیؔ اشرفؔ تو کر وردِ زباں
> غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو

ایک اور شعر میں اشرفؔ نے ولیؔ کے مصرع کو تضمین کیا ہے:

> کرتا ہے یو مصراع ولیؔ ورد دل اشرفؔ
> پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا

ولیؔ کی طرح اشرفؔ نے بھی سید معالی کے حسن کی تعریف کی ہے:

> جگت کے خوبرو سارے نہ ہوئیں کیوں حکم میں اس کے
> دیارِ حسن میں فرخ سیر سید معالی ہے

اشرفؔ نے اپنے کلام میں گجرات کے مشہور بزرگ حضرت شاہ عالمؒ کی تعریف کی ہے۔

> پیر اشرفؔ کے شاہ عالم ہیں   خلف الصدق سید الاقطاب

اشرفؔ کے کلام کا رنگ بھی وہی ہے جو ولیؔ کا ہے۔ اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ ۱۱۲۹ھ کا لکھا ہوا "انجمن ترقی اردو" کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (اردو بابت جولائی ۳۵ء ص ۵۸۶) اس کا ایک اور نسخہ ہمارے مکرم سید نجیب اشرف صاحب کے پاس موجود ہے۔

[2] یادگارِ ولیؔ ص ۵۴ و ص ۲۰۵۔

اشرف کے علاوہ ولی کے ایک اور شاگرد رضی کا بھی حمید نے ذکر کیا ہے جو احمد آباد کا باشندہ تھا اور اشرف کے ایک ریختہ کے جواب میں رضی کا ریختہ بھی نقل کیا ہے[1]
ولی کے معاصرین اور احباب کے سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ ولی کے اُستاد شاہ سعد اللہ[2] گلشن بھی گجراتی الاصل تھے۔ ان کے اجداد

---

[1] گلشنِ گفتار، ص۱۲، اشرف نے رضی کا ذکر کیا ہے :

اس مصرع رضی کا اشرف ہے دل سوں بھوکا
بے غم ہمارے غم کوں کھاتا نہیں سبب کیا

یاد کر اشرف یو مصراع رضی   مصحفِ گل کا سبق بلبل پڑھے

ولی کے ایک اور گجراتی شاگرد ثنا کا ذکر فائق نے کیا ہے۔ (مخزن شعراء) ولی کے بعد بھی گجرات میں ولی ثانی کے دعوے ہوتے تھے، چنانچہ احمد آباد کے ایک شاعر میر حسن علی حسن (۱۲۶۰ھ) کہتے ہیں :

آفریں تجھ کو حسن بعد ولی کے تو نے
صبح مضموں سے مبدل کیا گجرات کی رات

[2] تذکرہ نویسوں میں سے صرف میر حسن نے ولی کا شاہ صاحب سے استفادہ کرنا لکھا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دی تاسی نے بھی شاہ صاحب کو ولی کا استاد بتایا ہے (خطبات ص۱۳۵) لیکن حاشیہ نگار نے اس پر انکار کا حاشیہ چڑھایا ہے۔ ہمارے پاس خود ولی کی تحریری شہادت موجود ہے۔ اپنے رسالۂ نور المعرفت کے آخر میں لکھتے ہیں۔ "مصنف ایں عبارت کہ ہمین ثنا پردازی بزرگاں بخطاب ولی سرفراز است وا رشاگردی زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن ممتاز" (خاتمہ مخطوطہ)
ولی کا یہ رسالہ غالباً آزاد کی نظر سے گزرا تھا مگر وہ بھی اس تردد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ :-

"شاید ان سے شعر میں اصلاح لی ہو"

ولی کے معاصرین میں مولانا نور الدین احمد آبادی سے مرتب کلیات نے ولی کا دست بیع ہونا لکھا ہے (مقدمہ کلیات ص۲۱) اس میں شک نہیں کہ ولی نے رسالۂ نور المعرفت" انہی کی تعریف میں لکھا ہے، لیکن سبب تالیف میں خود ولی نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اپنے "پیر روشن ضمیر" یعنی حضرت شاہ علی رضا کے [illegible] سے مولانا نور الدین اور انکے مدرسہ کی توصیف میں یہ رسالہ تصنیف کیا ہے۔

میں سے کوئی بزرگ سلاطینِ گجرات کے عہد میں وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ شاہ صاحب کا آبائی وطن احمد آباد گجرات تھا اس لئے وہ بھی احمد آباد میں رہا کرتے اور دہلی میں مقیم ہونے کے بعد بھی وہاں آیا جایا کرتے تھے۔ برہان پور میں بھی ان کا قیام رہا ہے[1]۔ غالباً احمد آباد اور برہان پور کے زمانۂ قیام میں ولی کے ان سے تعلقات قائم ہوئے ہوں گے۔

ولی نے اپنے ہمعصر دکنی شاعروں میں سے صرف آزاد[1] اور فراقی[2] کے مصرعے ان کے تخلص کے ساتھ تضمین کئے ہیں۔ ؎ آزاد، فراقی۔

۱؎ آزاد سے سنیا ہوں یو مصرع مناسب
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

۲؎ ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جبکہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

ایک شعر میں فراقی پر معاصرانہ طنز بھی کی ہے: ؎

ترے اشعار ایسے نیں فراقی
کہ جن پر رشک آویگا ولی کوں

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولی کی ملاقات ان دونوں سے ہوئی تھی۔ قائم نے آزاد اور فراقی کا محمد یار خاں کے زمانۂ صوبہ داری میں دہلی جانا بیان کیا ہے[2]۔ اور ولی بھی غالباً اسی زمانہ میں دلی گئے ہیں۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ وہاں ان دونوں سے صحبتیں رہی ہوں گی۔

دکن کے ایک قدیم شاعر شوقی حسن (م قبل ۱۰۶۶ھ) کا نام ولی نے ایک شعر میں لیا ہے۔ ؎

بزجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دوجے بار
رکھ شوق میرے شعر سوں شوقی حسن آوے

محض "شوق" کی رعایت سے یہاں شوقی حسن کا ذکر آیا ہے

۱؎ ریاض الشعرا قلمی، ص۲۷، سرو آزاد، ص۱۹۸، تذکرۂ بے نظیر، ص۱۰۵، ۲؎ مخزن نکات، ص۸-۷،

کہا گیا ہے کہ ولیؔ نے رنگینؔ تخلص کے کسی دکنی شاعر کا مصرعہ تضمین کیا ہے

ولی یو مصرع رنگیںؔ ہوا ہے ورد جان و دل،
فدا ہے عشق میں دلبر کے جان و مال عاشق کا

لیکن یہاں رنگین مصرعے کی صفت بھی ہو سکتی ہے، اور بالفرض یہ کسی شاعر رنگینؔ تخلص کا مصرعہ ہو تو اس تخلص کا کوئی دکنی شاعر نہیں پایا جاتا جو ولیؔ کا ہمعصر ہو۔ شفیقؔ اور آصفی نے نورالدین علی خان رنگینؔ کا ذکر کیا ہے جس نے ۱۱۷۲ھ میں عین عالم شباب میں وفات پائی ہے[۱] اس حساب سے وہ وفات ولیؔ کے کئی برس بعد گزرا ہے۔

اسی طرح شفیقؔ نے عراقیؔ دکنی کا ذکر ولیؔ کے اس شعر کی بنا پر کیا ہے کہ وہ ولیؔ کا معاصر تھا:

تیرے سخن کے نغمۂ رنگین کو سُن ولیؔ
ڈوبا عرق سے بیچ عراقیؔ عراق میں

لیکن یہاں ولیؔ کی مراد فارسی کے مشہور صوفی شاعر عراقیؔ سے ہے۔ آصفی کا بھی یہی خیال ہے[۲] مختصر یہ کہ ولیؔ نے صرف آزاد اور فراقیؔ کے سوا اپنے کسی دکنی معاصر یا کسی دوست یا شاگرد کا ذکر نہیں کیا۔[۳] اور کہ معاصرین میں ولیؔ کے اعزہ، احباب اور تلامذہ سب کے سب گجراتی ہیں۔

ولیؔ کا سنہ وفات

ابتک ولیؔ کی تاریخ وفات میں اختلاف تھا، چنانچہ کسی نے ۱۱۴۱ھ بتایا تو کسی نے ۱۱۵۵ھ اور کسی نے ۱۱۵۶ھ یہ تاریخیں بھی ہمارے زمانہ میں قیاساً قائم

---

[۱] محبوب الزمن، جلد اوّل، ص ۴۵۸، [۲] محبوب الزمن جلد دوم، ص ۸۴۶،

[۳] شفیقؔ نے معتبر خاں عمر اور میر حسنؔ نے فخریؔ کے تذکرہ میں ان کو شاگرد ولیؔ بتایا ہے۔ لیکن اوّل الذکر کے زمانہ اور وطن کا حال معلوم نہیں، اور ثانی الذکر کو صرف دکنی لکھا گیا ہے۔

کی گئیں، ورنہ ہمارے تذکرہ نویس تو ولی کی سنہ ولادت و وفات کی نسبت یکسر خاموش ہیں۔ آخرکار ولی کا صحیح سنہ وفات بھی گجرات ہی سے دستیاب ہوا جو گجرات ہی کے ایک عالم نے قطعۂ ذیل کی صورت میں لکھا تھا: ؎

مطلع دیوانِ عشق سیّد اربابِ دل
والیٔ ملکِ سخن صاحبِ عرفاں ولی
سالِ وفاتش خرد از سرِّ الہام گفت
باد پناہِ ولی ساقیٔ کوثر علی

اس تاریخ میں الہام کے الف سے تعمیہ کیا گیا ہے اس کو ملا کر مصرعۂ چہارم سے سنہ وفات ۱۱۱۹، برآمد ہوتی ہے۔ اس قطعہ کے مصنّف محمد احسن مفتی ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ولی کی سنہ وفات پر رسالۂ اردو میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے دیوانِ ولی کے ایک مخطوطہ (موجودہ کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی) سے قطعۂ مندرجۂ بالا نقل کیا ہے[1] لیکن یہ نہیں بتایا کہ مفتی احسن کون تھے۔ ان کا نام محمد احسن ہے نہ کہ حسن مفتی، جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے۔ اور وہ محمد شاہ کے عہد میں احمد آباد کے مفتی تھے جیسا کہ اُن کی مہر سے معلوم ہوتا جو حسبِ ذیل ہے۔

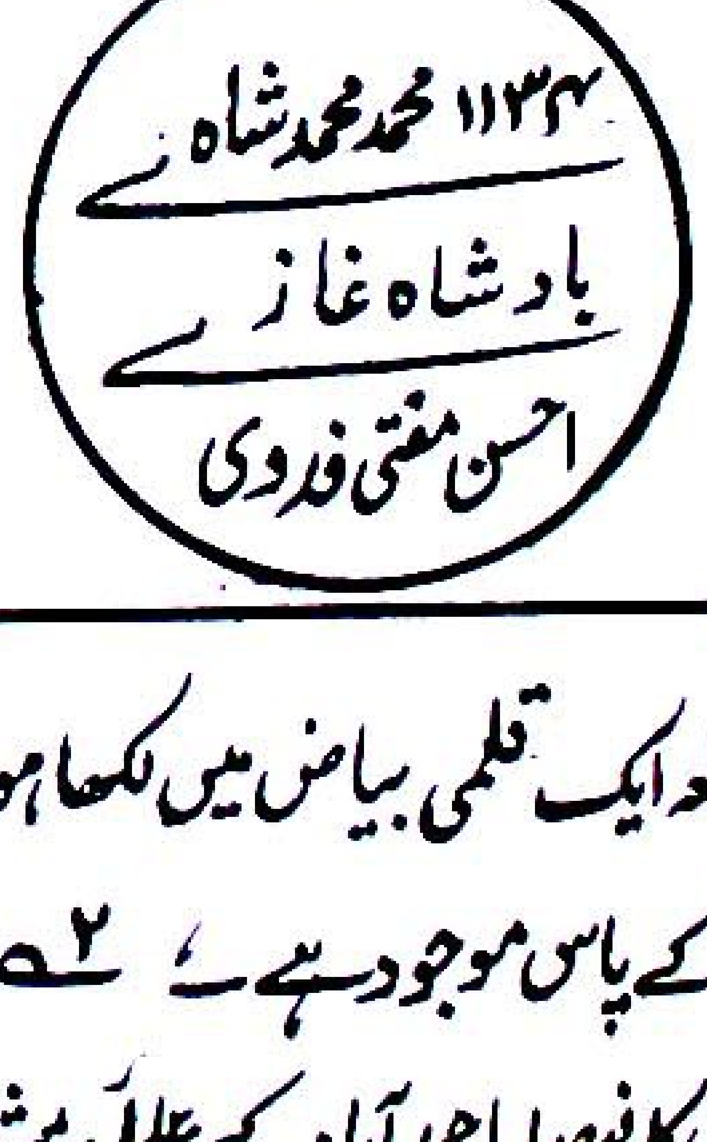

یہ مہر ایک کتاب فخرِ مشہد[2] مطبوعۂ ۱۲۷۱ھ کے اندر درج ہے۔

---

[1] یہی قطعہ ایک قلمی بیاض میں لکھا ہوا ہے جو ہمارے مکرم دوست سیّد منظور حسن صاحب احمد آبادی کے پاس موجود ہے۔ [2] چند مسائل میں علمائے برہان پور کا ۱۱۶۰ھ میں اختلاف ہوا تھا، اس کا فیصلہ احمد آباد کے علماء و مشائخ نے کیا تھا، اسی میں مفتی محمد احسن کی مہر بھی ثبت ہے اور جب یہ کتابی صورت میں چھپا تو مفتی صاحب کی مہر بھی اس میں بعینہٖ چھاپ دی گئی۔

اس تاریخ وفات کے علاوہ چند اور تاریخیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جو حسب ذیل ہیں :-

۱- ولی کے برادر نسبتی شیخ فرید صدیقی کے فرزند شیخ جمیل اللہ المتوفی ۱۱۴۱ھ نے یہ تاریخ نکالی ہے۔ مِنْ اَعْیُنٍ بَدْرٌ خَفِی (ماہِ کامل آنکھوں سے اوجھل ہوگیا) اس سے ۱۱۱۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔

۲- ولی کے حقیقی بھانجے شاہ یحییٰ بن غنی علوی متوفی ۱۱۵۰ھ نے دو تاریخیں نکالی ہیں: ؎

آہ رفت از جہاں ولی اللہ اور او بودہ افضل العلما

یہ تاریخی مادے جن میں سے علی الترتیب ۸۶۷ اور ۱۰۷۶ نکلتے ہیں غالباً پورے اشعار یا قطعات کی شکل میں ہوں گے جن کے اولی مصرعوں میں تعمیہ کیا گیا ہوگا۔ صاحب اعراس نامہ (قلمی) نے ان کو صرف تاریخی مادے سمجھ کر نقل کر دیا ہے۔

ولی کے گجراتی ہونے کے ناقابل تردید شواہد

بیانات مندرجۂ بالا کو سمیٹتے ہوئے، جہاں تک ولی کے وطن کا تعلق ہے ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ گجراتی تھے اور شواہد ذیل ان کے گجراتی ہونے کے ثبوت میں اس قدر قطعی یقینی اور ناقابل تردید ہیں کہ اب اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی :-

۱- حضرت شاہ وجیہ الدینؒ گجراتی کے خاندان سے ہونا۔

۲- احمد آباد میں اپنے خاندانی مدرسہ میں تعلیم و تربیت۔

۳- گجراتی پیر طریقت اور استاد۔

۴- خاندانی بزرگوں کی مدح اور عزیزوں کا ذکر دیوانِ ولی میں۔

۵- گجراتی احباب و تلامذہ۔

۶۔ وطن کی محبت، فراقِ گجرات والا قطعہ اور مثنوی در تعریف سورت۔
۷۔ کلامِ ولی میں بعض گجراتی مقامات اور گجراتی لباس وغیرہ کا ذکر۔
۸۔ گجراتی الفاظ و محاورات کا استعمال دیوانِ ولی میں۔
۹۔ احمد آباد میں وفات اور خاندانی قبرستان میں دفن ہونا۔
۱۰۔ تاریخ وفات کا قطعہ از محمد احسن مفتی احمد آباد جو گجرات ہی سے دستیاب ہوا۔

حیاتِ ولی کے معتبر مآخذ

حالاتِ ولی کے سلسلہ میں اب تک ہمارے پاس صرف تذکروں اور کلامِ ولی کے سوا کوئی اور مآخذ نہ تھا، لیکن حال میں ان کے ذاتی اور خاندانی حالات سے متعلق بعض معتبر مآخذ دستیاب ہوئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سندات و رقعہ جات فارسی جن میں ولی کی مہر اور دستخط ہیں۔

۲۔ نسب نامۂ خاندان حضرت شاہ وجیہ الدین، یہ شجرۂ انساب خاندانی ہے جو اصل اس وقت اس خاندان کے سجادہ نشین حضرت سید بڑا صاحب کے پاس احمد آباد میں موجود ہے۔ اِس میں ولی کا نسب نامہ بھی شامل ہے۔

۳۔ "مصباح العالم المعروف بہ ملفوظات کبیری" (قلمی) ولی کے خاندان کے ایک بزرگ عبدالملک نے اس کو مرتب کیا ہے۔ اس میں ولی کے خاندانی حضرات کے مختصر حالات اور انساب درج ہیں۔ اس کا سنہ تالیف سنہ ۱۰۶۰ھ ہے۔

۴۔ "تذکرۃ الاعراس" یا "اعراس نامہ فارسی" (قلمی) شیخ شرف الدین بن قاضی شیخ محمد نہروالی کا جمع کیا ہوا۔ اس کی نقل عبدالملک[۱] نے کی ہے، اور بارھویں صدی کی ابتدا سے لیکر ۱۱۹۲ھ تک کی تاریخہائے وفات

---

[۱] یہ عبدالملک صاحب مصباح العالم کے علاوہ ایک دوسرے شخص ہیں۔

اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ نویں اور دسویں صدی بیشتر کی تمام تاریخیں خود مؤلف تذکرۃ الاعراس کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس نسخہ کی کتابت عبدالملک نے کی ہے اور خود کو کاتب "اعراس نامہ" لکھا ہے۔ اس میں ولیؔ اور اُن کی اولاد و احفاد و اعزّہ کی تاریخہائے وفات درج ہیں اور ان کے مختصر حالات بھی ملتے ہیں۔

۵۔ "خلاصۃ الوجیہ عربی" (قلمی) مصنّفہ احمد بن محمد فاروقی، سنہ تالیف ۱۰۵۴ھ اس میں حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کی اولاد اور ان کے شاگردوں کا مختصر تذکرہ ہے خصوصاً شاہ صاحب کی ان اولاد و اعزّہ کا جو گجرات سے دکن گئے ہیں۔

۶۔ "نورالمعرفت فارسی" (قلمی) مصنّفہ ولیؔ۔ یہ قاضی نورالدین حسین فائقؔ (مؤلف مخزنِ شعراء) کے نسخہ مکتوبہ ۲۵ ربیع الاوّل ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء کی نقل ہے۔ یہ مشہور رسالہ وہی ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ناپید ہوگیا۔ اس میں مولانا نورالدین احمد آبادی اور ان کے مدرسہ اور مسجد کی تعریف میں عبارت آرائی کی گئی ہے۔ ولیؔ کی فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔

۷۔ "تذکرۃ الوجیہ اردو" (قلمی) سیّد منظور حسن صاحب علوی معروف بہ سیّد حسینی پیر صاحب احمد آبادی، اس کے مؤلف شاہ وجیہ الدینؒ کے خاندان سے اور ولیؔ کے ہم نسب ہیں۔ اس میں حضرت شاہ صاحب کے مفصّل حالات لکھے گئے ہیں اور ان کے خاندان کے بزرگوں کا تذکرہ ہے جس میں ولیؔ بھی شامل ہیں۔

ان مآخذ کے علاوہ متعدد تذکروں اور تاریخوں کی مدد سے نیز کلیاتِ ولیؔ کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ہم نے ولیؔ کے حالات مُرتّب کئے ہیں جو مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہیں۔

۱۔ نسب و خاندان	۲۔ نام و سنہ ولادت
۳۔ تعلیم و تربیت،	۴ علمی قابلیت و تصانیف
۵ سیر و سیاحت،	۶۔ اساتذہ و پیر طریقت
۷۔ احباب و معاصرین۔	۸۔ تلامذہ۔
۹۔ اولاد و اعزہ۔	۱۰۔ وفات اور قبر۔

۱۱۔ شاعری۔

حیاتِ ولی[ل] پر ہمارا مقالہ عنقریب (مصنّف میں) شائع ہوگا۔

وَالامرُ بیدِ اللہِ تعالےٰ۔

ل اس کی تیاری میں ہم کو اپنے محترم دوست جناب سیّد منظور حسن صاحب علوی عرف حسینی پیر صاحب سے بڑی مدد ملی ہے۔ نیز درگاہ حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے صاحب سجّادہ حضرت سیّد بڑا صاحب کے خاندانی قلمی ذخیرہ سے بھی بہت سی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اور ہمیں اعتراف ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی امداد کے بغیر ولی کے صحیح حالات مرتّب کرنا ہمارے لئے ناممکن تھا، چنانچہ ہم اس کو تائیدِ غیبی سمجھتے ہیں۔ ع

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند !!!

ولی گجراتی

(تصحیح و استدراک)

"مصنّف" کے شمارہ نمبر۱۲ میں عنوان بالا کے تحت جو مقالہ شائع ہوا ہے اس میں چند مسامحات کی طرف بعض دوستوں نے توجہ دلائی ہے۔ ان میں سے اکثر تو اصل نقطۂ بحث سے غیر متعلق ہیں اور بعض کا تعلق صرف جزئیات سے ہے۔ اس لئے ہم اس مضمون کے ذریعہ ان کی تصحیح ضروری سمجھتے ہیں اور بعض امور بطور استدراک پیش کرتے ہیں۔

ولی کو دکنی کہنے سے کیا مراد ہے؟ اس عنوان کے ماتحت دکن سے گجرات مراد لینے کے سلسلہ میں ہم نے بعض شواہد پیش کئے ہیں، ان میں سے ایک شہادت میں صدر جہاں گجراتی کو کتاب "طبقاتِ محمود شاہی" کا مصنّف بتایا ہے۔ کتاب مذکور کے ایک مخطوطہ کے آخری صفحہ پر جو پشاور کے ایک خانگی عربی مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود ہے، مندرجہ ذیل عبارت ہے جس کی نقل ایک فاضل دوست کی وساطت سے دستیاب ہوئی ہے۔

"مؤلف این کتاب فیض اللہ بن زین العابدین بن حسام بنبانی المخاطب بملک القضاۃ صدر جہاں کہ چوں در سنہ سبع وتسعمائۃ این مؤلف

در دکن در شہر دار الملک محمد آباد بدار گجرات بحکم فرمان بادشاہ
ہفت محمود شاہ بن محمد شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ ؎؎

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ "طبقات محمود شاہی" کا مصنف صدر جہاں نہیں ہے، بلکہ ان کا پوتا فیض اللہ بنیانی ہے جو کتاب "مجمع النوادر" کا بھی مصنف ہے۔ محمود کے نام کے ساتھ "خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ" سے قیاس ہوتا ہے کہ خود محمود کے عہد میں اس کی کتابت ہوئی ہو گی اور یہ عبارت بھی غالباً کاتب مخطوطہ کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ عبارت گو کیسی ہی "بے ربط" ہو تاہم اس میں "در دکن در شہر محمد آباد" سے پتہ چلتا ہے کہ دکن کا اطلاق گجرات پر ہوتا تھا۔

(۲) "حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے ایک پوتے کے شاگرد نے
ملا جامی کی شرح لکھی ہے۔"

اس کی تشریح کر دینی بھی ضروری ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے نحو میں ملا جامی کی شرح کافیہ بہت مشہور ہے، اس پر ایک کتاب جس کا نام "جامع الغموض" ہے ملا عبد النبی احمد نگری نے لکھی ہے۔ یہ شائع ہو چکی ہے اور اس کے آخر میں مصنف نے مندرجہ ذیل اشعار میں اپنے وطن کا ذکر کیا ہے: ؎ نامش احمد نگر بیاں دکن

اور ؎ وطن ایں غریب گجرات است۔

یہ عبد النبی احمد نگری وہی ہیں۔ جو "دستور العلماء" کے مصنف ہیں خود انہوں نے اپنی اس کتاب (جلد چہارم ضمیمہ ص ۱۳) میں اپنا آبائی وطن کپڑ بنج (گجرات) اور وہاں سے ان کے والد کا احمد نگر دکن میں جا کر قیام کرنا بیان کیا ہے۔ نیز اپنے والد کا حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے پوتے حضرت شاہ عبد الماجد سے عقیدت و ارادت اور ان کے بیٹے حضرت شاہ نصیر الدین سے تلمذ کا ذکر کیا ہے، لہذا یہاں احمد نگر سے "ہمت نگر"

(ایڈر کے پاس) جو مُرادی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور نہ ہمارے مفید مطلب،
(۱۵) شیخ کمال مالوی کی زبانی "سلاطین دکن" کی جو عبارت 'مرآۃ احمدی'
کے حوالہ سے پیش کی گئی ہے، وہ مرآۃ سکندری' میں بھی موجود ہے اور
غالباً وہیں سے منقول ہے اور وہاں 'سلاطین' دکن کی بجائے
"سلاطین ٹانک" لکھا ہوا ہے۔ اس روایت کی افسانوی حیثیت
یااس کی جزئیات پر روایتی حیثیت سے بحث کرنا ہمارے موضوع
سے خارج ہے ممکن ہے کہ 'مرآۃ سکندری' کے کسی قلمی نسخہ میں
ایسا ہی ہو، ہم نے جو عبارت نقل کی ہے وہ اس مطبوعہ نسخہ کی ہے
جس کو پروفیسر سیّد نواب علی صاحب نے خود مصنّف کے تیار
کرائے ہوئے نسخہ پر سے ایڈٹ کیا ہے[۱]۔ بمبئی کے اڈیشن میں بھی
"سلاطین ٹانک" چھپا ہے۔

وَلی کے اساتذہ اور پیرِ طریقت

اس عنوان کے ماتحت حضرت شاہ علی رضاؒ کے ایماء سے
"نورالمعرفت" کی تصنیف کا ذکر کیا گیا ہے اور حاشیہ میں "پیر
روشن ضمیر" کے ساتھ "یعنی حضرت شاہ علی رضاؒ" کا اضافہ کیا ہے۔
اگرچہ وَلی نے پیر روشن ضمیر کے ساتھ یہ نام نہیں لکھا، لیکن حضرت
شاہ علی رضا سے وَلی کی بیعت کی شہادت نیز بعض قرائن کی موجودگی میں
ہم نے نام کی تصریح کر دی ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ یہاں پیر
روشن ضمیر سے مراد خود مولانا نورالدین ہیں اور کہ سبب تالیف رسالہ
میں خود مولانا کی زبانی اس رسالہ کو لکھنے کی تحریک کا خیال پیش کیا ہے،
جو بقول ان کے ایک قصیدہ کی شاعرانہ تمہید معلوم ہوتی ہے۔ رسالہ مذکور

---

[۱] دیکھو مراۃ احمدی مطبوعہ گائیکواڑ سیریز جلد اوّل کا انگریزی دیباچہ۔

کے سبب تالیف کی اصل عبارت یہ ہے :

"ناگاہ پیر روشن ضمیر ... از در در آ ... واز روئے التفات بزبان فصیح و بیان ملیح آغاز نمود کہ ... علم عطارد رقم را بروشن بیانی آشنا سازی ..... وبدانکہ سزاوار مدح دریں شہر فیض کہ مسمیٰ باحمد آباد است شخصے است .... چوں از نام نامیش سوال کردم بایضاح ازیں معنی پرداخت ...... و ایں بیت برجستہ را بآواز بلند برخواند ؎

زنورش حال دل چوں گل عیانست
زنامش نور دیں پرتو فشانست " (انتہی الخصاً)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پیر روشن ضمیر سے مراد مولانا نورالدین نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہے، خواہ ان کو حضرت علی رضا فرض کرلیا جائے یا "پیر روشن ضمیر عقل" جیسا کہ اکثر شعرا قصائد میں اس قسم کی خیالی تمہید قائم کر کے مدح کی طرف گریز کیا کرتے ہیں۔ بالفرض اگر یہاں "پیر روشن ضمیر" سے مولانا نورالدین ہی مراد ہوں، پھر بھی یہ تو کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ولی کو ان سے بیعت وارادت تھی۔ "ایک شخص کسی پیر کا مرید ہوئے بغیر بھی اس کی تعریف کرسکتا ہے۔" پھر ولی کا سلسلۂ قادریہ شطاریہ میں بیعت ہونا دکنی و گجراتی دونوں کے نزدیک مسلّم ہے [1] حالانکہ مولانا نورالدین سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگ تھے۔

---

[1] "محبوب الزمن" جلد دوم ص۱۱۲۸ "علوی خاندان میں خانقاہ کے سجادہ نشین سے طریقہ قادریہ شطاریہ میں بیعت کی۔" ولی کی پیر شاہ علی رضاؒ کا سلسلۂ قادریہ میں حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی برہانپوری (المتوفی ۱۰۸۳ھ) سے بیعت ہونا پایا جاتا ہے۔ (دیکھو آئینہ تصوف، از مولانا محمد حسن صابری چشتی)

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ مخزنِ شعرا کے مصنف کو بھی غالباً رسالہ "نورالمعرفت" مولانا نورالدین کی مدح میں تصنیف کرنے سے یہ خیال ہو گیا تھا کہ وؔلی کو ان سے بیعت تھی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"وازرسالہ "نورالمعرفت" کہ تصنیف اوست مستفاد می شود
کہ از شاگردانِ شاہ گلشن و مرید جناب معارف آگاہ مخدوم العالم
مولانا محمد نورالدین صدیقی السہروردی است" [۱]

گجراتی الفاظ

وؔلی کے کلام سے ہم نے جن الفاظ کی فہرست پیش کی ہے اُن میں کے بعض الفاظ دکنی مصنّفین کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ لفظ "بھار" کے متعلق وؔلی کا جو شعر نقل ہوا ہے وہ صرف وزن کے معنوں میں ہے، لیکن اس کے علاوہ لفظ "بھار" باہر کے معنی میں بھی وؔلی نے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح لفظ "نال آنول" کے علاوہ پنجابی معنوں "پاس" کے لئے بھی وؔلی نے ایک شعر میں باندھا ہے اور اس لحاظ سے فرہنگ میں اس کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں وہ صحیح ہیں، نیز لفظ "وسواس" کو وؔلی نے عربی معنوں (وسوسہ) میں لیا ہے۔ اس لئے اس کی توجیہ گجراتی لفظ "وسواس" سے غلط ہے۔ با ایں ہمہ ہماری فہرست الفاظ میں اکثر الفاظ ایسے ہیں جو ٹھیٹھ گجراتی اُردو کے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دکنی زبان میں سیکڑوں الفاظ گوجری اُردو کے اس قدر رل مل گئے ہیں کہ ایسے الفاظ دکنی مصنّفین کے ہاں مستعمل ہونے سے ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ گجرات کے مسلمانوں کی زبان میں گجراتی عنصر نسبتاً زیادہ ہے جو ان کی زبان کو دوسرے صوبوں کی بولیوں سے ایک

---

[۱] مخزنِ شعرا، صلا۔ فائق کی یہ عبارت مخطوطہ کتاب کے اصل متن میں نہیں، بلکہ حاشیہ پر لکھی ہوئی ہے۔

حد تک ممتاز کرتا ہے۔ مغربی ہندی کی طرح خود گجراتی زبان نے، جو ہندی کے علاوہ زیادہ تر "اپ بھرنش" الفاظ سے بنی ہے۔ گوجری اردو پر بڑا اثر ڈالا ہے جس نے گجرات میں اپنی مستقل حیثیت قائم کر لی تھی، مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں :-

" ہندی عام ہے یعنی وہ زبان جو ہر جگہ مستعمل تھی، ہندی ہی کے نام سے موسوم تھی، گجری گجراتی خاص ہے۔ یعنی وہ زبان جو گجرات اور اس کے قرب وجوار کے علاقہ میں بولی جاتی تھی اور جس میں کچھ مقامی الفاظ بھی داخل ہو گئے تھے"! [۱]

سوائے اُن الفاظ کے جو عام طور پر مرہٹی اور گجراتی میں مشترک ہیں، یا پھر ٹھیٹھ قدیم یا مغربی ہندی کے الفاظ کے، قدیم دکنی زبان کا ذخیرۂ الفاظ بہت محدود تھا جس کو گجراتیوں نے اپنی کثرت آمد و رفت دکن سے مالا مال کیا ہے۔ دکنی زبان پر گجراتی زبان کے اثرات اتنے پڑے ہیں کہ خود دکنی مصنّفین اپنی زبان کو گوجری کہتے تھے [۲] گجراتی اُردو یا گوجری میں

---

[۱] اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص۶۷ ، [۲] چنانچہ محمد امین نے اپنی مثنوی، "یوسف و زلیخا"، عہدِ عالمگیر (۱۱۰۹ھ) میں نظم کی ہے اور دکنی میں لکھنے کے باوجود وہ اس کو گوجری کہتا ہے :-

سنو مطلب ہے اب یو امین کا ... لکھی گوجری منے یوسف زلیخا
ہریک جا لگے ہے قصہ فارسی میں ... امین اس کو اتاری گوجری میں
کہ بوجھے ہر کدام اس کی حقیقت ... بڑی ہے گوجری جگ بیچ نعمت

(پنجاب میں اُردو)

اسی طرح شیخ برہان الدین جانم المتوفی ۹۹۰ھ جو اولیا بیجاپور (دکن) سے تھے اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں مثلاً "حجۃ البقا" میں لکھتے ہیں :- جے ہوویں گیان بچاری ... نہ دیکھیں بھاکا گجری!

کتاب ارشاد نامہ میں کہا ہے :- یہ سب گجری کیا زبان ... کہ یہ آئینہ دو نما

نثر کے رسالہ "کلمۃ الحقائق" میں لکھا ہے "سب یو زبان گجری، نام این کلمۃ الحقائق"،

(دیکھو رسالہ اردو ص۴۲ ۵، ۲۷ اور نیشنل کالج میگزین ص۶ و ص۸، جلد ۲، حصہ ۲۷

ایسے خاص الفاظ و محاورات پائے جاتے ہیں جو اس کو دکنی سے ممتاز کرتے ہیں، بااین ہمہ اگر دکنی مصنّفین نے گجراتیوں سے لیکر ان کو استعمال کیا ہو تو اس سے ان کی گجراتی اصلیّت مٹ نہیں سکتی۔ بہر حال ولی کے کلام میں گجراتی الفاظ کا وجود ثابت کرنے سے ہمارا مقصد ولی کے گجراتی ہونے کی ایک مزید اندرونی شہادت مہیا کرنا ہے چنانچہ اس فہرست میں ہم مندرجہ ذیل الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں:۔

ص۱ (ضمیمہ اوّل) رُوسنا۔ بمعنی روٹھنا۔ ولی ع

ہمن سے رُوس رہے بے سبب سو کیا معنی؟

فرہنگ میں یہ لفظ نہیں دیا گیا "اردو شہپارے" کی فرہنگ میں لفظ رُوس کے معنی غیرت لکھے ہیں۔

ص۱۶ (ضمیمہ) اُپراپینچ۔ پگڑی یا صافہ کے اوپر کی آخری بندش۔ ولی ؎

پینچ اپنے چیرہ کا چلے کوں جو اُپرا دیا
عاشقاں کوں مارنے کھینچا ہے جیوں خنجر سفید

فرہنگ میں اس کا ذکر نہیں ہے "گنبدی دستار" والے اس "خنجر نما اُپرے پینچ" کو کیا جانیں؟

ص۱۶ (ضمیمہ) جھرنا۔ گرنا۔ ٹپکنا۔ ولی ع

اشک جو پڑتے ہیں نت مجھ چشم سے جھر جھر سفید۔

فرہنگ میں یہ لفظ نہیں دیا گیا۔

ص۴۹ (ضمیمہ) گھر گھالے۔ کئی گھر لوٹے یا ویران کئے۔ ولی ع

گوشۂ چشم ستی دیکھ بہت گھر گھالے۔

ص ۲۲۰/۲۹۹ بقّال پُرفن۔ عیار بنئے کا لونڈا۔ گجرات میں بنیوں کو بقال کہتے ہیں جو عام طور سے تجارت پیشہ ہیں۔ ولی ؎

غزبی سوں نہ سمجھو سادہ دل بقال پُر فن کو
کہ جو کھا اُن نے عاشق کوں بھواں کی ہاتھ لے تکڑی

ص ۲۵۵ / ۳۵ کُلاہِ بارانی ۔ چھجے دار برساتی ٹوپی جو چٹائی سے بنی ہوئی ہوتی ہے اور عموماً اس کو معمولی درجہ کے پرتگیزی عیسائی پہنتے ہیں۔ پرتگیزوں کا قیام گجرات میں بہت رہا ہے۔ ولی ؎

دیکھ اس کی کُلاہِ بارانی
چاند پر آج ابر آیا ہے

ص ۴۹۶ / ۴۴ رام رامی ۔ علیک سلیک ۔ گجرات میں ہندو بجائے سلام کے "رام رام" کہتے ہیں، ولی ؎

تب کا مشتاق جی ہے لچھمن سوں
کشن سوں جب کہ رام رامی ہے

فرہنگ کلیات میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

ص ۲۹۹ / ۴۰۸ گول دستار ۔ یہ وہی "چکری پگڑی" ہے جو گجرات میں عموماً سادات اور مشائخ باندھتے ہیں۔ ایک متاخر گجراتی شاعر کہتا ہے : ؎

بولا کمہار شیخ کی دستار دیکھ کر
سمجھا وہ سر پہ رکھ کے میرا چاک لے چلے!

ولی ؎ شیخ مت گھر سوں نکل آج کہ خوباں کے حضور
گول دستار تیری باعثِ رسوائی ہے

ص ۲۹۹ / ۴۰۸ مناہی ۔ ممانعت ۔ عربی لفظ گجرات میں ممانعت کے معنوں میں مستعمل ہے ۔ ولی ؎

نوخطاں کی طرف نہ جا زاہد زہد و تقویٰ کی واں مناہی ہے

سنہ وفاتِ ولی

انجمن ترقی اردو کے مستعد اور سرگرم ناظم مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی ادارت میں شائع

ہونے والے سہ ماہی رسالہ اُردو بابت جنوری ۱۹۳۴ء میں ولی کی سنہ وفات پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے دیوان ولی کے ایک مخطوطہ مکتوبہ ۱۱۵۲ھ موجودہ کتب خانہ جامع مسجد بمبئی (۱۱۳۵ع) کے حوالہ سے ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ سب سے پہلے ولی کی صحیح تاریخ وفات کو شائع کرانے والے مولوی صاحب موصوف ہی ہیں۔ لیکن یہ تاریخ قائل قطعۂ مذکور کے نام کے ساتھ ایک قلمی بیاض[۱] سے جو محترم دوست سیّد حسینی پیر صاحب احمد آبادی کے پاس موجود ہے۔ اس قطعہ کے لکھنے والے "احسن مفتی" کے نام کا مولوی صاحب کو پہلی مرتبہ علم ہوا تھا، اس لیے کہ جامع مسجد والے مخطوطہ کے آخر میں صرف قطعہ درج ہے، قائل کا نام نہیں دیا گیا اور ایک مصرع بھی اس طرح غلط لکھا ہے۔ ع

والی ملک شہنشاہ صاحب عرفاں ولی

اس کے باوجود مولانائے موصوف نے نہ تو حسینی پیر صاحب کا ذکر کیا نہ ان کی بیاض کا نام دیا۔ جو علمی تحقیق کے اصول کے مطابق نہایت ضروری تھا۔ صرف اتنا لکھ دیا کہ "احمد آباد کی ایک خاندانی بیاض سے اس کی تصدیق ہوتی ہے"۔

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مفتی احسن محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۳۶ھ میں مسندِ افتاء پر سرفراز ہوئے جیسا کہ ان کی مہر میں لکھی ہوئی سنہ سے

---

[۱] یہ بیاض شاہ سراج کے پوتے حضرت سیّد بڑا صاحب (ابن شاہ حامد بن علاؤالدین) المتوفی ۱۲۲۶ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ رسالہ "شہاب" (جوناگڑھ) میں جو میری ادارت میں نکلتا تھا، اس کے اپریل ۱۹۳۴ء کے نمبر میں حسینی پیر صاحب کا جو مضمون ولی گجراتی پر شائع ہوا تھا اس میں انہوں نے اسی بیاض سے یہ قطعہ مع نام مصنف درج کر دیا ہے۔

ثابت ہوتا ہے اور ۱۱۶۰ھ تک کے لکھے ہوئے دستاویزوں پر ان کی مہر ثبت ہے اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مفتی صاحب نے یہ قطعہ دفات ولی کے تقریباً ستّرہ۱۷ سال کے بعد موزوں کیا ہوگا، جبکہ وہ بعہد محمد شاہ مفتی تھے، لیکن اس بات کا امکان قوی ہے کہ مفتی صاحب نے تو یہ قطعہ ولی کی وفات کے فوراً بعد ہی کہا ہوگا، مگر وہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۳۶ھ کے بعد نقل کیا گیا ہوگا، اُس وقت کاتب نے ان کے نام کے ساتھ مفتی کا لقب بڑھا دیا ہوگا۔

ولی کا نام

ہم نے اپنے مضمون میں ولی کا نام شاہ ولی اللہ العلوی بتایا ہے۔ بعض اصحاب کے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ مخطوطۂ دیوان ولی مکتوبہ (۱۱۳۸ھ) ثناء اللہ فانی اور محمد تقی بن سیّد المعالی کے نسخہ مکتوبہ ۱۱۵۶ھ میں ولی کا نام "ولی محمد" لکھا ہے مخطوطات میں عموماً ناموں کا اختلاف ہوتا ہے اور ہمارے خیال میں کسی مزید شہادت سے اس کی تصدیق و توثیق ہوئے بغیر اس سے کلّی استناد صحیح نہیں ہے۔ قدیم ترین تذکروں میں بھی جن میں سے بعض ۱۱۶۵ھ تک کے قدیم ہیں، ولی کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حمید "ولی محمد" لکھتا ہے۔ اور گردیزی اور شفیق "محمد ولی" میر حسن "شاہ ولی" اور قائم شورش، ذکا اور نساخ، "شاہ ولی اللہ" اور آزاد اور صغیر بلگرامی "شمس ولی اللہ" لکھتے ہیں۔ تقریباً سب ہی مستشرقین نے ان کا نام "شاہ ولی اللہ" لکھا ہے۔ نام کا یہ اختلاف بعض مخطوطات دیوان میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً دتاسی کے مخطوطہ (M.O.E. کٹلاگ نمبر ۲۸۲۱) میں جہاں ان کا نام "شاہ ولی اللہ" لکھا ہے۔ [۱] اس لئے یہ کہدینا کہ ان کا نام صرف "ولی محمد"

---

[۱] دیکھو "یادگار ولی"

ہی صحیح ہے اور" ولی اللہ" غلط، کسی طرح مفید مطلب نہیں ہو سکتا، عموماً ہمارے ہاں ناموں کے اجزا کو مقدم مؤخر کر دینے کا رواج ہے اور بسا اوقات کسی شخص کے قریبی اعزہ اور دوست احباب بھی اس کے مشہور نام کے سوا اس کے صحیح نام سے اُسے کم پہچانتے ہیں۔ پھر عموماً مسلمانوں میں مُفرد ناموں کے آگے یا پیچھے برکت و سعادت کے لئے " محمد" (صلے اللہ علیہ وسلم) کا نام اضافہ کیا جاتا ہے، اس بنا پر کسی نے ان کو " محمد ولی" کہا اور کسی نے " ولی محمد" لیکن ان کا اصلی نام جیسا کہ بعض متقدمین تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے اور ان کے نسب نامہ میں موجود ہے۔ " شاہ ولی اللہ" ہی تھا۔

احمد آباد کی بعض خاندانی بیاضوں میں بھی نام کا یہ اختلاف موجود ہے چنانچہ مولوی سید احمد بن سید عابد علوی کی بیاض میں " شاہ ولی اللہ" اور ملفوظات کبیری میں " میاں عو لی اللہ" لکھا ہے۔ خود ولیؔ کی مُہر میں " محمد ولی اللہ" ہے، حالانکہ یہ تینوں نام ایک ہی شخص کے ہیں۔ ولیؔ کے نام کے اختلاف اور اُس سے مراد شاہ ولی اللہ العلوی ہونے پر ہم نے حیات ولیؔ میں مفصّل بحث کی ہے جو ابھی زیر ترتیب ہے اور انشاء اللہ کچھ عرصہ کے بعد شائع ہو گی۔

ولیؔ کے احباب اور تلامذہ

(۱) شاہ سراج:
ولیؔ نے اشعار ذیل میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے: ؎

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں
فانوس دل میں شوق ترا ہے سراج آج
وہ شوخ مجھ سے آ کے ملیا اس سبب ولیؔ
شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں لاج آج

ہم نے اپنے مضمون میں سراج کو، شاہ سراج احمد آبادی بتایا ہے جو ولیؔ کے ہم نسب اعزہ میں سے تھے اور جنہوں نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی ہے۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ سراج اورنگ آبادی ۱۱۲۷ھ میں وفات ولی کے آٹھ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ دکنی اہل قلم نے سراج سے، شاہ سراج اورنگ آبادی مُراد لی ہے۔

چنانچہ کلیات سراج، کے مرتب پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:۔

"ولیؔ کی ایک مسلسل غزل سے ان کے کسی دوست سراج کی شادی کا پتہ چلتا ہے اور جیسا کہ بعض محققین اس طرف راغب معلوم ہوتے ہیں، شاید یہ سراج، شاہ سراج ہی ہوں گے۔ اس طرح قیاس کی گنجائش بھی ہے، کیونکہ اگر ولیؔ کا انتقال ۱۱۵۵ھ میں ہوا تو اُس وقت سراج کی عمر ۱۸ سال کی ہوگی۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"لیکن یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ولیؔ کے دوست یہی سراج تھے۔" [1]

بعض دقیقہ سنج اور نکتہ رس اصحاب کا خیال ہے کہ یہاں لفظ "سراج" چراغ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، نیز یہ کہ "شادی" کے معنی صرف خوشی کے ہیں۔ اگر یہی معنی صحیح ہوں تو پھر ان "سراجین" میں سے کسی ایک کی شادی کا قصہ "براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو" کا مصداق ٹھہرتا ہے، لیکن یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ کہیں اس سے ان اشعار کا مطلب تو خبط نہیں ہو جاتا؟ "سراج" کی رعایتِ لفظی سے

---

[1] "مقدمہ کلیاتِ سراج"، صفحہ ۵۹، سنہ ۱۹۴۰ء۔

انکار نہیں، لیکن "فانوس دل میں شوق کا سراج" بن جانا کچھ بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے، ورنہ سراج کو ماننے کی صورت میں مطلب صاف ہو جاتا ہے کہ سراج کا شوق شاعر کے فانوس دل میں اس قدر روشن ہو گیا کہ چاند بھی اس پر پروانہ وار گرنے لگا۔ لفظ "شادی" سے مسرت ہی لیجئے تو کوئی مضائقہ نہیں، زیادہ سے زیادہ شاہ صاحب کی شادی کی تقریب پر اس غزل کا لکھنا نہ ثابت ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ غزل مسلسل ہے جس میں ولی نے حسب عادت اپنے دوست شاہ سراج کو "سجن" اور "شوخ" سے مخاطب کیا ہے۔ پھر یہاں اس بات کا پورا قرینہ موجود ہے کہ شاہ سراج کا ذکر ولی نے اپنے دوسرے اعزہ کے ناموں کی طرح کیا ہے، مثلاً شاہ کامل اور اکمل کی نسبت ولی کا یہ شعر ؎

ولی اس ماہ کامل کی حقیقت جو نہیں سمجھا
وہ ہرگز نیں بُجھا عالم میں اکمل کے معانی کوں

یہ دونوں بھائی ولی کے ہم نسب اور قریبی رشتہ دار تھے یہاں "ماہِ کامل" شاہ اکمل کی صفت کے طور پر آیا ہے اور اس میں شاہ کامل کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اسی طرح شعر مذکور میں بھی شاہ سراج کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور یہ کچھ بعید از قیاس بھی نہیں۔

(۲) اسی طرح محمد یار خاں کی نسبت اس شعر سے: ؎

حسن کی دِلّی کا صوبہ ہے محمد یار خاں الخ

محمد یار خاں ناظم دہلی اور ولی کے ساتھ ان کے تعلقات کے قیاس کی تردید کرتے ہوئے یہ مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہاں محمد یار خاں مراد نہیں ہے۔ بلکہ ولی نے اپنے محبوب کو تشبیہاً دیارِ حسن کا صوبہ[۱]

---

[۱] لفظ صوبہ عموماً گجرات میں صوبہ دار کی بجائے آج بھی مستعمل ہے۔ چنانچہ ریاست بڑودہ (گائیکواڑ) میں "صوبہ" اور "سرصوبہ" کے عہدے اب بھی قائم ہیں۔

کہا ہے۔ لیکن ہم نے "مآثر الامرا" کے حوالہ سے محمد یار خاں کا صوبہ دار ناظم دہلی ہونا بیان کیا ہے، نیز ان کے سخن گو اور سخن شناس ہوتے اور ان کی ادبی صحبتوں سے بعض دکنی شعراء کے مستفید ہونے کا تذکرہ قائم کے حوالہ سے کیا ہے اور اس غزل کے بعد تو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ ولی کے ان سے دوستانہ مراسم تھے۔ ولی نے اپنے جن احباب کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تعریف اس طرح کی ہے جس طرح عموماً شعرا اپنے معشوقوں کی تعریف کیا کرتے ہیں، چنانچہ اس غزل میں بھی محمد یار خاں کی تعریف اسی انداز سے کی گئی ہے۔

(۳) محمد مراد کے قیام گجرات اور ولی سے ان کے تعلقات کے امکان پر ہم نے "مآثر الامراء" کے حوالہ سے روشنی ڈالی ہے۔ لیکن بعض اصحاب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بحیثیت صوبہ داران کا تبادلہ اورنگ آباد ہو گیا تھا۔ صاحب مآثر کا یہ بیان بھی ضرور ان کی نظر سے گزرا ہے کہ یہ تبادلہ بعض وجوہ سے موقوف ہو گیا تھا اور آخر عمر میں، یعنی ۱۱۲۱ھ میں (ولی کی وفات کے د۲و سال بعد) وہ نائب صوبہ دار کی حیثیت سے وہاں گئے اور اسی سال انتقال کر گئے۔

(۴)۔ ہم نے اشرف نامی شاعر کو شاگردِ ولی بتاتے ہوئے اس کے بعض اشعار رسالہ "اردو" (جولائی ۱۹۳۵ء) کے حوالہ سے اپنے مضمون زیرِ بحث کے حواشی میں نقل کئے ہیں۔ اشرف کے دیوان پر تبصرہ کرتے ہوئے رسالۂ "اردو" کا ایک مضمون نگار لکھتا ہے :-

"شفیق نے اشرف کو معاصر ولی لکھا ہے، لیکن حمید اورنگ آبادی نے اس کو "بلا واسطہ شاگردِ ولی" لکھا ہے۔ حمید کا مدعا غالباً یہ ہے کہ اشرف باضابطہ شاگردِ ولی تو نہ تھا[1]، لیکن اس کے

---

[1] "بلا واسطہ" کے معنی تو براہ راست کے ہیں یعنی بغیر کسی واسطہ کے۔ شاید "واسطہ" کو اردو معنوں میں لیا گیا ہے؟

کلام سے فیض اٹھایا ہے۔ شاید ایسا ہو لیکن اب تک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرفؔ یا ولیؔ کے کلام سے ان کے استاد شاگرد ہونے کا ثبوت ملتا ہے، بہرحال معاصرت مسلم ہے۔" ؎۱

اشرفؔ کے دیوان کا ایک قدیم مخطوطہ ہمارے سامنے ہے (جو ہمارے محترم دوست پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی ملکیت ہے) اس میں اشعارِ ذیل دیکھ کر تو یہی قیاس ہوتا ہے کہ اشرفؔ کو ولیؔ سے نسبت تلمذ تھی ؎ (اشرفؔ)

ہے جب سوں شعر تیرا شعر ولیؔ سے ہم رنگ
اشرفؔ ترے سخن کی نت آرزو ہے دل میں

ولیؔ کے طور پر مجھ سا نہیں کوئی ریختہ بولیا
سخن ہے پتذل جگمیں زبانِ اصفہانی کا

شعر کہنے میں ہے اشرفؔ کوں ولیؔ کا مرتبہ
اس سبب شاعراں ہیں صدق سوں اسکے مُرید

اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح اقرار ولیؔ کی شاگردی کا اشعارِ ذیل میں پایا جاتا ہے ؎ (اشرفؔ)

مجکوں ہے ارشاد اے اشرفؔ ولیؔ سوں یو سخن
"ترک کرنا عشق کا دشوار ہے دشوار ہے"
ولیؔ نے یو غزل اشرف کرم سوں مجکو بخشی ہے
سو اپنے نام سوں اسکوں کیا جاری نکو پوچھو

؎۱ رسالۂ اُردو بابت جولائی ۱۹۳۵ء، ص ۵۸۵۔

اس آخری شعر سے تو یہ بھی ... ہوتا ہے کہ ولی اپنی غزلیں اشرف کو لکھ لکھ کر دیا کرتے تھے اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر دیوانِ اشرف میں اُسی کے تخلص سے ولی کی درجن بھر غزلیں درج ہوئی ہیں۔

رسالہ "اردو" کے مضمون نگار کو اشرف کے گجراتی ہونے کی بھی کوئی سند یا شہادت نہیں ملی، سوائے اس کے کہ "اس نے اپنے کلام میں گجرات کے بزرگ شاہ عالم کا ذکر کیا ہے اور ان سے عقیدت ظاہر کی ہے"، پھر آگے چل کر لکھا ہے:۔

"یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح ولی نے اپنے آپ کو "شاعر ملکِ دکن" لکھا ہے، اس طرح اشرف نے گجرات کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اپنے شعر کی داد شاعرانِ دکن سے طلب کی ہے، حمید کے تذکرے میں اس کی غزل ہے جس کا مقطع ہے:۔

یہ شعر سُن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف

تمام شاعرِ ملکِ دکن سخن کی قسم"

حمید نے اشرف کو گجراتی لکھا ہے اور ولی کا شاگرد بتایا ہے۔ اس کی تصدیق خود اس کے دیوان سے بھی ہوتی ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں!۔

(۱) اپنے کسی معتقد الیہ حبیب اللہ گجراتی کی نسبت لکھا ہے:

ملک گجرات میں حبیب اللہ

تیری فرقت نے ہم کوں مارا ہے

ممکن ہے یہ شاہ حبیب اللہ برادر ولی ہوں۔

(۲) "زین البلادِ ہند" یعنی احمد آباد کی تعریف:

رشک ایراں رونق زین البلادِ ہند ہے

یعنی احمد آباد کی رونق ایران کے لئے بھی باعث رشک ہے ۔۔

"زین البلاد" شہر احمد آباد کا لقب ہے جو غالباً اورنگ زیب

نے اس کو دیا تھا۔

(۳) گجراتی محاورے اور الفاظ اشرفؔ کے کلام میں بہت ہیں، مثلاً

ے لے گیا تان دل کوں اشرفؔ کے
بولتا جب وہ تان نکلا ہے

گجرات میں کھینچنے کو "تاننا" بولتے ہیں ے

اس مصرع رضیؔ سوں ہے اشرفؔ مجھے لگن
جیوں عشق پیچہ عشق میں وَل وَل گیا ہوں

وَلنا گجرات کا خاص لفظ ہے جو شاید ہی کہیں اور جگہ بولا جاتا ہو۔ اشرفؔ نے یہ مصرعہ رضیؔ کا نقل کیا ہے اور اس سے خود رضیؔ کا بھی گجرات سے تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ جس کی نسبت حمیدؔ نے صاف طور پر "متوطن احمد آباد لکھا ہے ے

ہے اشرفؔ کوں ہر فن میں اپنا کمال
کہ جیوں کوئی اچھے کامل ایک فن

ہم نے "حیاتِ ولی" میں اشرفؔ کے گجراتی ہونے کی ایک دستاویزی شہادت پیش کی ہے جس سے اشرفؔ کے شاعر گجرات ہونے کا مسئلہ بالکل حل ہو جاتا ہے۔

ولی گجراتی

(استدراکات)

"معنّف" کے گذشتہ شمارہ میں ہم نے اپنے پچھلے مضمون کے چند مسامحات کی تصحیح کے ساتھ بعض استدراکات بھی پیش کئے ہیں۔ اسی سلسلے میں ہم چند مزید امور کا اضافہ کرتے ہیں۔ جن سے ولی کے گجراتی ہونے پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

ایک دکنی شہادت

مولوی باقر آگاہ دکن کے ایک محقق عالم تھے جو نہ صرف مختلف علوم وفنون اور عربی، فارسی اور ہندی کے متبحر عالم تھے، بلکہ اُردو زبان وادب کے بڑے ماہر اور اپنے زمانہ کے بہترین مصنف اور شاعر تھے، چنانچہ مختلف موضوعات پر ان کی متعدد تصانیف موجود ہیں، ولی کی وفات سے تقریباً ۳۵ برس کے بعد مولوی باقر آگاہ ویلور میں ۱۱۵۵ھ میں پیدا ہوئے، ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی اور مدراس میں مدفون ہوئے، تقریباً سترہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اُن کے متعلق مؤلف "تذکرہ اُردو مخطوطات" لکھتے ہیں:۔

> "آگاہ اُردو کے بڑے محسنوں میں سے ہیں، نثر اور نظم دونوں پر قابو تھا، غزل، قصیدہ، مثنوی، ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی، واقعہ یہ ہے کہ دکنی علم وفضل اور شعر وسخن ان پر ختم

ہو گیا۔ ان کے بعد جنوبی ہند میں اتنا بڑا ادیب اور شاعر پیدا نہ ہو سکا۔ وہ میر اور سودا کے ہمعصر تھے، لیکن زبان قدیم استعمال کی ہے اس لئے شمالی ہند میں شہرت نہیں حاصل ہوئی"۔[۱]

اپنے قصّۂ رضوان شاہ و رُوح افزا معروف بہ "مثنوی گلزارِ عشق" کی تمہید میں آگاہ نے اُردو زبان کی تدریجی ترقی پر بحث کرتے ہوئے ولی کو گجراتی لکھا ہے۔ یہاں ان کی تمہید متعلقہ حصّہ نقل کیا جاتا ہے:-

"مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان بمعنی (بے معنی)[۲] دہرزہ دراہان (درایان) لایعنی دکنی پر اعتراض اور گلشن عشق و علی نامہ پڑھنے کے اعتراض (احتراز) کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب لک (تک) ریاست سلاطین دکن کے دکی) قائم تھے (تھی) زبان اون کی درمیان اون کے خوب رائج اور طعن شماتت (طعن وشماتت) سے سالم تھی۔ اکثر شعرا وہاں کے مثل نشاطی، وفراقی وشوقی وخوشنود وغواصی، ذوقی، ہاشمی شغلی، بحری، نصرتی و مہتاب وغیرہم کہ بے حساب ہیں۔ اپنی زبان میں قصائد وغزالیات (غزلیات)، ومثنوی ومقطعات نظم کئے اور داد سخنوری کا دمی (دے) لیکن نصرتی ملک الشعرا اور رنگ نظری سے مبرا ہے، جب شاہان ہند اس کلیز (کشمیر) جنّت نظر کو تسخیر کر کے طرز روزمرہ دکنی نہج محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی اور ہندوستان میں مدت لگ زبانِ ہندی کہ اوسے برج

---

[۱] جلد اوّل صفحہ ۶۷،

[۲] اصل متن کی غلطیوں کی تصحیح ہم نے بین قوسین کی ہے۔

بھاگا بولتے ہیں۔ رواج رکھتی تھی، اگرچہ لغت سنسکرت اون کی اصل اصول اور مخرج فنون فروع واصول ہے پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص کوں اوس کی (کے) کھولنے لگے سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمیٰ ہوئی۔"

"جیسا کہ ثنائیؔ و ظہوریؔ نظم و نثر فارسی میں بان طرز جدید کی (کے) ہوئی (ہوئے) ہیں، ولیؔ گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبتدا اور استاد ہے بعد اوس کی (کے) جو سخن سنجانِ ہند بروز کئے بے شبہ اس نہج کو اس سے لئے اور من بعد اوس کو باسلوب خاص مخصوص کر دیئے اور اُسے اُردو کے بھاگا سے موسوم کئے۔ اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کی (کے) جیسا شاہجہاں آباد و لکھنؤ و اکبر آباد وغیرہ رواج تمام پایا اور جوں چاہی (چاہیئے) سبھوں کو من بھایا اور آخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تلک اس فن میں اکثر مشاہیر شعرا عرصہ (وجود میں ؟) آئے اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں مثل دردؔ، مظہرؔ، فغاںؔ، دردمندؔ، یقیںؔ، سوزاںؔ، آبر (آبرو ؟)، آرزوؔ، سوداؔ، تاباںؔ وغیرہ ہم (وغیرہم)۔"

مندرجۂ بالا تمہید کتاب "دکنی مخطوطات یورپ میں"، (صفحہ ۴۵۶-۴۵۷) سے نقل کی گئی ہے۔ جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے اس بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی اور ایک مقام[۱] پر اس کا اقتباس بھی کیا ہے تو اس میں اس کا آخری حصّہ جس میں ولیؔ کا ذکر

---

[۱] مقالات ہاشمی،

ہے نہیں آنے پایا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اہل قلم نے بھی اس کی طرف کوئی "نگاہِ غلط انداز" بھی نہیں ڈالی، حالانکہ ولیؔ کے گجراتی ہونے پر آج سے ڈیڑھ سو برس پیشتر کی ایک دکنی عالم کی تحریر بڑی اہمیت رکھتی ہے خصوصاً اس اعتبار سے کہ اس کا لکھنے والا اُردو زبان کی تاریخ سے واقفیت رکھتا تھا[۱] اور ولیؔ کی ایجاد غزل ریختہ کے سبب ان کو سبھوں کا مبتدا اور استاد مانتا تھا۔ لہٰذا ایسے محقق کا بیان ولیؔ کے گجراتی ہونے پر "قولِ فیصل" کا حکم رکھتا ہے۔

سیرِ گجرات کا نظریہ سب سے پہلے آصفی ملکاپوری[۲] نے اور ان کے تتبع میں احسن[۳] مرحوم اور دیگر دکنی اہلِ قلم[۴] نے ولیؔ کے "قطعہ در فراقِ گجرات" کے ایک شعر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ولیؔ گجرات میں صرف سیر و تفریح کی غرض سے گئے تھے ورنہ اُن کا اصل وطن اورنگ آباد تھا۔ وہ شعر یہ ہے۔

اس سیر کے نشے سوں اوّل تر دماغ تھا
آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمارِ دل

۱؎ محبوب الزمن جلد دوم ص ۱۱۳۶، ۲؎ کلیاتِ ولیؔ ص ۳۸۵ کا نوٹ،
۳؎ یادگارِ ولیؔ ص ۵۷، ۴؎ ایک دکنی اہل قلم لکھتے ہیں: "شفیق اور فتوت اور محمد تقی ولیؔ کے اورنگ آبادی ہونے پر متفق ہیں اور دکن میں سوا اورنگ آباد کے کسی شہر کو ولیؔ کا وطن ہونے کا دعویٰ بھی نہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ولیؔ اورنگ آباد دکن کے اصل باشندے تھے۔" (مقالات ہاشمی ص ۱۵۶) میر اور ان کے تتبع میں شفیق کے سوا کسی نے ولیؔ کو اورنگ آباد کا باشندہ نہیں لکھا جن کی حقیقت ہم اپنے پچھلے مضمون میں ظاہر کر چکے ہیں۔ فتوت اور محمد تقی کی نسبت یہ صریح غلط بیانی ہے اس لئے کہ ان دونوں میں سے کسی نے بھی ولیؔ کو اورنگ آبادی نہیں لکھا فتوت نے صرف "دکنی" اور "زاد و بودش دکن" (مقالات ہاشمی ص ۲۵۴) اور محمد تقی نے "متوطن دکن" (مقالات ص ۱۳۱) لکھا ہے۔

ہم اپنے پچھلے مضمون میں اس پر کافی بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کلیاتِ ولی کا دوسرا اڈیشن جو حال ہی میں "انجمن ترقی اردو" نے شائع کیا ہے اور جو طبعِ اوّل کی بہ نسبت دیوانِ ولی کے زائد نسخوں سے تصحیح و مقابلہ کے بعد مرتب ہوا ہے، اس میں سرے سے لفظ "سیر" موجود ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی جگہ "شہر" چھپا ہے۔ اگر معتبر نسخوں کے مطابق یہ صحیح ہو تو اس بحث کا یہیں پر خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس قطعہ کے موضوع کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ لفظ "شہر" ہو۔ چنانچہ اب اس کے معنی بھی زیادہ واضح اور درست ہو گئے ہیں، کیونکہ "اس شہر" (اس کے شہر۔ مطلع میں گجرات کی طرف اشارہ ہے) اور مصرعۂ ثانی میں "اس فراق" (اس کے فراق) مشار الیہ بھی گجرات ہے اور اس کے لیے "سیر" کی بہ نسبت "شہر" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہاں ولی نے اپنے وطن مالوف احمد آباد کو "شہر" کہا ہے، تواریخ میں احمد آباد کو عام طور سے دار الملک گجرات لکھا گیا ہے۔

ملک دکن اور دکنی زبان

ہم اپنے مضمون میں اس بات کے متعدد شواہد پیش کر چکے ہیں کہ ولی نے اپنے تئیں اور دوسروں نے اُن کو "شاعرِ ملکِ دکن" لکھا ہے تو اس سے اُن کی مراد خطۂ گجرات ہے جس پر عام طور سے دکن کا اطلاق ہوتا تھا۔ اسی طرح ولی کے دکنی زبان میں شعر کہنے کے متعلق بھی ہم نے مفصل بحث کی ہے اس سلسلہ میں بعض گجراتی شعراء کے اپنے ملک گجرات کو "ملک دکن" اور اپنی زبان کو "دکنی" کہنے کی چند مثالیں بہم پہنچی ہیں جن کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

سید محمد اشرف متخلص بہ اشرف خاص احمد آباد گجرات کا باشندہ اور ولی کا شاگرد تھا اس نے اپنے اشعارِ ذیل میں اپنے وطن گجرات کو "ملکِ دکن" لکھا ہے:[1]

---

[1] گلشن گفتار ص ۱۲، ملاحظہ ہو مصنف شمارہ ۱۵ میں ہمارا مضمون سابق "اشرف گجراتی"، پر ہمارا ایک مفصل مقالہ عنقریب رسالہ اردو میں شائع ہوگا جس میں ہم نے اشرف کو گجراتی اور ولی کا شاگرد ثابت کیا ہے۔

ے یہ شعر سُن کے کہے ہیں صدآفریں اشرف
تمام شاعرِ ملکِ دکن سخن کی قسم[1]

ہوا سر مشق ہر یک صاحب طبع
سخن اشرف ترا ملکِ دکن میں

وصف میں تیرے شعر بولے ہیں
شاعرانِ دکن امیر الدین

کیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سول ماموں کا
ہوا مشتاق ہر یک شاعرِ ملکِ دکن میرا

اسی طرح اپنی مثنوی "جنگ نامہ حیدر" میں جو اس نے ۱۱۲۵ھ میں لکھی تھی کہتا ہے : ے

ہوس دل میں آیا کروں ترجماں
کروں فارسی کا یو دکنی بیاں

بزاں فارسی کوں دکن سال میں
پھر ایا ہوں اس کو ہر یک حال میں

۲۔ گودھرا (ضلع گجرات) کا ایک شاعر فتح شریف بلخی اپنے 'پند نامہ لقمان'

---

[1] حمید نے اپنے تذکرہ میں اشرف کی ۵ شعروں کی غزل نقل ہے اس کا یہ شعر ہے۔ حمید خود دکنی ہے اور اشرف کو گجراتی لکھ رہا ہے اس کے باوجود اس شعر کے متعلق اس نے کسی قسم کا ریمارک نہیں کیا۔

[2] یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۳۴۹

میں لکھتا ہے: ؎

ولے نثر میں فارسی تھا اوّل
کیا نظم دکنی سوں یو بے بدل

تعجب ہے کہ اس شاعر کو مؤلف "تذکرۂ اُردو مخطوطات" نے دکنی لکھ دیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:-

"فتح شریف گوڈر کا رہنے والا ایک دکنی شاعر تھا۔[۱]"

اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ "گوڈر" دکن کا کوئی شہر ہوگا۔ اس کی ایک تصنیف "زلیخائے ثانی" کی نسبت مؤلف مذکور نے لکھا ہے:-

"مصنّف کے ایک نامور دوست محمد امین نے قسم دیکر کہا کہ تم بھی زلیخائے ثانی کا ایک ایسا قصّہ لکھو جس کی وجہ سے شہر گوڈرا کی شہرت ہو جائے۔"

یہاں شاعر کا وطن گوڈر سے گوڈرا ہو گیا یہ "گودھرا" کی خرابی ہے جو دکن میں نہیں بلکہ گجرات کے ضلع پنج محال میں بی بی سی آئی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ اور یہ محمد امین وہی ہے جس نے مثنوی یوسف زلیخا ۱۱۰۹ھ میں اپنے وطن گودھرے ہی میں لکھی تھی۔ چنانچہ کہتا ہے: ؎

بتاں چالیس سو پھر چودہ اور سو
میں لکھا گودھرے کے بیچ سن لیو

اس پر مؤلف "دکنی مخطوطات" کا بیان ملاحظہ ہو:-

"اور یہ گودھری (گجراتی) زبان میں لکھی گئی ہے، مگر چونکہ امین کو دکن سے بھی تعلق رہا ہے اس لئے اس مخطوطے کی صراحت نامناسب نہیں ہو سکتی۔"[۲]

---

[۱] تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اوّل ص ۳۱ ۔ [۲] یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۳۳۸ ،

"مخطوطے کی صراحت" کا اشارہ غالباً آسپر نگر کی طرف ہے جس نے اس کو "دکنی نظم" بتایا ہے لیکن مصنّف تو یہ کہہ رہا ہے کہ اس نے یہ مثنوی شہر گودھرا میں لکھی ہے۔ گودھرے کو گودھری پڑھکر اس کو گوجری اور گجراتی (حالانکہ یہ دونوں علیحدہ زبانیں ہیں) سمجھ لینے میں غلطی ہوئی ہے۔ آگے چل کر مؤلف نے تسلیم کیا ہے کہ امین گجراتی تھا، چنانچہ لکھتے ہیں

"جہاں تک میری تحقیقات ہے ان کا تعلق گجرات سے تھا۔ عالمگیر کے عہد میں دکن کا رُخ کیا۔" ؎۱

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ "دکن کا رخ کرنے" کے متعلق مولف کا ماخذ کونسا ہے؟

۳۔ عبد المجید جو گجرات کے مہدویوں میں سے تھے اور جنہوں نے اس فرقہ کے بزرگوں اور پیشواؤں کے حالات میں ایک مثنوی "فیض عام" ۱۱۴۱ھ میں لکھی ہے۔ اس میں وہ اپنی زبان کو دکنی لکھتے ہیں۔

؎
سہل کر دکنی میں لکھّی کتاب
سو آوے سمجھ میں ہر یک کوں شتاب
کیا ہے کو دکنی زبان میں کلام
رکھا ناؤں اس کا یقیں فیض عام

اس کے متعلق پروفیسر شیرانی مرحوم رقمطراز ہیں:۔

"یہ لوگ (مہدوی) اصلاً گجرات کے رہنے والے تھے جہاں اُردو کی وہ شاخ جسے گوجری کہا جاتا تھا رائج تھی اور دکنی زبانیں آپسمیں اس قدر مشابہ ہیں کہ انسان کو ان میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اہلِ دائرہ دکنی لٹریچر سے کافی

؎۱ یورپ میں دکنی مخطوطات صـ ۳۳۹ ،

گہری آشنائی رکھتے ہوں گے کہ ان کی ادبی مساعی کا پہلا
نتیجہ ایک ایسی زبان میں ہے جسے دکنی کے سوائے اور نام
سے یاد نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے میری مراد مثنوی فیض عام
ہے اور جیساکہ گزشتہ صفحات میں مذکور ہوچکا ہے عبدالمحمد
اس کا مصنّف ہے۔" لے

ایک گجراتی مصنف کے اپنی زبان کو "دکنی" لکھنے پر شیرانی مرحوم کو اس کی توجیہ کرنی پڑی اور آخر انہوں نے اپنا یہ قیاس پیش کیا ہے کہ یہ گجراتی مصنّف دکنی لٹریچر سے گہری آشنائی رکھتے ہونگے، حالانکہ مرحوم نے خود تسلیم کیا ہے کہ گوجری اور دکنی اس قدر متشابہ ہیں کہ ان میں فرق کرنا دشوار ہے۔ یہ بجائے خود ایک علیحدہ بحث ہے لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک گجراتی مصنّف کی تصنیف ہے اور گجرات ہی میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی پر بحث کرتے ہوئے مرحوم نے اس کی جو لسانی خصوصیات دکھائی ہیں وہ اکثر گجراتی ہیں۔ ٢ے

۴۔ عبداللہ بن اسحاق واعظ ریاست گونڈل (کاٹھیاواڑ) کے شہر "دھوراجی" کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۹۶ھ میں انہوں نے "قصہ لیلیٰ و مجنوں" لکھا ہے۔ وہ کاٹھیاواڑ گجرات کے باشندہ ہونے کے باوجود اپنی زبان کو دکنی لکھتے ہیں: ے

زبان دکنی میں ایک قصہ سناؤں — سنہ ہجری میں سو لکھ کر سناؤں
میں عبداللہ واعظ ابن اسحاق — خدایا بھیج میرے غم کا تریاق
شروع قصہ کیا دسویں صفر کو — وہ دن تھا بیر کا وقتِ ظہر کو

لے اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۸۶
٢ے " " " صفحات ۸۸ و ۸۹،

ختم دسویں ربیع اوّل کیا ہے
گیارہ سو چھنوں ۱۱۹۶ اندر لکھا ہے۔
مہینہ ایک میں قصّہ لکھا ہے
سنو سورت میں یہ قصّہ بنا ہے
شروع قصّہ کیا گونڈل کے اندر
اوسے پورا کیا دھوراجی بھیتر [1]

ولیؔ کے نام کی تحقیق

گزشتہ مضمون میں ہم نے ولیؔ کے نام سے مختصر بحث کی ہے۔ یہاں ہم اس پر تفصیلی نظر ڈال کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ولیؔ کا نام شاہ ولیؔ اللہ تھا۔ جو احمد آباد کے مشہور بزرگ حضرت علاّمہ شاہ وجیہ الدین علوی قدس سرّہٗ کے خاندان سے تھے۔

اُردو شعراء کے حالات میں تین قسم کی کتابیں ملتی ہیں:

(۱) "قدیم تذکرے" جو بارھویں صدی کے منتصف سے لیکر تیرھویں صدی کے آخر تک لکھے گئے ہیں کچھ تو ذاتی تحقیقات اور کچھ سُنی سُنائی روایات پر مبنی ہیں۔

(۲) "مستشرقین یورپ کی تصانیف" اور یورپی کتب خانوں کے اُردو مخطوطات کی فہرستیں جن میں ان مخطوطات کے مطالعہ سے یا قدیم و جدید تذکروں سے تحقیق کر کے شعراء اردو کا ذکر کیا گیا ہے۔

ذیل میں ہم ان تینوں قسم کے تذکروں کے بیانات ولیؔ کے نام کے متعلق نقل کرتے ہیں۔

قسم اوّل:-

(۱) "مخزنِ نکات" از قائمؔ چاندپوری (۱۱۶۸ھ) ولیؔ کی وفات کے ۵۰ برس بعد کی تصنیف۔

---

[1] قصہ لیلیٰ مجنوں (مجموعہ بارہ قصّہ) مطبوعہ کریمی پریس بمبئی ۱۳۴۶ھ، صفحات ۶۹ و ۸۴،

"شاہ ولی اللہ، مولدش گجرات، گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی، از اولیا رمشاہیر است افتخار داشت۔" (ص۱)

(۲) "تذکرہ شعرائے اردو" مؤلفہ میر حسن (۱۱۸۸ھ، ۱۱۹۲ھ)

"درویش خفی وجلی شاہ ولی المتخلص بہ ولی مشہور و معروف مردے بود از خاکِ گجرات۔" (ص۲۰۴)

احمد گجراتی کی نسبت لکھتے ہیں :۔

"چوں معاصر شاہ ولی اللہ بودہ دو سہ ریختہ نیز گفتہ۔" (ص۴۱)

(۳) "تذکرہ گلزار ابراہیم" از علی ابراہیم خان خلیل (۱۱۹۸ھ)

"ولی دکنی شاہ ولی اللہ اصلش از گجرات۔" (ص۳۴۶)

(۴) "تذکرہ گلشنِ ہند" از مرزا علی لطف (۱۸۰۱ء)

"ولی تخلص شاہ ولی اللہ نام" (ص۱۷۵)

(۵) "تذکرہ طبقاتِ سخن" مؤلفہ شیخ غلام محی الدین قریشی تخلص عشق و مبتلا میرٹھی (۱۲۲۲ھ) تذکرہ آبرو :۔

"چوں دیوانِ ہندی شاہ ولی اللہ گجراتی بہ عصر محمد شاہ بہ دہلی رسید تتبع آں شد۔" [1]

(۶) سخن شعرا از عبدالغفور خاں نسّاخ (۱۲۹۱ھ)

"ولی تخلص شاہ ولی اللہ اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی کے۔" (ص۵۵۶)

قسم دوم :۔

(۷) "آبِ حیات" آزاد :۔ "شمس ولی اللہ" (ص۸۸)

(۸) "جلوہ خضر" از صفیر بلگرامی :۔ "ولی اللہ دکنی" (ج ا ص۱۶ و ص۲)

(۹) "گلِ رعنا" از مولوی عبدالحئی :۔ "شمس الدین لقب ولی اللہ نام (ص)

---

[1] ہندوستانی بابت جولائی ۱۹۳۲ء "دہلی میں اردو شاعری کا آغاز" ص۳۲۵،

(۱۰) "اربابِ سخن" از حسرت موہانی :- "شاہ ولی اللہ" (ص ۳۶)

قسم سوم :-

(۱۱) "دیوان ولی" مرتبہ گارساں دتاسی (۱۸۳۲ء)

"ولی کا نام شاہ ولی اللہ تھا" (مقدمہ) ؎۱

(۱۲) "مخطوطۂ دیوان ولی" (مملوکہ گارساں دتاسی) "شاہ محمد ولی اللہ" ؎۲

(۱۳) "یادگار شعراء" مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر (۱۸۵۴ء)

"ولی شاہ ولی اللہ ساکن گجرات" (ص ۲۱۷)

(۱۴) "اورنٹیل بایوگرافیکل ڈکشنری" از طامس ولیم بیل (۱۸۶۴ء)

"شاہ ولی اللہ ولی تخلص ساکن گجرات" (ص ۴۱۴)

(۱۵) "اڈنبرا کیٹلاگ" :- "شاہ ولی اللہ گجرات کے باشندے تھے" ؎۳

(۱۶) "آکسفرڈ کیٹلاگ" "ہندوستان کے ممتاز شاعر شاہ محمد ولی گجراتی"، ؎۴

(۱۷) "انڈیا آفس کیٹلاگ" از بلومہارٹ۔

"ولی دکنی جن کا نام شاہ ولی اللہ تھا بعض محمد ولی اور بعض ولی اللہ سے موسوم کرتے ہیں۔ ولی الدین بھی کہا گیا ہے۔ یہ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے" ؎۵

(۱۸) "ہندوستان کی پیمائش لسانی" از جارج گریرسن (۱۹ء)

"ولی کا نام شاہ ولی تھا"، (ص ۴۰۹)

(۱۹) "تاریخ ادب اردو" از گراہم بیلی (۱۹۳۲ء) "شمس الدین ولی اللہ" (ص ۳۳)

بعض تذکرہ نویسوں نے "محمد ولی" لکھا ہے جو پورے نام "محمد ولی اللہ" کا

؎۱ دیکھو یادگارِ ولی ص ۹۴، ؎۲ گارساں دتاسی مرتبہ ڈر قادری ص ۳۶،
؎۳ یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۴۸۴، ؎۴ یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۴۸۴،
؎۵ " " " ص ۴۸۳،

مخفف ہے، چنانچہ گردیزی، شفیق، فائق، شورش، ذکا، قاسم، نے بھی یہی نام لکھا ہے۔ آصفی ملکاپوری اور حکیم سید شمس اللہ قادری نے بھی "محمد ولی" کو ترجیح دی ہے۔ خود خاندان شاہ ولی اللہ کی قلمی بیاضوں اور ان کی مہروں اور دستخطوں میں لکھے ہوئے ناموں میں بھی تھوڑا تھوڑا فرق ہے چنانچہ۔

(۱) شجرۂ نسب میں: "شاہ محمد ولی اللہ"

(۲) مہر میں " محمد ولی اللہ"

(۳) مولوی سید احمد ابن سید عابد علوی کی بیاض میں: "شاہ ولی اللہ"

(۴) ان کے بھانجے شاہ یحییٰ بن غنی علوی متوفی ۱۱۵۰ھ کی لکھی ہوئی تاریخ وفات میں: "ولی اللہ"

(۵) ملفوظات کبیری میں "میاں ولی اللہ"

لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا پورا نام "شاہ محمد ولی اللہ" ہے جس کو بعض نے "شاہ ولی اللہ" بعض نے "محمد ولی اللہ" اور بعض نے صرف "ولی اللہ" یا "میاں ولی اللہ" لکھدیا ہے۔ جو ان کے پورے نام کے اجزا یا مختلف شکلیں ہیں، اور غالباً اسی آخری نام کی بنا پر دیوان ولی کے بعض قدیم مخطوطوں میں کاتبوں نے ان کا نام "میاں ولی محمد" لکھ دیا ہو تو تعجب نہیں، چنانچہ ثناء اللہ فانی کے لکھے ہوئے مخطوطہ ۱۱۳۸ھ میں "سید ولی محمد" اور انڈیا آفس کے مخطوطۂ دیوانِ ولی مکتوبہ ۱۱۵۵ھ کے کاتب محمد تقی نے "میاں ولی محمد" لکھا ہے۔ تذکروں میں یہ نام صرف "گلشنِ گفتار" میں ملتا ہے۔ اس کے سوا کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا۔

اس سے معلوم ہوگا کہ تقریباً تمام تذکروں میں شاہ محمد ولی اللہ، محمد ولی اللہ، ولی اللہ، اور محمد ولی لکھا ہوا ہے۔ جو ایک ہی نام کو ظاہر کرتا ہے، اور اسی پر تمام قدیم و جدید تذکرے متفق ہیں۔

عزیز مکرم سید ظہیرالدین مدنی (پروفیسر گجرات کالج) نے ۱۱۰۷ھ کے ایک "تمسک نامہ" میں شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے دستخطوں میں ولی اللہ کے والد کا نام "دو طرح سے لکھا ہوا پایا ہے چنانچہ ایک نے "محمد شریف" لکھا ہے تو دوسرے نے "شریف محمد" اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ جب شاہ ولی اللہ کے بیٹے اپنے دادا کا نام دو طرح سے لکھتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں اگر کاتبوں نے ان کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ کا نام "محمد ولی" کی بجائے "ولی محمد" لکھ دیا۔

ولی کا سنِ وفات

اُردو زبان کے مشہور شاعر ولی کی تاریخ وفات سے مختلف نظریے قائم کئے گئے ہیں۔ کسی نے ان کے سن وفات کی تعیین ۱۱۱۰ھ میں کی ہے۔ تو کسی نے ۱۱۴۱ھ میں کسی نے ۱۱۴۲ھ سے پہلے اور کسی نے ۱۱۵۵ھ میں۔ یہ اختلاف زیادہ تر ان غلط شہادتوں پر مبنی ہے جو بعض تذکرہ نویسوں کے غلط بیانات اور بعد کے مصنّفین کے غلط استنباط اور قیاس کا نتیجہ ہے باایں ہمہ یہ امر تعجب خیز ہے کہ ان میں سے ایک تاریخ بھی صحیح نہیں ہے قدیم تذکرہ نویسوں، میر، قائم، میر حسن، شفیق، گردیزی وغیرہم کو ولی کا چونکہ صحیح سن وفات معلوم نہ تھا اس لئے ان کی یہ احتیاط قابل قدر ہے کہ انہوں نے اپنے تذکروں میں اس کو نہیں لکھا، لیکن بعد کے مورخین ادب نے محض سنی سنائی باتوں اور غلط قیاسات کی بنا پر ولی کی تاریخ وفات لکھنے میں بہت بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔

سب سے پہلے مولوی سید احمد صاحب نے فرہنگ آصفیہ میں ولی کا سنہ وفات ۱۱۱۰ھ لکھا۔ اس کے بعد مولوی عبدالجبار خاں نے اپنے تذکرۂ محبوب الزمن (جلد ۲ صـ ۱۱۳۳) میں ولی کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھ دیا۔

"کہتے ہیں کہ ۱۱۵۵ھ ہجری کے قریب احمد آباد گجرات میں فوت ہوا"۔ بعد کے مصنفین نے اسی سن کو صحیح سمجھ لیا حالانکہ صاحب تذکرہ نے اس کی

سند پیش نہیں کی، بعض مصنفین نے ولی ویلوری کی وہ مجلس کو ولی کی تصنیف سمجھ کر ۱۱۴۱ھ تک اس کا زندہ ہونا ثابت کیا۔ اسی طرح دیوان ولی کے ایک مخطوطے کو دیکھ کر جو ۱۱۴۲ھ میں لکھا گیا ہے اور جس کے آخر میں ولی کو مرحوم لکھا گیا ہے۔ یہ قیاس کیا گیا کہ اس تاریخ سے پہلے ولی وفات پا چکا تھا۔ آزاد نے بھی آبحیات میں ولی کے نام سے اس شعر کو منسوب کر دیا حالانکہ وہ اس کے دیوان میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

شعر
دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ولی محمد شاہ کے زمانے میں زندہ تھا شفیق نے اپنے تذکرے میں اس کو مضمون کا شعر بتایا ہے جو حسب ذیل ہے

شعر
اس گدا کا دل لیا دلی میں چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

مصحفی کے تذکرے میں دیوان ولی کے ۲ سنہ جلوس محمد شاہی میں دیوان ولی کے دلی پہنچنے کا ذکر حاتم کی زبانی منقول ہے۔ اس سے ولی کا عہد محمد شاہی میں دوبارہ دلی جانے کا ثبوت فراہم کیا گیا، حالانکہ قدیم تذکرہ نویسوں میں سے قائم اور میر حسن نے ولی کا عالمگیر کے ۴۴ سنہ جلوس (۱۱۱۲ھ) میں صرف ایک مرتبہ دلی جانا لکھا ہے، اسی طرح حاتم کے اس شعر سے

اے ولی مجھ سے اب آزردہ نہ ہونا کہ مجھے
یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

یہ ثابت کیا گیا کہ ولی ۱۱۴۱ھ میں دہلی میں موجود تھے۔
اس طرح ایک مدت دراز تک ولی کا سن وفات مختلف قیاس آرائیوں کا مرکز بنا رہا اور کسی نے ولی کے صحیح سن وفات کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر ایک مدت کے بعد جناب مولوی عبدالحق صاحب

(معتمد انجمن ترقی اردو) کو بمبئی جامع مسجد کے کتب خانہ میں دیوان ولی کا ایک قدیم نسخہ دستیاب ہوا جو شہسوار بیگ نامی کاتب کے ہاتھ کا ۱۱۵۱-۲ھ کا لکھا ہوا ہے اور اس میں ولی کی وفات کا ایک قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

مطلع دیوانِ عشقِ سیدِ اربابِ دل
والیٔ ملکِ سخن صاحبِ عرفاں ولی
سال وفاتش خرد از سر الہام گفت
باد پناہِ ولی ساقیٔ کوثر علی

اس سے ۱۱۱۹ھ نکلتی ہے جو ولی کی صحیح وفات ہے بعد میں احمد آباد کے ایک کتب خانہ کی خانگی بیاض سے اس قطعۂ تاریخ کی مزید صحت و توثیق ہو گئی اور مولانا نے اس سے معلوم کیا کہ اس قطعہ کے مصنف مفتی احسن ہیں۔ مولانا کا ایک مضمون اس قطعہ کے متعلق رسالۂ اردو بابت ۱۹۳۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد سے عام طور پر ولی کا سن وفات ۱۱۱۹ھ تسلیم کر لیا گیا۔" اور ان محققین نے بھی جو ولی کی تاریخ وفات کی جستجو کر رہے تھے اور اس بارے میں مختلف قیاسات پر یقین کر چکے تھے۔ اس تاریخ کو صحیح مان کر پچھلے دور از کار قیاسات سے دست بردار ہو گئے

اس تاریخ وفات کی تائید میں احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانہ کی ایک قلمی کتاب اعراس نامہ میں ولی کی تاریخ وفات دریافت ہوئی اور اس میں سے یہ عربی مصرعہ ولی پر اپنے ایک مضمون میں نقل کیا۔

"مِنْ اَعینِ بدرٌ خفیٰ"

جس سے ۱۱۱۸ عدد نکلتے ہیں۔ غالباً اس کے پہلے مصرعہ میں ایک کا تعمیہ ہو گا۔

ولی کے سن وفات کا مسئلہ اب ہمیشہ کے لئے طے ہو چکا ہے اور اب

کسی کو اس میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی، اس کے باوجود بعض مدعیان تحقیق نے اپنا اصرار جاری رکھا ہے، عبدالجبار ملکاپوری کی بتائی ہوئی تاریخ وفات ۱۱۵۵ھ کو جس کو انہوں نے "کہتے ہیں" کے ساتھ لکھا ہے صحیح سنہ وفات سمجھے ہوئے ہیں، چنانچہ حال میں مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی پور نے مرآۃ الشعرا کی جلد اول میں اس غلطی کو دہرایا ہے، اس کتاب پر رسالۂ اردو جلد ۲۸ شمارہ ۲ میں اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے اور تبصرہ نگار نے اس تاریخ کی غلطی کو واضح کرتے ہوئے ولیؔ کے سن وفات پر روشنی ڈالی ہے اور مفتی احسن کے قطعۂ تاریخ سے استشہاد کیا ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ اس آخری تحقیق کے بعد اس غلطی سے متنبہ ہو کر ۱۱۱۹ھ کو صحیح تاریخ وفات تسلیم کر لیا جاتا۔ لیکن تعجب ہے کہ مولوی تنہا صاحب نے جو اس تحقیق میں بھی "تنہا" ہی ہیں اپنی جدید تالیف مرآۃ الشعرا کے دیباچے میں رسالۂ اردو کے تبصرہ نگار کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اپنی مزعومہ تاریخ پر اصرار کرتے ہوئے عجیب وغریب طرز استدلال اختیار کیا ہے جو اہل قلم اور قانون داں سے بہت بعید معلوم ہوتا ہے، چنانچہ کتاب کے ص ۶-۵ پر لکھتے ہیں:-

"ولیؔ کے سن وفات کے بارہ میں تبصرہ نگار نے جو قطعۂ تاریخ درج کیا ہے اس سے وہ ۱۱۱۹ھ اور ہم ۱۱۵۵ھ برآمد کرتے ہیں۔ قطعہ یہ ہے:-

مطلعِ دیوانِ عشقِ مسندِ اربابِ دل | والیٔ ملک سخن صاحب عرفاں ولیؔ
سالِ وفاتش خرد از سر الہام گفت | بادشاہِ ولیؔ ساقیٔ کوثر علی

از سر الہامؔ سے وہ صرف الف مراد لیتے ہیں اور ہم الہا جس کے عدد (۳۷) ہوتے ہیں اور چوتھے مصرع کے عدد ۱۱۱۸ لیکر جمع کرتے ہیں تو ۱۱۵۵ھ ہوتے ہیں اور یہی سن وفات مولوی

عبدالجبار خاں مؤلف تذکرۂ شعرائے دکن نے لکھا ہے۔ اور دیگر تذکرہ نویسوں نے اسکی تقلید کی ہے۔"

تنہا صاحب غلطی سے پہلے مصرع میں "مسندِ اربابِ دل" لکھ گئے ہیں۔ جو یہاں نسبتاً بھی غلط ہے، اصل قطعہ میں "سیدِ اربابِ دل" ہے اس سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو مولوی صاحب گویا اس قطعہ کو تسلیم تو کرلیتے ہیں لیکن انہیں صرف اس قدر اختلاف ہے کہ وہ از سرِ الہام سے صرف الف کا ایک عدد لینے کی بجائے الہام کے ۳۷ عدد لے لیتے ہیں۔ اور ان کو ۱۱۱۸ میں جوڑ کر ۱۱۵۵ھ بنا دیتے ہیں۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ ۱۱۱۸ کے ساتھ الہا کے عدد ملانے سے ۱۱۵۵ھ بن جاتے ہیں، لیکن ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ مولوی صاحب نے تعمیہ کا یہ طریقہ کہاں سے ایجاد کیا؟ اسی کو ایجاد بندہ کہتے ہیں۔ فن تاریخ گوئی سے تھوڑی سی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ جب کسی مصرعہ تاریخ سے پہلے کے مصرعہ میں "از سر، یا از روئے" کے بعد جو لفظ ہوتا ہے۔ اس کے پہلے حرف سے تعمیہ کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد اس لفظ کے بقیہ حروف کبھی نہیں ہوتے یہ ایسا عام قاعدہ ہے کہ مولوی صاحب جیسے ادیب اور شاعر کی اس سے ناواقفیت باعثِ حیرت و استعجاب ہے۔ یہاں ہم اس قسم کے تعمیہ کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) تاریخ وفات حضرت سید امجد علی سجادہ نشین حضرت بڑا صاحب خدانما از غلام وجیہ الدین صاحب (منقول از اعراس نامہ قلمی)

سالِ ترحیل از سرِ افسوس   گفت رضواں "مقیمِ باغِ جناں"

۱   ۱۲۹۶ + ۱

۱۲۹۷

(۲) تاریخ وفات شاہ محمد آفاق (از آثار الصنادید ص۱۸)

از سرِ یاس گفت اہلِ جہاں   شاہ آفاق رفت از دنیا

۱   ۱

(۳) تاریخ وفات سیّد بدرالدین رفاعی از میاں بھوسورتی شاگردِ ذوقؔ،
(تذکرۃ الانساب ص ۱۵)

گو گفت گوینده از سرِ افلاک ۔۔۔ سال تاریخ او غروبِ ماه
۱ ۔۔۔ ۱۲۵۴ + ۱ = ۱۲۵۵

(۴) دیوان سخن دہلوی کی تاریخ طبع (دیوان ص ۲۹۰)

نوشتم فیض تاریخ از سرِ کلک ۔۔۔ پسند طبع دیوانِ سخن شد
۱ ۔۔۔ ۱۳۰۱ + ۱ = ۱۳۰۲

(۵) ایضاً (ص ۲۸۹) لکھا ہے۔

عزیز از سرِ انصاف یہ تاریخ ۔۔۔ لبریز معانی ہے یہ دیوانِ سخن ہے
۱ ۔۔۔ ۱۳۰۱ + ۱ = ۱۳۰۲

(۶) ایضاً (ص ۲۸۳)

نوشتم از سرِ الہام تاریخ ۔۔۔ زہے دیواں بود سرمایۂ فخر
۱ ۔۔۔ ۱۳۰۱ + ۱ = ۱۳۰۲

(۷) ایضاً (ص ۲۸۲)

از سرِ ہوش از بہ بینی در کتاب و اہلِ آں
۱
ایں بود اقلیم معنی آں جہانبانِ سخن
۱۳۰۱ + ۱ = ۱۳۰۲

کتابوں میں اس قسم کے سیکڑوں تاریخی اشعار ملیں گے جن میں اس طرح تعمیہ کیا گیا ہے۔ لیکن کسی نے بھی کہیں از سر یا از روسے مراد کلمۂ مابعد کا کوئی دوسرا حرف نہیں لیا۔ نہ ایسی کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ مولوی تنہا صاحب ہمیں فن تاریخ گوئی کی کسی تاریخ میں نہ تو قاعدہ دکھا سکتے ہیں۔ نہ اپنے دعوے کی سند میں ایک شعر بھی پیش کر سکتے ہیں۔
ہمیں تنہا صاحب کی اس ناواقفیت پر تعجب نہیں ہے بلکہ افسوس اس

بات کا ہے کہ وہ قطعۂ تاریخ کو تسلیم کرتے ہوتے بھی ایک ایسا مضحکہ خیز طرز استدلال اختیار کرتے ہیں جسے طالبعلمانہ کج بحثی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس سے ان کی قابلیت پر حرف آتا ہے، محض اس لئے کہ مولوی عبدالجبار خان لکھ گئے ہیں، ان کے بتائے ہوئے سن وفات پر رجماً للغیب ایمان لانا اور اس کے مقابلہ میں ایک ہمعصر کی لکھی ہوئی صحیح تاریخ وفات کو غلط بتانا سوائے ضد اور ہٹ دھرمی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب موصوف کو معلوم ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب کا دریافت کردہ قطعہ ان تمام محققین کی نظر سے گزر چکا ہے جو علم و فضل اور شعر و ادب میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے کسی نے اس طریقۂ تعمیہ کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا۔ کیونکہ اس قاعدے سے وہ پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ بہرحال تنہا صاحب کو اس بات کی داد ضرور ملنی چاہیئے کہ انہوں نے الہا کو اپنے مفید مطلب اور ۱۱۱۸ میں ملاکر ۱۱۵۵ھ بنا دیا!

لیکن یہ ساری عجوبہ کاری یہیں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ مولوی صاحب اس قطعہ کو تسلیم کرتے ہوئے بھی فرماتے ہیں۔ "لہذا جس قطعۂ تاریخ پر استدلال کیا جاتا ہے وہ تو اب مشتبہ ہو گیا" ماشاء اللہ، مولوی صاحب چونکہ وکیل بھی واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ابھی ابھی وہ جس قطعہ کو صحیح جان کر اپنے مفید مطلب اعداد نکالنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ آن کی آن میں بدل جاتے ہیں اور پورے قطعہ کو مشتبہ قرار دیتے ہیں! جس طرح ایک چالاک وکیل عدالت میں کسی مجرم کے دفاع میں استغاثہ کے نظریہ میں شک و شبہ پیدا کر دیتا ہے اور اسے اپنے موکل کی رہائی کے لئے کافی استدلال سمجھ لیتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ان تجربہ کار قانون داں اور کہن سال وکیل صاحب کی یہ منطق علم و ادب کی عدالت عالیہ میں ناقابل قبول ٹھہرتی ہے۔ اور وہ اپنا مقدمہ بری طرح ہار جاتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

"تاریخ گو شعرا نے اپنی اپنی تاریخیں عجیب عجیب حساب سے لکھی ہیں اور خاص سنین کے اعداد کسی نہ کسی طرح پورے کئے ہیں. حقیقتاً حروف کے اعداد سے تاریخ نکالنی آسان کام بھی نہیں ہے۔ اس لئے ان کو یہ اجازت ہے کہ جس طرح چاہیں تاریخ برآمد کریں. اسی بناپر تاریخ گوئی تخرجہ اور تعمیہ بھی جائز ہے، لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم سرالہام سے حرف الف مراد لیں اور الہا نہ لیں جو صحیح تاریخ وفات ظاہر کرتا ہے. علاوہ ازیں حرف الف مراد ہوتا تو سر کے بجائے رُو استعمال کیا جاتا جیسا کہ بعض تاریخوں میں دیکھا گیا ہے۔"

مولوی تنہا صاحب کی اس تحریر سے ہمیں کلی اتفاق ہے کہ تاریخ گوئی میں تخرجہ اور تعمیہ بھی جائز ہے لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً غلط ہے کہ آپ اس کے مقررہ قاعدے کو چھوڑ کر جو جتنے حرف چاہیں مراد لے لیں محض اس لئے کہ اس سے آپکی مزعومہ تاریخ صحیح بن جاتی ہے. ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رُو اور سر دونوں تعمیہ کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی کلمہ مابعد اس کے سوا ان کا اور کوئی مفہوم نہیں ہوتا. اس لئے انہیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ الہام میں سے الف کے علاوہ دوسرے حروف بھی ملالیں، یہاں تک تو غنیمت تھا کہ مولوی صاحب نے مفتی احسن کے قطعۂ تاریخ میں الہا کو مفید مطلب پاکر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا تھا گو فوراً ہی بعد انہوں نے اسکو مشتبہ بھی بتادیا ہے، لیکن انہیں رسالۂ اُردو کے تبصرہ نگار کا یہ قول یاد آگیا کہ مفتی احسن محمّد شاہ کے عہد میں احمد آباد کے مفتی تھے چنانچہ اس پر فوراً گرفت کر کے فرماتے ہیں کہ " یہ بھی اس امر کی دلیل ہے

کہ ولی کا انتقال محمد شاہ کے عہد میں ہوا ہے۔"

اگر مولوی احسن صاحب جو ولی کی وفات کے وقت یہ قطعہ کہہ چکے تھے محمد شاہ کے عہد میں مفتی بنائے گئے تو اس میں کونسی قباحت لازم آتی ہے؟ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ قطعۂ مذکور کو عہد محمد شاہی میں نقل کیا گیا ہے جبکہ وہ مفتی کے عہدہ پر سرفراز تھے، لیکن تنہا صاحب کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ مفتی صاحب ولی کے ہمعصر نہیں تھے یا انہوں نے یہ قطعہ محمد شاہ کے عہد میں کہا تھا۔ یہ دوسرا مغالطہ ہے جو انہوں نے قطعۂ مذکور کی تاریخ ۱۱۵۵ھ بتا کر پیدا کر دیا ہے۔ آگے چل کر اسی سلسلہ میں وہ رقمطراز ہیں۔

"اور خود عالمگیر کی وفات ۱۱۱۸ھ مانی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا معظم بہادر شاہ تخت نشین ہوا، جس نے پانچ برس تک حکومت کی اور پھر جہاندار شاہ فرخ سیر رفیع الدرجات وغیرہ بادشاہ ہوئے۔ اگر ولی ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوتا تو ولی اور اورنگ زیب کا سن وفات ایک ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ محمد شاہ کے زمانہ کا مفتی اتنی مدت کے بعد کیا تاریخِ وفات لکھتا۔"

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے فرض کر لیا گیا کہ مفتی صاحب نے یہ قطعہ عہد محمد شاہ میں کہا ہے؟ اور ۱۱۱۸ھ کو اورنگ زیب کا سال وفات بنا کر ولی اور اورنگ زیب کا سالِ وفات ۱۱۱۹ھ ایک ہونا کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ نیز اس بات کو ولی کے سنہ وفات سے کونسا تعلق ہے؟ اس بے ربط عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تنہا صاحب اس قطعہ کو مفتی احسن کا کہا ہوا صحیح نہیں سمجھتے۔ جو خود ان کے پچھلے قول سے متناقض ہے۔

رہا وَلیؔ کے سن وفات کا دوسرا عربی مصرعہ "من اعین بدرہ خفیٰ" جس سے ۱۱۱۸ برآمد ہوتے ہیں اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"وہ عالمگیر کی تاریخ وفات معلوم ہوتی ہے کیونکہ بدر کہنے کے لئے تو ولی کو بھی کہہ دیا جائے لیکن عالمگیر کے لئے بدر زیادہ موزوں ہے، بہرحال تاریخ کے الفاظ میں نام نہ ہونے سے یہ کہنا مشکل ہے کہ کس کی تاریخ وفات ہے چونکہ مسلمہ طور پر یہی عالمگیر کا سن وفات ہے لہذا قیاس یہی چاہتا ہے کہ شیخ فرید صدیقی نے عالمگیر کی رحلت پر تاریخ وفات نکالی ہے۔"

یہ مصرعہ تاریخ "اعراس نامہ" سے نقل کیا ہے جو مشہور علماء، ادبا، شعراء اور بزرگانِ دین کی تاریخہائے وفات کی ایک قلمی بیاض ہے اور ہر مہینہ کی تاریخوں پر مرتب کی ہوئی ہے، چنانچہ یہ مصرعہ مع دیگر تواریخ کے وَلی کے نام کے ساتھ اس بیاض میں درج ہے۔ عالمگیر کی تاریخ وفات اس بیاض میں اس لئے درج نہیں ہوسکتی کہ اس میں کسی بادشاہ کا سن وفات نہیں دیا گیا، جبکہ ناقلِ شعر وَلی کے نام سے ان کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں یہ مصرعہ نقل کر رہا ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ وَلی کی نہیں بلکہ عالمگیر کی تاریخ وفات ہے؟ اس قسم کا قیاس قطعاً غلط اور اعراس نامہ کی عبارت کے بھی سراسر خلاف ہے، پھر ایک شخص اپنے کسی عزیز کے لئے کوئی مبالغہ آمیز تعریفی کلمہ استعمال کرتا ہے تو اس میں کونسا اعتبار ہے۔ اس قسم کے تاریخی مادّے عام طور پر پائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد حاتم والے شعر سے جو استدلال کیا گیا ہے نہایت بلیغ و پاافتادہ اور دُور از کار ہے اور اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ تنہا صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حاتم کا سن ولادت لفظ ظہور ہے جس سے ۱۱۱۱ نکلتے ہیں۔ اور دکنی صرف ایک مرتبہ بقول قائم و میر حسن ۴۴ ویں جلوس عالمگیری

(۱۱۱۲ھ) میں دہلی گئے تھے، جبکہ حاتم کی عمر صرف ایک سال کی تھی اور حاتم نے بقول خود ۱۱۲۹ھ سے شعر کہنا شروع کیا تھا، جبکہ ان کی عمر ۱۹ برس کی تھی اس لیے ان دونوں کی ملاقات کا گمان بھی نہیں ہو سکتا وہ دیگر شعراء کی طرح جو ولی کے بعد ہوئے ولی کو استاد مانتے تھے جیسا کہ خود انہوں نے بھی دیوان زادہ میں تحریر کیا ہے۔ ایسی حالت میں استاد کی زمین میں غزل کہی تو اس میں یہ معذرت بھی کر گئے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ حاتم ولی کے ہمعصر تھے اور یہ غزل انہوں نے دلی میں ولی کی موجودگی میں کہی ہے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

آخر میں تنہا صاحب نے لکھا ہے کہ:

"ولی کی پیدائش مسلمہ طور پر ۱۰۷۹ھ میں ہوئی۔ اگر اس کی وفات ۱۱۱۹ھ میں واقع ہوئی تو وہ اس حساب سے انتالیس چالیس برس کی عمر میں فوت ہو گیا تھا اور جوانی کی موت ایسی نہ تھی کہ تذکرہ نویس اس کا ذکر نہ کرتے"

اس کے لئے انہوں نے عرفی کی مثال پیش کی ہے اور ابوالفضل کا یہ فقرہ لکھا ہے کہ:

"ہنوز غنچۂ استعدادش ناشگفتہ پژمرد"

دوسری مثال انعام اللہ خاں یقین کی دی ہے، یہ دونوں مثالیں یہاں چسپاں نہیں ہوتیں کیونکہ عرفی کا انتقال ۳۶ برس کی عمر میں ہوا تھا اور اس پر ابوالفضل کا یہ طنزیہ فقرہ کہ اس کا غنچۂ استعداد ابھی کھلا نہ تھا اس کی جوانامرگی پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ اس کی قابلیت پر ایک لطیف طنز ہے اگر اس کو طنز نہ بھی مانیں تو اس کا کہنا بالکل صحیح ہے کہ انسان کی استعداد ۴۰ سال کے بعد رتبۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ یقین نے البتہ عنفوانِ شباب میں انتقال کیا جو کہ اس نے ۲۵ برس کی عمر میں وفات پائی لیکن تنہا صاحب ولی کا ۴۰ برس

میں وفات پانا جوانمرگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس عمر کے آدمی کو جواں نہیں کہتے۔ یہ عمر دراصل پیری کی حدود میں داخل ہے جیسا کہ سعدی نے کہا ہے

؎ چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاج تو از حال طفلی نگشت

تنہا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ولی بھی جوانمرگ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تذکرہ نگار اس امر کو افسوس اور وضاحت کے ساتھ بیان نہ کرتے، اس بات سے کہ کسی تذکرہ نویس نے ولی کو جوانمرگ نہیں لکھا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عمر طبعی کو پہنچا اور ہرگز اس کی وفات ۱۱۱۹ھ میں نہیں ہوئی جیسا کہ رسالہ اُردو کے تبصرہ نگار کا خیال ہے بلکہ قرین قیاس اور صحیح یہی ہے کہ ولی کی وفات ۱۱۵۵ھ میں واقع ہوئی۔

تنہا صاحب جو اُردو شعراء کا تذکرہ لکھ چکے ہیں اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اُردو کے تذکرے ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے۔

لیکن ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ کونسا تذکرہ ہے جس نے ولی کا مفصل حال لکھا یا تاریخ وفات بیان کی ہے یا کم از کم اس کی تاریخ ولادت لکھی ہے، جس کو تنہا صاحب ۱۰۷۹ھ مسلمہ بتا رہے ہیں، جب آپ کو ان تذکروں سے ولی کے حالات ہی نہیں مل رہے ہیں تو آپ کیسے توقع کرتے ہیں کہ کوئی تذکرہ نویس اس کا ذکر کرتا۔ علاوہ ازیں ولی کا [illegible] ولادت کسی قدیم تذکرہ نویس نے نہیں لکھا، جدید تذکروں میں صاحب محبوب الزمن نے یہ مبادرت کی ہے مگر ان کے پاس نہ تو اس کا کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ اس کے لئے کوئی سند پیش کر سکے ہیں۔

ان حالات میں تنہا صاحب کا یہ اصرار کہ ۱۱۵۵ھ ہی ولی کی تاریخ وفات ہوسکتی ہے اور رہے، اہل تحقیق و نظر کے نزدیک کسی طرح قابل وقعت و قبول نہیں ہے اور ان کے تمام طرز استدلال سے نہ صرف ان کی ناواقفیت کا پردہ فاش ہوتا ہے بلکہ جس انداز سے انہوں نے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے اس سے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی ظاہر ہوتی ہے، جو غیر علمی اور غیر تحقیقی رجحان طبیعت کا نتیجہ ہے جو علمی مباحث میں اس قسم کی کج فہمی اور طالبعلمانہ کج بحثی سے انسان کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا بلکہ خود بھی فریب نفس میں مبتلا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی دھوکہ دیتا ہے۔

آخر میں ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ۱۱۵۵ھ جسکو ولی کا سن وفات ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے قطعاً غلط اور صاحب محبوب الزمن نے صرف ایک سنی سنائی بات اپنے تذکرے میں لکھ دی ہے جسکی کسی تذکرے سے تائید نہیں ہوتی اور مولوی عبدالحق صاحب نے مفتی احسن کا جو قطعہ دیوان ولی کے قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۱۵۲ھ موجودہ کتب خانۂ جامع مسجد احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانہ کی بیاض سے نقل کیا ہے۔ صرف یہی ایک معتبر اور مستند ماخذ ہے جس سے ولی کا سن وفات معلوم ہوتا ہے اور اس قطعۂ تاریخ کو غلط ثابت کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ ولی سے متعلق ابتک جتنی تحقیقات ہو چکی ہیں ان کے خلاف ہے اور اس لحاظ سے کسی طرح قابل اعتنا نہیں ہے۔

دیوانِ وَلی کا قدیم ترین مخطوطہ

دیوانِ ولی کے بے شمار مخطوطے ہندو پاکستان اور یورپ کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں کلیات ولی طبع اوّل کے مقدمہ میں مولوی احسن صاحب مارہروی مرحوم نے ان تمام مخطوطات کی فہرست دے دی ہے جو ترتیب کلیّات کے وقت ان کے پیش نظر تھے۔ ان میں سرِفہرست وہ نسخہ ہے جو ۱۱۲۱ھ کا مکتوبہ اور نواب نصیر حسین خیال مرحوم کی ملک بتایا گیا ہے۔ لیکن اس نسخہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے اور واقع میں اس کا وجود بھی کہیں تھا یا نہیں۔ اس فہرست میں انجمن ترقی اُردو کے کتب خانے کے تقریباً ۲۵ نسخے درج کئے گئے ہیں۔ آج بھی انجمن کے کتب خانے میں کئی نسخے دیوانِ ولی کے موجود ہیں۔ ان میں وہ نسخہ بھی ہے جو آج تک دریافت شدہ مخطوطات میں سب سے قدیم ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کا مخطوطہ

پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں ایک مخطوطہ ۱۱۳۸ھ کا لکھا ہوا ہے جو سب سے قدیم مانا گیا ہے۔ یہ ولی کے شاگرد ثنار اللہ فانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ نسخہ مذکور کے آخری صفحہ پر یہ ترقیمہ درج ہے:

"دیوان اشعار ولی محمد مرحوم بتاریخ چہاردہم شہر محرم الحرام ۸ سنہ از جلوس میمنت مانوس محمد شاہ بادشاہ غازی

خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ روز چہار شنبہ وقت چاشت در بلدۂ خیر البلاد احمد آباد حمیت عن الفساد بخط فقیر حقیر اضعف العباد کلب محبوب سبحانی نمود بے بود ثناء اللہ فانی[1] سمت انجام و صورت اتمام پذیرفت۔"

انجمن ترقی اردو کا مخطوطہ

اس وقت انجمن کے کتب خانے میں ایک مخطوطہ اس سے بھی قدیم ترین ہے جو ۱۱۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ جیسا کہ اس کے آخر میں لکھی ہوئی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے: (اصل تحریر کا عکس ملاحظہ ہو)

"کاتب الحروف فقیر حقیر محمد بازید ولد محمد عثمان ابن عیسیٰ خان عفر اللہ لہ ذنبہ بتاریخ ۴ رمضان المبارک ۱۱۳۵ھ یوم پنجشنبہ بوقت دوپہر ۴ھ جلوس محمد شاہی قلمی شد تمت تمام شد در خجستہ بنیاد اورنگ آباد"

اس کے نیچے مولوی محمد عمر صاحب یافعی کا نوٹ مکتوبہ ۱۴ مارچ ۱۹۳۵ء ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ نسخہ ان کو دستیاب ہوا تھا۔ یہ مخطوطہ ۶ × ۱۰ کی تقطیع پر لکھا ہوا ہے۔ کل اوراق ۹۷ یا ۱۹۴ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ پر شنگرفی روشنائی میں جدولیں بنی ہوئی ہیں۔ کاغذ دبیز احمد آبادی ہے مختلف اصناف سخن کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

غزلیں ۴۳۶، مستزاد ۴، ترجیع بند ۳، قصائد ۳، مثنوی سورت ۱۔ ۲، رباعیات ۱۰، فردیات ۴۷، مخمس ۱۰، مثلث ۱،

حواشی

ورق ۸۷ سے ورق ۹۷ تک کے آگے کے حاشیے کونہ میں سے کٹے ہوئے ہیں جن میں تقریباً دو دو تین تین

---

[1] مخزن شعرائے گجرات میں ان کا تخلص ثنا لکھا ہے یہاں فانی بطور صنعت ادرتا نیہ کی رعایت سے آیا ہے۔

آخری مصرعے نکل گئے ہیں۔ حاشیوں پر دوسرے شعرا اور ولی کی بعض غزلیں چڑھی ہوئی ہیں ورق ۱۱ کے حاشیے پر صادق تخلص کے شاعر کی غزل ہے۔ ورق $\frac{28}{2}$ اور ۴۴ کے حاشیوں پر جعفر نامی شاعر کی دو غزلیں ہیں، ورق $\frac{47}{2}$ کے حاشیہ پر کسی کی ایک غزل کے تین شعر درج ہیں تیسرا شعر ہے۔

اب تو جاتے ہیں پیو کے کوچے سے
پھر ملیں گے اگر حیاتی ہے

میر کا یہ شعر اسی کا ہم مضمون ہے

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ورق $\frac{67}{2}$ پر محمد مہتاب کی ایک غزل ۹ شعر کی درج ہے۔ ورق $\frac{72}{2}$ پر معتبر خاں عمر شاگرد ولی کی ایک غزل چڑھی ہوئی ہے۔ ورق ۷۵ پر عطا تخلص شاعر کا ایک سلام ہے جو کسی دوسرے کاتب کے خط میں ہے اور بہت بعد کا کلام معلوم ہوتا ہے، ورق ۷۹ پر رضا تخلص شاعر کا فارسی مخمس ہے

خصوصیات

اس مخطوطہ کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس کا خط نستعلیق ہے اور اس طرز کا ہے جو عموماً گجرات اور دکن میں رائج تھا۔

۲۔ املا کی کافی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

۳۔ بعض غزلوں کی ترتیب عام نسخوں سے جداگانہ ہے۔

۴۔ غزلیات ردیف وار ہیں۔ لیکن بعض غزلیں ایک ردیف کی دوسری ردیف میں درج ہو گئی ہیں۔

۵۔ کتابت خوشخط نہیں ہے، پھر بھی خط بہت صاف ہے کاتب

کوئی زیادہ پڑھا لکھا یا خطاط نہیں معلوم ہوتا۔ بعض الفاظ جیسے دیکھے ویسے ہی نقل کر دیئے ہیں۔

۶۔ رسم الخط کی بعض خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) وہ کو ہر جگہ "وو" لکھا ہے۔

(۲) یائے معروف کو مجہول اور یائے مجہول کو یائے معروف لکھا ہے۔

(۳) گاف کو ہر جگہ کاف لکھا ہے۔

(۴) اُس کو "ادس" لکھا ہے۔

(۵) واو عطف کو معطوف کے ساتھ ملا کر لکھا ہے۔ مثلاً جانو دل، جوشو خروش وغیرہ۔ اسی طرح اضافت میں مضاف کے آخر میں کسرہ کی جگہ 'ی' لکھی ہے مثلاً بیانے دل، نشانے دل، فراقے گل وغیرہ۔

(۶) ٹ کی بجائے ت پر چار نقطے دیئے ہیں۔

(۷) ڑ کی جگہ 'ر' استعمال کیا ہے جیسے ہر کہری (ہر گھڑی) کہیں کہیں ر پر چار نقطے لگائے ہیں، ڈ کی جگہ ذ استعمال کیا ہے۔

(۸) ہائے ہوز کہیں بھی دوچشمی استعمال نہیں کی۔ مثلاً بہی، بہالا، کیہوں۔

غیر مطبوعہ کلام

(۱) مخطوطہ میں مندرجہ ذیل ۶ غزلیں پائی جاتی ہیں۔ جو کلیات ولی کے کسی مطبوعہ ایڈیشن میں نہیں ہیں۔

(۱)۔ زلف کوں کھول دام کرتے ہیں آہوی دل کوں رام کرتے ہیں

دیکھ تجھ لعل لب کی کیفیت زاہداں مے حرام کرتے ہیں

بلبلاں چھوڑ کر چمن کوں سجن تجھ گلی میں مقام کرتے ہیں

گلرخاں فیضِ لب کے پانی سوں بادۂ لعل فام کرتے ہیں

ناوکِ ناز شوخ چشم ولی دل میں عاشق کے کام کرتے ہیں

(۲)۔ یہ غزل حاشیہ پر درج ہے۔

دل رُبائے عاشقاں وہ مہرِ سیم اندام ہے
جس کے تارِ زلف میں افسوں گری کا دام ہے

کیوں نہ ہوئے قمری و بلبل کا سینہ چاک چاک
جس چمن میں جلوہ گر وہ سروِ سیم اندام ہے

تجکوں صہبائے تبسم ہم عناں ہے پر فسوں
مجکوں جامِ بیخودی ہمدستِ موسے نام ہے

نگہ کا ہے عشق ہے تجھ حسن عالمگیر سوں
تجکوں شیریں لعل کہنا نشۂ اسلام ہے

کیوں کرے نئیں بیقراری تجھ اوپر دائم ولی
سُور سا جھلکار تیرا دشمنِ آرام ہے

(۳) جب سیں خیالِ یار آ میرے سنیں یارا یار ہے
تب سوں مجھ اوپر درد کا ہر لحظہ مارا مار ہے

جب سیں وہ خونی چشم کوں دیکھیا ہوں مستی تب سنی
ہر یک مژہ کا تیر آ مجھ دل کے بھیتر پار ہے

ہر ایک کا ہر ایک سوں محبوب بولے بات کوں
قسمت میں میری کیا سبب یو سنگدل دلدار ہے

جوں مجھ سے آکر بات وو کہتا ہے یار وایک دان
تب سے رقیباں دل کہو رخ مثل جیو بیزار ہے

جب سے ہوا ہوں خبط میں اُس دلرُبا کے دکھ آدب
تب سیں فدا مجھ عشق کا سب چوک اور بازار ہے

بس عشق کے میدان میں اب یو ولی منصور جوں
اس سبدا کا ناتوں لے جا دارِ غم پر سوار ہے

(۴) یہ غزل حاشیہ پر درج ہے :-

شوخ مست شراب نکلا ہے　　اس سبب بے حجاب نکلا ہے
مرد ہے ہاتھ میں وہ تیغ لیکر　　صبح جوں آفتاب نکلا ہے
تیرے دیوانِ حسن سیں قامت　　مصرعِ انتخاب نکلا ہے
جب دیا پیچ اپنی زلفاں کوں　　ابر سیں آفتاب نکلا ہے

بختِ عاشق ہیں اس سبب بیدار
وو ولی مست خواب نکلا ہے۔

(۵) جان جاں تجکوں جان بولیا ہوں　　بھی تجھے جیو کا زیان بولیا ہوں
تیری پلکاں کوں میں خدنگ کے جان　　تجھ بھواں کوں کمان بولیا ہوں
آیۂ حسن دیکھ زیر و زبر　　مکھ ترے کوں قرآن بولیا ہوں
سن بچن تجھ دہن کے مثل گوہر　　لعل ہیروں کی کان بولیا ہوں
تجھ زباں سوں جیے جو بیجا دیکھ　　تجکوں عیسیٰ زبان بولیا ہوں
چشم تیری کوں پھول نرگس کا　　مکھ کتیں گلستان بولیا ہوں
فکر کر تیرے قد کوں ای جاناں　　راستی ہیں سنان بولیا ہوں

گئی ولایت ولی کی دیکھ تجھے
بات یہ سب جہان بولیا ہوں

(۶) دستا نہیں مجھ دلربا جو مجھ سوں آ یاری کرے
تا یوم بعث و حشر لگ ہے ہے وفا داری کرے
یو دل اپس زلفاں کے وو لے بند کر پیچاں منے
نا چھوڑ کر اوسکوں سکے ہر وقت طراری کرے
نا عشق لاتوں اس ستی جسکی نظر ہر خار ہے
بیشک ہے وو جس سوں ملے اس ستا بچکاری کرے
معشوق کوں لازم ہے یو عاشق پڑے جب ہجر بیچ
دیکر دلاسا دید کا ہر لحظہ غمخواری کرے

دل کوں لگانا اُوس ستی جو کوئی کہ دل رہ ول گیا
پھر دل کوں اپنے سخت کر عاشق کی ناخواری کرے
جس کے لگا جب دل بھر اس عشق کا شیوہ سدا
جا جیو منے اس کے مکاں یُو دکھ عمر ساری کرے
پھر کرو ودستا ہے مجھے سیّد کہ جس کا نام ہے
اس عشق کے غم میں کدھی شاید کہ دلداری کرے
سن ای ولی اسکی طرف نا دیکھ کر ہو محو توں
ہر ایک سوں جو عشق لا پھر سب سوں عیاری کرے

زائد اشعار

غزل ۴۹ میں یہ دو شعر زائد ہیں۔
اگر تجھ حسنِ عالمگیر کوں دیکھیں ادا فہماں
نہ لیاویں پھر زباں اُوپر بیاں خوبانِ نامی کا
اگر تجھ حسنِ کامل کی سنے تعریف مہ رویاں
تمام آ کر کریں اقرار اپنی ناتمامی کا

غزل ۱۰۸ صـ ۶۴ میں یہ شعر زائد ہے۔
تیرا غم جب سوں مجکوں یار ہوا		حال دل کا لیا ہے سُکھ نے لٹ
اس غزل میں مقطع سے پہلے کا شعر مخطوطہ میں نہیں اس کی جگہ یہ شعر ہے۔
عاشقی ہے بہا تِیا راجی		کشور ملک دل ہر اچٹ پٹ
غزل ۳۲ ضمیمہ صـ ۱۷، ۴ شعر، یہ پانچواں شعر مخطوطہ میں زائد ہے۔
آرسی کی طرف نہ دیکھو ہاں		نگہ مست کو زمام رکھو
غزل ۳۴۲ (صـ ۱۹۶ طبع سوم)
بس کہ ہے کام مجکوں ہجرت سوں		وصل سوں ہے ہمیشہ ناکانی
غزل ۳۶۴ (صـ ۱-۲۰۹) میں ۸ شعر کی ہے، مخطوطے میں مقطع سے پہلے

یہ نواں شعر زائد ہے۔

بسکہ ہوں تیری جدائی سوں ضعیف   آرسی دیتی نہیں ہے رُو مجھے

غزل نمبر ۲۶۲ (ص ۵۵ - ۱۵۴) میں ۱۵ اشعار ہیں، مخطوطہ میں ۱۶ ہیں اور ایک شعر زائد ہے۔

ملنا بجا نہیں ہے مخالف سوں ایک آن   اس بات کوں توں مان سجن... شباب میں

اس تان کون بجائے ربابی رباب میں   "   "

× × ×   عاشق ہوا ہے دل میرا سننے کوں راگ زار

× × ×   یک تان توں بجائے ربابی رباب میں

تصدیق طلب غزلیں

کلیاتِ ولی طبع سوم (انجمن ترقی اردو) کے ضمیمۂ اوّل (ص ۱ تا ۲۱) میں اہم غزلیں دی گئی ہیں جو صرف کسی ایک نسخے میں ملتی ہیں۔ اس لئے متن میں درج نہیں کی گئیں۔ بقول مرتب "اگر بعد کو ان کی تصدیق کسی دوسرے معتبر نسخے سے ہو گئی تو اصل کلیات میں شامل کر دی جائیں گی"۔

اس ضمیمہ میں دی ہوئی اہم غزلیات میں سے ۱۵ غزلیں مخطوطۂ زیر نظر میں پائی جاتی ہیں۔ جو ان کی تصدیق کرتی ہیں۔ یہاں ان غزلوں کے مطلعوں کے اولی مصرعے مع زائد اشعار اور مختلف اشعار کے پیش کئے جاتے ہیں

غزل نمبر ۱۲، ۵ شعر۔

ہوا ہوں سب ستی بالخیر ثالث الخ

علاماتِ دو رنگی دور کرنا   علامات دو رنگی دور کرنا

ولا بالقلب ہے بالخیر ثالث   ولا فی القلب شر بالخیر ثالث

سلامت گل کوں جب دیکھا ہمیشہ   ظفر بالقلب ہے بالخیر ثالث

(یہ شعر اس نسخہ میں نہیں ہے)

خداہنیں یو روا رکھتا وَلی بوجھ — خدایوں ہنیں روا رکھتا صنم تجھ
اکیلا ہو رہے بالخیر ثالث — " "
وَلی کے اس بچن پر ہے فصاحت — جہاں میں گرچہ ہے بالخیر ثالث
(یہ مقطع اس میں ہنیں ہے)

غزل نمبر ۱۳ :-
اشک جو پڑتے ہیں نت مجھ چشم سے جھر جھر سفید
یہ پوری غزل اس نسخہ میں موجود ہے۔

غزل نمبر ۱۴ :-
مجھے بعد از ہزاراں دل پری پیکر لکھا کاغذ۔

غزل نمبر ۱۶ (۵ شعر)
یو پنجہ ترے ہاتھ کا بیدار
ہے دستا مرے جی کتیں مثل مار — ڈسلا ہے میرے جیو کتیں مثل مار
چُبھا ہے مرے دل میں خار جنوں — چُبھا ہے میرے دل منے خار جیوں
یو چیرا ترا جعفری نوکدار — " "
(یہ شعر نہیں ہے) — یو شمشیر ابرو کیتی کھینچ کر
کمر میں تپنچا ترا دیکھ کر — کرے کہت تلک تو مجھے مار مار
ہوا ہے یو یک دل مرا چار چار — کمر کا ترا نیمچہ دیکھ کر

غزل نمبر ۱۷ (۷ شعر) — یہ پوری غزل اس نسخہ میں موجود ہے۔

غزل نمبر ۲۰ :- بغیر حق کے نہیں ہے مجھے کسی سوں آس۔ نہیں ہے حق کے بغیر از مجھے کسی سوں آس

گر پڑے انکھیاں میں میری اس کی صورت کی شعاع (۵ شعر)
یار جاتا ہے سفر کوں مجھ سوں رخصت ہو کے آج — " "
اے عزیزاں سخت ہے میرے اوپر روز وداع — اے عزیزاں میرے دل پر سخت ہے روز وداع

غزل نمبر ۲۵ :-

پڑیا ہے رشک سوں سورج رخِ سیّد معالی سوں

"   "

رہا ہے زرد ہو ہو چندر اس کے لب کی لالی سوں

رہا ہے زرد رو ہو چندر   الخ

خجل ہو میں دیکھ کر اس کے چمن میں غنچہ لب کوں

خجل ہو دیکھ کر اس کے چمن میں غنچہ لب کوں

چنبیلی کی ہری کلیاں ہر اک گلبن کی ڈالی سوں

چنبیلی کی پڑیاں گل گل کلیاں ہر ایک ڈالی سوں

چلے جب انجمن میں وہ یقیں ہے اس کے پاواں سے

چلے جب انجمن میں وہ یقیں ہے اپنے پانواں سوں

اٹھیں ہو ہو کے سب زندے عزیزاں نقش فانی سوں

"   "   "

کشش تل اسکے چہرے کی کہاں جرأت بشر کوں ہے

کشش کوں اوسکے چہرے کی کہا جرأت بشر کی ہے

عطارد جب ہوا حیراں اپس کی فکر عالی سوں

عطارد ہو رہیا حیراں اپس کی فکر عالی سوں

شب تاریک کوں جا گہ کہاں ہو اس کے گھر بہتر

پڑے جب جوکتیں چندنا یو اس مکھ کی اجالی سوں

(یہ شعر اس نسخہ میں نہیں ہے)

ہولے تاب پارہ نت تداں تھی سکھ نہیں اس میں

حرکت گوش میں دیکھا جدہاں وہ اسکی بالی سوں

(یہ شعر اس غزل میں نہیں ہے)

ہوا ہوں عاشقی کے ملک کا میں جب ستی صوبہ

" " "

پچلے معزول ہو بختاں میرے نس دن بحالی سوں

پچلے معزول ہو مجنوں میری نس دن بحالی سوں

(یہ شعر اس غزل میں نہیں ہے) — کہتے ہو فرس میں بہتر دیوان شعر پر مضموں
و لیکن بولنا دکھنی کہو ایسا ہلالی سوں

× × ×

ولی توں شعر اپنے کی نہ کر تعریف ہر کس کن

ہنسے گا تجھ پہ بے غایت گہر کرم (؟) کوئی خیالی سوں — ہنسے گا تجھ پہ بے غایت اگر کوئی کہے خیالی سوں

غزل نمبر ۲۶ :- مطلع ؎

دوست مت رکھ رقیب بد گو کوں (۵ شعر) (یہ غزل اس مخطوطہ میں موجود ہے)

کارِ عاشق تو راست بازی ہے — کارِ عشاق راست بازی ہے

گیسوئے تابدار عاشق کے — گیسوئے تابدار عاشق کا

دام ہیں میرے دل کے آہو کوں — دام ہے میرے دل کے آہو کوں

خونِ عاشق سوں شوخ چشم ولی — خونِ عشاق شوخ چشم ولی

غزل نمبر ۲۷ :- (۵ شعر) (مطابق مطبوعہ)

ہوا ہے رشک مہر و مشتری کوں۔

غزل نمبر ۲۸ :- (۵ شعر) (مستزاد کی صورت میں)

مطلع ؎ بے تاب کیا شوق نے مجھ دل کوں بدن میں۔

مت پوچھ کہ ہیں آپ سیں وحشت منیں آہو

" " " "

پھیلا ہے سحر گاہ جو اطراف ختن میں — پھیلا ہے اثر سحر کا اطرافِ ختن میں

رکھتا ہے سدا داغ محبت کا جگر پر

" "

اس عشق سیں کیا حال ہے مکھ دیکھ چمن میں — تجھ عشق سوں کیا حال ہے ٹک دیکھ چمن میں

فرہاد کے آنے ہی سدا روحِ صبا ہو — فرہاد کی آتی ہے سدا روح صبا ہو۔

مذکور ہے از بسکہ ولی میرے سخن میں

غزل نمبر ۳۲:۔ صاف دل کو اگر مدام رکھو، ۴ شعر، مخطوطہ میں ۵ شعر ہیں۔

غزل نمبر ۳۴:۔ رحم سوں مجھ طرف پیا آنکھ، (مطابق مطبوعہ)

غزل نمبر ۳۸:۔ معلوم نہیں کن نے میرے دل کوں لیا ہے۔ (مطابق مطبوعہ)

کلّیات طبع سوم (ضمیمہ ص۲۱ تا ص۲۳) میں ان غزلوں کے صرف مطلع دیئے گئے ہیں، جو کسی ایک نسخے میں ہیں موجودہ مخطوطہ میں مندرجہ ذیل مطلعوں والی غزلیں پائی جاتی ہیں۔

۱ ص۱۱، اس سیداں سوں یارو میرا سلام کہنا (دو شعر)

۲ ص۱۰، عشق میں آکے نا نکل جانا، ہوش اپنے سوں بلکہ ٹل جانا

۳ ص۱۳، بس ناز توں سکھلائیاں اس غمزۂ غمّاز کوں، (۸ شعر)

۴ ص۱۵، دلبرا دھر کوں تیرے کوثر نہ کہوں تو کیا کہوں (۸ شعر)

۵ ص۱۶، حسن کا تخت تجکوں میموں ہو جیو (۸ شعر)

۶ ص۲۸ تیرے خورشید مکھ اوپر عجب جھلکار دستا ہے (دو شعر)

ولی کے شاگرد اشرف کی بارہ غزلیں جو کلّیات طبع سوم میں شامل کی گئی ہیں اس مخطوطہ میں نہیں پائی جاتیں۔ اور سیّد محمد تقی کے لکھے ہوئے نسخہ میں بھی یہ غزلیں موجود نہیں ہیں، ان معتبر نسخوں میں ان غزلوں کی عدم موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے ان غزلوں کو اپنے دیوان میں شامل نہیں کیا۔

غزل نمبر ۲۴۵ (مطبوعہ کلّیات طبع ثالث ص۲۴۱) میں دو مطلعے اور دو مقطعے پائے جاتے ہیں، اشعار کی تعداد ۱۲ ہے اور ۲ شعر دوسرے نسخوں سے ذیلی حاشیہ میں دیئے گئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو غزلیں ہیں، چنانچہ اس مخطوطہ میں یہ دونوں غزلیں الگ الگ دی گئی ہیں۔ ایک ۵ شعر کی اور دوسری دس شعر کی ہے۔

پہلی غزل حسب ذیل ہے:۔

دشمن دیں کا دین دشمن ہے | راہزن کوں[1] چراغ روشن ہے
زشت[2] روئی ہے حسن اہل لباس | چین دامن کوں[3] زیب دامن ہے
پاک بازی ہیں دل کوں[4] عزت ہے | صافی درین آپ درسن ہے
باغ گل راستی کا ہے سرسبز | سرد گلشن میں حسن گلشن ہے[5]

اے ولی صاحب سخن کی زباں
بزم معنی کا شمع روشن ہے

ایک غزل جو کلیات کے پہلے اڈیشن (مرتبہ احسن مارہروی صـ ۲۹۱)
میں ۳۹۸ نمبر پر موجود ہے، بعد کے دونوں اڈیشنوں میں نہیں ہے، فہرست اختلاف نسخ کلیات مذکور صـ ۱۴۳ میں ایک نوٹ میں لکھا ہے کہ :۔
" غزل نمبر ۳۸۸ کسی نسخے میں نہیں ہے"، لیکن ۶ شعر کی یہ غزل اس مخطوطے میں پائی جاتی ہے جسمیں یہ شعر زائد ہے۔

آپ سیں و و ہوا ہے بیگانہ
عشق میں جس کوں اس سوں یاری ہے

یہ شعر اور اس کا مقطع طبع سوم (صـ ۲۶۴) میں فردیات کے تحت نمبر ۸۱
میں درج ہیں۔

کلیات مرتبہ احسن مارہروی میں بعض غزلیں ہیں جو اس مخطوطہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر طبع دوم و سوم میں شامل نہیں کی گئیں۔

۱۔ میں یو تجھ لب کوں قند لولیا ہوں الخ
۲۔ ترا قد یو رشک قیامت اچھو الخ

اختلافات نسخ

کلیات ولی کے مطبوعہ نسخوں میں کئی اختلافات

---

[1] نسخہ مطبوعہ میں "کا"، [2] ترش روئی، [3] زیب دامن کا۔
[4] دل کی لذت ہے، [5] مخطوطہ میں یہ شعر زائد ہے۔

نسخ پائے جاتے ہیں۔ اس مخطوطہ سے ان کی تصحیح میں بڑی مدد ملے گی چونکہ یہ ایک قدیم ترین نسخہ ہے اس لحاظ سے اس میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو دوسرے نسخوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کلّیات کے آیندہ اڈیشن کی ترتیب کے وقت اس نسخہ کو پیش نظر رکھا جائے یا ایک علیحدہ صحت نامہ تیار کیا جائے تو اس میں یہ نسخہ بہت کارآمد ہوسکتا ہے۔ کلّیات کی طبع سوم کے بعض اشعار میں جو اہم غلطیاں رہ گئی ہیں ان کے بالمقابل بقید صفحات اس نسخہ کے اختلافات پیش کئے جاتے ہیں۔

صفحات	سطر	اشعار	اختلافات مخطوطہ
۳	۶	اے آفتاب حسن ٹک یک توں چمن میں آ	.... ٹک سوں چمن میں آیا۔
〃	۹	کہ جس کی یک اشارت سوں الخ	کہ جس کے اک اشارے سوں ....
۶	۲	خونِ دل کوں کیا تھا میں نیں نوش	خون دل کوں کیا نیَن سوں نوش
۸	۷	جلتا ہوں درس میں اب حالت نہیں ہے مجھ میں	جلتا ہوں درس بن میں اب جاں نہیں ہے تن میں
۲۴	۱۲	کرنے دوانا کس مگر رہزن چلیا ایمان کا	کرنے دوانا کس کمر الخ
〃	۱۷	دکن میں تیرے سخن سن شوقی ہوئے تیرے ولی	.... نا شوق ہوئے اسکوں ولی
		جسکے لگیا ہے دل کے تئیں خوش شعر تجھ دیوان کا	〃 〃
۲۶	۱۷	پری رخ کوں اٹھا تا نیند سوں پرجانیں عاشق	.... برجا ہے ای زاہد
		عجب کچھ لطف رکھتا ہے زمانہ نیم خوابی کا	〃 〃
۲۵	۱۵	تجھ زلف کے تاراں میں	.... تاراں ہیں
۳۱	۴	نام تشنہ جیوں ہوتا ہے نسدن گلوگیر طلا	نام شہ ہوتا ہے جیوں نسدن ....
〃	۵	شکل تجھ بت کی جو مجھ دل میں منقش ہوئی ہے	.... دل میں ہوئی ہے منتقش
۴۲	۱۹	خال تیرے مکھ اوپر	یہ خال تیرے مکھ اوپر۔
۴۷	۹	میں اپنے نمط تن کوں لگایا ہوں الیس کے	.... گلایا ہوں الیس کے

صفحات	سطر	اشعار	اختلافات مخطوطہ
۴۷	۱۳	یو بات دتی دل کی سیاہی سوں لکھا ہوں	یو بات دتی نیں کی کیکی[1] سوں لکھا ہوں
		وہ نور نین حیف میرے پاس نہ آیا۔	" " " .
۴۸	۲۱	خجالت کی گرد انجھواں کے پانی سوں گلابی ہیں	...... گلائی ہیں[2]
"	۷	پتیا رانیں ترے کہے کا جیب حیران کرنا ہے	.... تو جیب حیران کرنا کیا
		جو من میں ہیچ ملنے کا تو پھر تکرار کرنا کیا	جو من میں نہیچ ملنے کا.....

۱۔ کیکی بمعنی آنکھ کی پتلی (گجراتی)، یہ لفظ "دل کی سیاسی" کے مقابلہ میں زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ۲۔ "گھلائی ہیں" یعنی میں نے گھلایا صحت نامہ میں اس کو "گلابی ہیں" لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

کلّیاتِ وَلی

طبع دوم پر ایک نظر

کلام ولی کی قدر و قیمت ولی ہماری زبان کا شاعرِ اعظم اور موجودہ اُردو شاعری کا باوا آدم ہے۔ اس کی ریختہ گوئی نے ہماری شاعری میں زبان اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس کو "بابائے ریختہ" کا جو لقب دیا گیا ہے وہ صحیح طور پر اس کا مستحق تھا۔ اس اعتبار سے اس کا کلام اُردو کے کلاسیکل ادب میں "سنگِ بنیاد" کی اہمیت رکھتا ہے کہ اسی کی بدولت اُردو کے مرکز شہر دہلی میں شاعروں کا ایک گروہ وجود میں آیا جس نے ولی کی اُٹھائی ہوئی بنیادوں پر اُردو شاعری کی دیواروں کو مستحکم کر دیا۔ لیکن باوجود اس اہمیت کے ولی کا دیوان مدتوں تک ناآشنائے طباعت رہا اور اگرچہ گزشتہ ایک صدی کے اندر اس کے تین چار اڈیشن ملک میں اور بیرونِ ملک شائع بھی ہوئے۔ مگر آج وہ اس قدر نایاب ہیں کہ ڈھونڈھے سے نہیں ملتے۔ آخر کار ہماری مرکزی انجمن ترقی اُردو نے آج سے تقریباً بیس سال پیشتر کلیاتِ ولی کا ایک تنقیدی اڈیشن شائع کیا تھا اور گزشتہ سال اس کا ایک دوسرا صحیح اور مہذب اڈیشن چھپوایا ہے جس پر سطورِ ذیل میں تبصرہ کرنا مقصود ہے۔

خود ولی کے زمانے میں اور اُن کی وفات کے بعد بھی برسوں تک

ان کا کلام نہایت ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا، اور ان کے دیوان کی بکثرت نقلیں کرکے ان کی اشاعت کی جاتی تھی۔ کلام ولی کی توسیع اشاعت اور عام مقبولیت، شعرائے اردو کے تذکروں کے بیانات اور دیوانِ ولی کے بے شمار مخطوطات سے ظاہر ہوتی ہے اور خود ولی کے اشعار بھی اس پر شاہد ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

یو شعر تیرے اے ولی مشہور ہیں آفاق میں
مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا

اور ؎

ولی تجھ طبع کے گلشن میں جو کوئی سیر کرتے ہیں
وہ تحفہ کر لجاتے ہیں گلِ اشعار ہر جانب

بقول مصحفی[1] ۲ سنہ جلوس محمد شاہی (۱۱۳۲ھ) میں جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو اس کے اشعار ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری ہو گئے اور شعرا بھی اس طرزِ سخن کی طرف مائل ہو کر اس کا تتبع کرنے لگے۔ آزاد کے قلم جوہر رقم نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"جب ولی کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذت نے زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انہی کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا"[2]

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۸۰ ، [2] آبِ حیات، ص ۹۲ طبع سیزدہم لاہور، ولی کے شعر ذیل سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی غزلیں مطربوں اور ارباب نشاط کو گانے کیلئے دیا کرتے ہوں گے۔

؎ شاید غزل ولی کی اس کوں لجا سناوے — اس واسطے بجا ہے مطرب سوں ساز کرنا۔

جمع و ترتیب دیوان

ولیؔ صرف ایک مرتبہ ۱۱۱۲ھ میں دہلی گئے تھے۔ اس وقت تک انہوں نے اپنا دیوان مرتّب نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ تذکروں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔ اپنے کلام کی تدوین کے متعلق انہوں نے مندرجہ ذیل شعر میں اشارہ کیا ہے۔

شاعروں میں اپس کا نام کیا
جب ولیؔ نے کیا تو دیوان جمع

اگرچہ یہ شعر اشرفؔ کے دیوان میں بھی اُسی کے تخلّص کے ساتھ پایا جاتا تاہم اس شعر کو ولیؔ ہی کا مان لیا جائے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولیؔ اپنی زندگی ہی میں اپنا دیوان مرتّب کر چکے تھے اور اس سبب سے شعرا میں ان کی شہرت بھی ہوئی تھی۔ بہرحال جمع و ترتیبِ دیوان کی تاریخ مقرر کرنا مشکل ہے۔ پھر بھی اتنا قیاس ہو سکتا ہے کہ ۱۱۱۲ھ میں ولیؔ کے سفر دہلی کے بعد اور ۱۱۱۹ھ میں ان کی وفات سے پہلے ان سات برسوں کے اندر دیوانِ ولیؔ مرتّب ہوا ہوگا۔ لیکن ایسے مشہور شاعر کے دیوان کا اس کی وفات کے ۱۴ سال کے بعد دہلی پہنچنا تعجب خیز امر ہے۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان کی وفات کے دوسرے ہی سال سے ان کے دیوان کی نقلیں ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ ۱۱۲۰ھ کا لکھا ہوا مخطوطہ دیوانِ ولیؔ اب تک موجود ہے[۱] اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طویل مدّت کے اثنا میں ان کے دیوان کی نقل و کتابت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ نسخہ دیوان ہے جو ۱۱۳۳ھ میں دہلی پہنچا تھا۔ اس کے ۵ سال بعد کا ایک نسخہ بھی موجود ہے اس کے کاتب کا نام نثار اللہ فانی تھا جس نے ۱۱۳۸ھ میں اس کو احمد آباد میں لکھا تھا[۲]۔ اس کے بعد کے بارہویں صدی کے نصف اوّل سے لیکر

---

[۱] یہ نسخہ نواب نصیر حسین خیالؔ مرحوم کے کتب خانے میں موجود ہے (مقدمہ کلیاتِ ولی، طبع اوّل، کا دیباچہ ص ۸) [۲] یہ مخطوطہ پروفیسر شیرانی کے پاس تھا اور اب غالباً پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

تیرہویں صدی کے آخر تک دیوانِ ولی کے بے شمار نسخے لکھے گئے ہیں۔ جن میں سے اکثر ہندوستان میں [1] اور بعض یورپ کے کتب خانوں [2] میں موجود ہیں۔

دیوانِ ولی کے مطبوعہ نسخے

مخطوطات دیوان ولی کی اس قدر کثرت کے باوجود تعجب ہوتا ہے کہ مدت دراز تک کلیاتِ ولی کا کوئی جامع اور تنقیدی اڈیشن نہیں چھپا تھا۔ سب سے پہلے فرنچ مستشرق گارساں دتاسی نے دیوانِ ولی کو اپنے جمع کیے ہوئے چند مخطوطات سے مقابلہ و تصحیح کے بعد مرتب کر کے ۱۸۳۳ء میں پیرس سے دو جلدوں میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کی جلد اوّل میں ۱۴۴ صفحات میں دیوان کا متن ہے اور ۲۰ صفحوں میں اس پر ایک مقدمہ [3] فرنچ زبان میں ہے، جس میں ولی کے حالات اور ان کی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ جلد ثانی میں ولی کے اشعار پر لغوی اور نحوی حواشی دیے گئے ہیں اور نسخوں کے اختلافات بتائے گئے ہیں۔ یہ مطبوعہ نسخہ بھی آج کل نایاب ہے۔ مستشرق مذکور نے دیوانِ ولی کی طرف سے ہماری بے اعتنائی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ہندوستانی دیوانوں میں ولی کا دیوان بہت مشہور رہا ہے۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ممالکِ مغربی و شمالی میں بہت کم پڑھا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ دکنی بولی میں ہے بلکہ اس لیے

۱؎ [illegible] دکن کے قلمی نسخے" یادگارِ ولی ص ۲۲۲ تا ص ۲۲۶، کلیاتِ ولی طبع اوّل و دوم کا دیباچہ۔ ۲؎ انڈیا آفس، برٹش میوزیم، اڈنبرا یونیورسٹی، اور گارساں دتاسی کے کتب خانوں کی فہرستیں دیکھو۔ ۳؎ اس مقدمے کا ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو یادگارِ ولی میں شائع ہو چکا ہے۔

کہ اس کا طرز پرانا ہے۔ سودا، میر درد، جرأت اور یقین کے کلام کا یہ حال نہیں جو اس کے مقابلے میں زیادہ جدید ہیں اور اب تک مقبول ہیں۔[1]

اس طرح نظمِ اردو کی یہ شاندار خدمت ایک غیر ملکی کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس کے تقریباً چالیس برس کے بعد دیوانِ ولی کا ایک مختصر اور ناقص اڈیشن ۱۲۹۰ھ میں سورت کے مشہور شاعر میاں سجھو کے ایک شاگرد محمد منظور متخلص بہ منظور کی تصحیح اور شیخ عبدالقادر وفا کی نقل و کتابت سے بمبئی سے شائع ہوا تھا وہ بھی آج ناپید ہے تقریباً اسی زمانے میں ۱۸۷۸ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ نے اس کا ایک اڈیشن چھاپا تھا، وہ بھی نہیں ملتا۔ آج سے کوئی سترہ برس پیشتر پونہ کے پروفیسر ابراہیم سایانی نے دیوانِ ولی کو غالباً بمبئی کے اڈیشن پر سے مع دیباچہ دہلی میں چھپوایا تھا۔ دیوان کے یہ تینوں اڈیشن ناقص اور نامکمل تھے جن کی ترتیب میں قدیم مخطوطات سے استفادہ نہیں کیا گیا تھا اور آخر الذکر دونوں اشاعتوں میں ولی کی زبان اور املا کو اس قدر بدل دیا گیا ہے کہ بقول احسن مرحوم "دورِ عالمگیری کے شاعر کو حکومتِ برطانیہ کے عہد کا شاعر بنا دیا ہے!"

کلیاتِ ولی طبع اوّل

اردو کے مشہور شاعر و ادیب مولوی محمد احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم نے کلیاتِ ولی کا ایک جامع، مبسوط اور تنقیدی اڈیشن مع مقدمہ و فرہنگ تیار کیا تھا جس کو انجمن ترقی اردو نے ۱۹۲۷ء میں شائع کیا تھا مرتب نے ولی کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام مختلف قدیم و جدید

---

[1] خطباتِ گارساں دتاسی ص ۱۴۳۔

مخطوطات اور بعض معتبر و غیر معتبر مجموعوں اور بیاضوں سے لے کر اس کلیات میں شامل کر دیا اور انجمن کے فاضل سکریٹری جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ولی کا کلام جو مرتب کو نہ مل سکا تھا اس کو اضافہ کر کے انجمن کے مخطوطات کے اختلافاتِ نسخ بتانے کے لئے دو مفصل ضمیمے بھی اس کے ساتھ شائع کئے، نیز بکثرت اغلاطِ طباعت کی تصحیح کے لئے ایک "غلط نامہ" بھی اُن کو آخر میں لگانا پڑا۔ مولوی صاحب موصوف نے اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا کچھ تو مرتب کا مبسوط مقدمہ اور طول طویل ضمیموں اور کچھ چھوٹی تقطیع پر دبیز کاغذ اور ٹائپ کی چھپائی کی وجہ سے کلیات کی ضخامت بہت بڑھ گئی۔ کلیاتِ ولی کی اس طبع اوّل کی ترتیب میں حضرت احسن مرحوم نے کافی محنت کی تھی اس کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ بایں ہمہ یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اس کلیات میں دوسرے شعراء کے اشعار بلکہ پوری غزلیں درج ہو گئی ہیں جن کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ نیز اس کے مقدمے میں انہوں نے کلام ولی پر تبصرہ کرتے ہوئے صفحے کے صفحے لکھ ڈالے ہیں جن کا بہت بڑا حصہ طولِ کلام، تکرارِ مضامین، حشو و زوائد اور عدمِ تناسب کی وجہ سے بالکل غیر ضروری اور نہایت ناموزوں ہو گیا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی "التماس" میں تحریر فرمایا ہے:

> "مقدمہ ضرورت سے زیادہ طویل تھا اور اس میں بعض غیر ضروری بحثیں آگئی تھیں جو خارج کرنی پڑیں۔"

لیکن اب بھی اس مقدمے میں کئی غیر ضروری اُمور باقی رہ گئے ہیں اس مقدمے میں ولی کے مختصر حالات سے بحث کی گئی ہے جس میں کئی اُمور محلِ نظر ہیں، خصوصاً ان کو دکنی ثابت کرنے کی کوشش، اسی طرح فرہنگ میں بھی کئی دکنی الفاظ کے معنی غلط لکھے ہیں۔ علاوہ

ازیں کئی ضروری الفاظ اس فرہنگ میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں اور اس طرح یہ فرہنگ ناقص رہ گئی ہے۔ کلّیات میں قدیم نسخوں کی موجودگی کے باوجود اختلافاتِ نسخ کا مقابلہ کرکے متن کی تصحیح کی کوشش نہ کرتے ہوئے کئی جگہ تصرّف و اجتہاد کرکے متعدد اشعار میں اصلاح دینے کی کوشش کی گئی ہے جہاں کہیں وَلی کے تخلّص والی غزلیں یا وَلی کے نام سے اشعار مل گئے ہیں ان کو بلاتحقیق درج کر دیا گیا ہے جن میں بڑا حصّہ الحاقی کلام کا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح املا و کتابتِ الفاظ میں بھی یکسانی کا لحاظ نہیں رکھا گیا، بعض جگہ غیر ضروری اور طویل الذّیل حواشی دیئے گئے ہیں۔ اس اشاعت کے بالاستیعاب تنقیدی مطالعے کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ غلط نامے میں دیئے ہوئے اغلاط کے علاوہ تقریباً دو سو سے زائد غلطیاں اس میں اب بھی موجود ہیں اور اختلافاتِ نسخ کا مقابلہ کرنے پر نظر آیا کہ تقریباً ایک ہزار اختلافاتِ نسخ کے مقابلے و تصحیح کی ضرورت ہے۔ ان مسامحات اور فروگزاشتوں کے پیشِ نظر طبع اوّل کئی وجوہ سے ناقص تھی۔ اس لحاظ سے کلّیاتِ وَلی کے ایک بہترین تنقیدی صحیح اور مکمل اڈیشن کی ضرورت تھی، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ طبع اوّل کے نسخے قریب الختم ہیں۔

کلّیاتِ وَلی طبع دوم

مقامِ مسرّت ہے کہ انجمن نے اس اہم ادبی ضرورت کو محسوس کرکے طبع اوّل کی تصحیح، ترمیم اور تلسیخ کا کام ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ) کے سپرد کیا، جنہوں نے بڑی دیدہ ریزی اور جاں فشانی سے اس کو ازسرِنو مرتّب کیا اور اس کے نقائص کو دور کرکے کلّیاتِ وَلی کا ایک جامع اور صحیح تنقیدی

اڈیشن تیار کر دیا جس کو انجمن نے گزشتہ سال ۱۹۴۵ء میں شائع کر دیا ہے۔ فاضل مرتب کی مساعی جمیلہ کا اعتراف نہ کرنا یقیناً ناانصافی ہوگی۔ اس لئے ان کی تحقیقی و تنقیدی کوششوں کی داد دیتے ہوئے ہم ان کا مختصر جائزہ لیتے ہیں اور ان کی مرتبہ کلیات کی خصوصیات کو بہ دفعاتِ ذیل عرض کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ طبع ثانی کاغذ، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے طبع اول کے مقابلے میں بہت پست ہے اور کسی طرح انجمن جیسے کل ہند ادارے کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ زمانے میں اچھے کاغذ کا ملنا دشوار ہے، لیکن کتابت اور طباعت تو خاطر خواہ ہو سکتی تھی اور اگر تھوڑی سی توجہ کی جاتی تو یہ "نقشِ ثانی"، گو اول سے بہتر نہ ہوتا تو "دیدہ زیب" ضرور ہو جاتا!

(۱) ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے اجمالِ مخل اور اطنابِ ممل سے پرہیز کرتے ہوئے مقدمے کو مناسب طریقے پر مختصر کر دیا ہے اور صرف ضروری امور پر اکتفا کیا ہے۔ دیباچے میں مزید مخطوطات اور دیگر ماخذ کا ذکر کر دیا ہے جن سے مقابلہ و تصحیح اشعار میں مدد لی گئی ہے۔ مزید براں دکنی کی زبان پر محققِ فاضل جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی کے قلم سے ایک محققانہ مقالہ بھی حاصل کر کے درج کر دیا ہے۔

(۲) مختلف قدیم مخطوطات اور بعض جدید دریافت شدہ نسخوں سے بعض غزلوں اور اشعار کا اضافہ کیا ہے اور ولی کے نام سے جو اشعار اور غزلیں کسی ایک آدھ نسخے میں ملی ہیں تو ان کو ایک علاحدہ ضمیمے میں درج کر دیا ہے تاکہ بعد میں ان کی تصدیق ہونے پر متن میں داخل کیا جا سکے۔

(۳) طبع اوّل کی تقریباً دو سو اغلاطِ کتابت و طباعت اور قریب آٹھ سو اختلافاتِ نسخ کا مقابلہ کر کے ان کی تصحیح کر دی ہے۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ طبع اوّل میں صرف آٹھ نسخوں سے اختلافاتِ نسخ کا مقابلہ کیا گیا تھا اور موجودہ اشاعت میں ۱۴ نسخے مرتّب کے پیشِ نظر تھے۔

(۴) بعض الحاقی غزلوں اور اشعار کو متن سے خارج کر دیا ہے۔ جو انجمن کے مخطوطات میں نہیں پائے جاتے۔

(۵) بعض غیر ضروری حواشی کو خارج کر دیا ہے۔ با طویل حاشیوں کو حسبِ ضرورت مختصر کر دیا ہے۔

(۶) قدیم املا دکتابت میں یکسانی قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۷) غزلوں کی ردیف وار ترتیب میں حرف ردی کے لحاظ سے حروفِ تہجی کی ترتیب پر غزلیات کو رکھا ہے اگرچہ بعض مخطوطات، دیوانِ دلی میں جو ہماری نظر سے گزرے ہیں یہ ترتیب نہیں پائی جاتی باایں ہمہ اس ترتیب میں بھی کہیں کہیں فرق ہو گیا ہے۔

(۸) طبع اوّل کی فرہنگ کو حسب قاعدہ ابتدا میں رکھنے کی بجائے آخر کتاب میں لگایا ہے اور اس کی بعض غلطیوں کی تصحیح کر کے مزید الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

ان خصوصیات کے لحاظ سے کلیاتِ طبع اوّل کے اکثر نقائص دور ہو گئے ہیں۔ باایں ہمہ اس میں اب بھی بعض خامیاں اور فروگزاشتیں ایسی باقی رہ گئی ہیں جن کو دور کرنے کے لیے گو فی الحال ایک تیسرے اڈیشن کی ضرورت نہ سمجھی جائے، تاہم ایک ضمیمے کی صورت میں ان کی تصحیح و تکمیل کی استدعا بیجا نہ ہوگی۔ مختصراً طبع ثانی کی فروگزاشتیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) مقدمے میں حالاتِ ولی کے سلسلے میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے کہ اب ولی کے اورنگ آبادی اور دکنی ہونے کا نظریہ بدل گیا ہے اور ان کی زندگی سے متعلق بعض قدیم معلومات کی تردید اور بعض جدید اطلاعات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح ولی کی زبان کے سلسلے میں بھی لسانی نقطۂ نظر سے کلامِ ولی کے گجراتی عنصر پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔[1]

(۲) بعض الحاقی اشعار اور غزلیں اب بھی کلیات میں موجود ہیں جن کی تصدیق نہ ہوسکے تو ان کو خارج کر دینا ضروری ہے۔ ان اشعار و غزلیات کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(۳) فرہنگ طبع اوّل میں سے کئی الفاظ خارج اور بعض الفاظ اضافہ کیے گئے ہیں۔ ان میں بعض الفاظ صحت طلب ہیں جن کی تصحیح کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) اگرچہ اختلافاتِ نسخ کی بہت بڑی حد تک تصحیح ہوچکی ہے پھر بھی کوئی ڈیڑھ سو سے زائد ایسے اختلافات موجود ہیں جو اب بھی تصحیح کے محتاج ہیں۔ ان کی فہرست مع اختلافاتِ نسخ یہاں دی جاتی ہے۔

(۵) کتابت و طباعت کی بہت سی غلطیاں اس اشاعت میں بھی رہ گئی ہیں جن کے لیے ایک صحت نامے کی ضرورت ہے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ مرتب صاحب نے ان کی تصحیح کے لیے ایک "صحت نامہ" تیار کرکے انجمن کو بغرضِ اشاعت بھیج دیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ہمارا مقالہ "ولی گجراتی"، مطبوعہ رسالہ "مصنف"، (سہ ماہی) علی گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۴۵ء۔

الحاقی کلام | ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کلیاتِ ولی طبع اول میں ولی کے نام سے دوسرے شعرا کا کلام بھی درج ہو گیا ہے اور مرتب نے خود بھی تسلیم کیا ہے کہ "ممکن ہے متعاقبین نے کسی اور قدیم شاعر کی کہی ہوئی غزلیں ولی کے دیوان میں شامل کر دی ہوں[1]" بلکہ انہوں نے تو یہ کلیہ قائم کر دیا تھا کہ "جس غزل میں طاق سے زیادہ اشعار ہیں ان میں ضرور الحاق ہوا ہے[2]" ہم نے طبع اول کے حواشی اور ضمیموں کے نوٹوں سے معلوم کیا ہے کہ کل ۲۴ غزلیں اس میں الحاقی ہیں، جن میں سے بارہ غزلیں ولی کے شاگرد اشرف گجراتی کے قلمی دیوان میں بھی موجود ہیں۔ پہلی بارہ غزلوں[3] میں سے دس غزلیں طبع ثانی میں شامل نہیں کی گئیں۔ تاہم دو غزلیں ان میں سے بحال رکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک نمبر ۳۲۴ (صفحہ ۱۹۵)، اور دوسری ضمیمے میں ۲۶ (صفحہ ۱۴) پر ہے۔ اول الذکر کی نسبت فٹ نوٹ میں لکھا ہے۔ "یہ غزل یہاں غلطی سے درج ہو گئی ابھی تصدیق طلب ہے۔" اور آخر الذکر پر یہ نوٹ دیا گیا ہے۔ "یہ صرف احسن مارہروی کے ذاتی نسخے میں ملتی ہے۔" علاوہ ازیں مخمس نمبر ۱۲۱۱، اور ۱۷ کی نسبت ص ۲۹۸ کے نوٹ میں لکھا ہے کہ "وہ ابھی تصدیق طلب ہیں۔" اسی طرح مستزاد نمبر ۲ و ۳ کے متعلق بھی صفحہ ۳۲۱ پر اسی طرح کا نوٹ دیا گیا ہے۔ (کلیاتِ ولی میں مندرجہ ذیل ۱۲ غزلیں ایسی ہیں جو اشرف کے

---

[1] کلیاتِ ولی، طبع اول ص ۵۹ کا نوٹ، [2] کلیات ص ۳۳ کا نوٹ۔

[3] نمبر ۳۰، ۱۴۸، ۱۶۵، ۱۸۰، ۲۳۷، ۲۷۷، ص ۱۹۶ کے حاشیے والی غزل، نمبر ۲۸۰، ۲۸۹، ۲۹۸، ۴۲۱، ۴۲۲،

قلمی دیوان میں بھی پائی جاتی ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ وہاں مقطع میں ولی کی بجائے اشرف کا تخلص ہے!

غزل نمبر		نوٹ
۱۱۳	شوخ ترکش دل رباہے الغیاث (ص ۶۱)	یہ غزل ن ۸ و ۱۰ میں ہے
۱۱۵	اے بلبل زباں تو نہ کرا ختیار بحث (ص ۶۲)	یہ غزل ن ۷ و ۸ میں ہے
۱۶۴	جب سوں وہ گل بدن ہے میرے پاس (ص ۹۸)	
۱۶۶	جب لگ ہے چمن بیچ بہارِ گل و نرگس (ص ۹۹)	” ن ۷ و ۸ میں ہے
۱۶۸	شوخ آتا نہیں ہزار افسوس (ص ۱۰۰)	” ن ۱۲ و ۱۳ میں ہے
۱۶۹	نہیں یہ خط مگر دِل لعل مے نوش (ص ۱۰۱)	
۱۷۳	مہر اوج حسن کی جھلکار کا ہوں میں حریص (ص ۱۰۳)	” ن ۷ و ۸ میں ہے
۱۷۴	خود بخود دِل نہیں ہوا ہے حریص (ص ۱۰۳)	
۱۷۸	گل زارِ حسنِ یار میں ہے سبزہ زار خط (ص ۱۰۶)	” ن ۷ و ۸ میں ہے
۱۸۲	یہی میں مانگتا ہوں رات اور دن تجھ سے یا حافظ (ص ۱۰۷)	
۱۸۳	دیکھ تو جمع عندلیبان جمع (ص ۱۰۹)	
۱۸۴	عشق کی آگ سوں جلی ہے شمع (ص ۱۰۹)	

اشرف کی بارہ غزلوں کے علاوہ تیرھویں غزل

ص ۱۰۸ ۱۶۷ع میں جب ستی دیکھا ہوں بہارِ گل و نرگس

اس غزل میں یہ شعر نہیں ہے ؎

نرگس نے کیا اس کے نین دیکھ زر ایثار
زر نقد دل اپنے کوں نثار گل و نرگس

اس کی جگہ دیوان اشرف میں یہ شعر ہے ؎

ہے مست کوئی چشم سیہ مست پیا کا
بخشا ہے اسے نشاء (نشہ) خمارِ گل و نرگس

ذیل میں ولی اور اشرف کے مقطعے بالمقابل درج کئے جاتے ہیں۔

	ولی	اشرف
۱	دام میں زلفِ کمند انداز کے آ ولی بے دل پھنسا ہے الغیاث	دام میں زلفِ کمند انداز کے مرغِ دل اشرف پھنسا ہے الغیاث
۲	بر جا ہے اسکوں ابنِ شیاطین کہوں اگر جگ میں جو کوئی کیا ہے ولی اختیار بحث	بر جا ہے اسکوں ابنِ شیاطین کہوں اگر اشرف کیا ہے جگ میں جو کوئی اختیار بحث
۳	اے ولی رات دن ہے دل میں میرے اس پری رُو کے دیکھنے کی آس	دل میں میرے ہے رات دن اشرف اس پری رُو کے دیکھنے کی ہلاس
۴	اس شوخ کی بیمار انکھاں دیکھ ولی توں خواہش ہے وطن بیچ بہارِ گل نرگس	اس شوخ کی بیمار انکھاں دیکھ آ اشرف خواہش ہے چمن بیچ بہارِ گل نرگس
۵	پیم نگری کی راہ غیر ولی کوئی پاتا نہیں ہزار افسوس	پیم نگری کی راہ اے اشرف کوئی بتاتا نہیں ہزار افسوس
۶	ولی کوں یاد تیری دم بہ دم ہے نہیں یک آن خاطر سوں فراموش	سدا ہے یاد تیری مجکوں اشرف نہیں کوئی آن خاطر سوں فراموش
۷	ہے حلاوت بخشِ ذوقِ دل ترا شیریں بچن اس سبب تیرے ولی اشعار کا ہوں میں حریص	ہے حلاوت بخشِ ذوقِ دل ترا شیریں بچن اس سبب اشرف ترے اشعار کا ہوں میں حریص
۸	کیوں نہ دوں نقد دل میں اپنا ولی نگہِ چشمِ دل ربا ہے حریص	کیوں نہ دوں نقدِ دل میں اے اشرف نگہِ چشمِ دل ربا ہے حریص
۹	دفتر میں خط کے چہرہ ولی کا بحال کر امیدوار مجکوں کیا روزگار خط	اشرف پیا کے دولتِ بوس و کنار سوں اُمیدوار مجکوں کیا روزگار خط
۱۰	ولی بس اعتقادِ صاف سوں کہتا ہے یہ ہر دم کہ اپنے حفظ میں رکھنا ہمیشہ مجکوں یا حافظ	یہی پھر پھر کہتا ہے اعتقادِ صاف سوں اشرف کہ اپنے حفظ میں محفوظ رکھنا مجکوں یا حافظ

اشرفؔ	ولیؔ
شاعروں میں آپس کے نام کیا	۱۱ ؎ شاعروں ہیں آپس کا نام کیا
جب سوں اشرفؔ کیا یو دیواں جمع	جب ولیؔ نے کیا یو دیواں جمع
کیوں نہ روشن ہو باغِ حسن اشرفؔ	۱۲ ؎ کیوں نہ روشن ہو بزمِ حسن ولیؔ
یار کے مکھ کے دہاں لگی ہے شمع	یار کے مکھ ستی ملی ہے شمع

یہ غزلیں دیوانِ ولیؔ کے قدیم نسخوں میں بھی پائی جاتی ہیں جیسا کہ طبع ثانی کے حواشی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے تعجب ہوتا ہے کہ اشرفؔ کے دیوان میں یہ کیسے داخل ہو گئیں۔ مقطعوں کے شعر صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ان پر تصرّف کیا گیا ہے۔ اشرفؔ ولیؔ کا شاگرد تھا، اس نے ولیؔ کے بعض اشعار تضمین کئے ہیں۔ اسی طرح ولیؔ نے بھی اس شعر میں اشرفؔ کا مصرع تضمیناً ہے۔

؎ اشرفؔ کا یہ مصراع ولیؔ مجھ کوں ہے دل چسپ
الفت ہے دل و جاں کوں میرے سیم نگر سوں

ولیؔ اُستاد ہے اس لئے یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ ولیؔ نے اشرفؔ کی غزلیں اپنے دیوان میں نقل کر لی ہوں گی۔ البتہ اشرفؔ سے بحیثیت شاگرد یہ امر بعید نہیں ہے، چنانچہ اپنے ایک شعر میں اشرفؔ خود بھی اس کا اقبال کرتا ہے۔

؎ ولیؔ نے یہ غزل اشرفؔ کرم سوں مجھ کوں بخشی ہے
سو اپنے نام سے اس کوں کیا جاری نہ کو پوچھو

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولیؔ اپنے شاگرد کو غزلیں لکھ دیا کرتے تھے۔ شاعری کی دنیا میں یہ بات کوئی نئی نہیں ہے، بلکہ شعرائے اردو میں تو بعض اساتذہ نے اپنے دیوان کے دیوان اپنے شاگردوں کو دے ڈالے ہیں اور انہوں نے ان کو اپنے نام سے شائع کیا ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اگر ولیؔ نے اپنی غزلیں اشرفؔ کو دے دی ہوں تو پھر ان کو اپنے دیوان میں کیوں درج کیا؟ بہت ممکن ہے کہ بعد میں ولیؔ کی

یہ غزلیں کسی کو دستیاب ہوئی ہوں اور اس نے ان کو دیوانِ ولی میں درج کر دیا ہو۔ اس امر کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ یہ غزلیات صرف ۲ مخطوطات میں پائی جاتی ہیں جن میں سے ایک البتہ ۱۷ سنہ جلوس محمد شاہی (۱۱۴۸ھ) کا لکھا ہوا ہے اور اس لحاظ سے قدیم کہا جا سکتا ہے اور دوسرا نسخہ ۱۲۲۹ھ کا مکتوبہ ہے لیکن ان میں بھی بعض غزلیں موجود نہیں ہیں۔ بمبئی کے مطبوعہ اڈیشن میں بھی غزلیاتِ مندرجۂ بالا میں سے نمبر ۱۷۸ کے سوا بقیہ غزلیات نہیں ہیں۔ اسی طرح اکثر مخطوطات میں بھی یہ غزلیں نہیں پائی جاتیں۔ دیوان ولی کے مخطوطات بکثرت پائے جاتے ہیں جو مختلف سنین کے لکھے ہوئے ہیں اور ان سب میں غزلیات اور اشعار کی تعداد بھی مختلف ہے۔ یعنی کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ اس لیے ایسا قیاس ہوتا ہے کہ ولی نے اپنا دیوان مرتب کرنے کے بعد بھی کچھ کلام لکھا ہے جو غالباً بعد کو ان کے دیوان کے بعض نسخوں میں درج کر دیا گیا ہے اور اس لئے دوسرے نسخوں میں اشعار و غزلیات کی تعداد میں کمی بیشی ہو گئی ہے ولی کی غزلیات یا اشعار کی تعداد کا ہمیں صحیح طور پر علم نہیں ہے۔ ان کی تعداد کے متعلق ہمارے پاس صرف شفیق کا بیان موجود ہے جس نے سب سے پہلی مرتبہ "کلیاتِ ولی" کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اشعار کی تعداد ۲۲۰۰ "دو ہزار دسی صد" (۹) بتائی ہے [1] غالباً یہاں "دو صد" کی بجائے "دسی صد" غلطی سے لکھ دیا گیا ہے۔ شفیق کے سوا کلام ولی کے مجموعے کو کسی نے "کلیات" سے موسوم نہیں کیا۔ دیوان کے بمبئی والے اڈیشن میں کل ۳۴۰ غزلیں ہیں اور پیرس کے اڈیشن میں ۳۹۷۔ کلیات طبع اوّل میں ۴۲۲ غزلیں ہیں جن کے کل اشعار ۲۸۶۲ ہوتے ہیں۔ اگر اس میں سے الحاقی غزلیات جو تعداد میں ۲۴ ہیں نکال دی جائیں تو یہ پیرس والے اڈیشن کی تعدادِ غزلیات کے برابر ہو جاتا ہے۔ علاوہ

---

[1] چمنستان شعراء صفحہ ۱۰۶۔

ازیں دیگر اصنافِ سخن اور ضمیمے میں جو اشعار ہیں ان سب کو ملا کر اشعار کی مجموعی تعداد ۳۰۷۵ تک پہنچتی ہے۔ تعدادِ غزلیات و اشعار کی اس نمایاں کمی بیشی کو دیکھتے ہوئے الحاقی اشعار کا پتا چلانا دشوار ہے۔

صفحہ ۳۲۵ نمبر ۸ پر بلغ العلیٰ بکمالہ کی تضمین ولی نے دو شعروں میں کی ہے، اس پر نوٹ میں لکھا ہے:

"یہ اشعار صرف ایک نسخے میں ملتے ہیں اس لئے ابھی تصدیق طلب ہیں، یہاں غلطی سے درج ہو گئے۔"

لیکن یہ اشعار شفیق نے اپنے تذکرۂ ولی میں نقل کئے ہیں[1]۔ ان سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

فردیات میں چھ فردیں دوسرے شعرا کی ہیں جو غلطی سے کلیات میں درج ہو گئی ہیں۔

(۱) صـ ۲۸۴ —
میں کہا تیرے بدن پر راکھ لگتی ہے بھلی
ہنس کہا جوگی لبسرلے خاک لگتی ہے بھلی

"جوگی پسر نے" کی بجائے "جوگی لبسر لے" غلط نقل ہوا ہے۔ یہ شعر عاشق برہان پوری کا ہے جو ولی کا ہمعصر تھا۔ چنانچہ شفیق نے اس کے تذکرے میں یہ شعر نقل کیا ہے[2]۔ عاشق ولی سے غالباً برہان پور میں ملا ہوگا چنانچہ اس نے اپنے ایک شعر میں ولی کا ذکر کیا ہے ؎

ولی سن یہ غزل عاشق کتیں کہتا اگر ہوتا
رہا کر سگ ہو تو دائم نبی کے آستانے کا

اس نے بعض غزلیں ولی کی زمینوں میں کہی ہیں۔

---

[1] چمنستانِ شعراء صـ ۱۱۰، صـ ۱۱۱، [2] ایضاً صـ ۴۴۳،
[3] تذکرہ اردو مخطوطات صـ ۱۶۱،

(۲) صفحہ ۲۸۴ فرد نمبر ۶۸ سے

اس ملاحت کے لون کی لذت
جس کا دل ہو کباب وہ جانے

یہ شعر شاہ فضل اللہ نقلی اورنگ آبادی کا ہے چنانچہ صاحب تحفتہ الشعرا نے اس کو ان کے تذکرے میں نقل کیا ہے[۱] وہاں یہ شعر اس طرح نقل ہوا ہے :-

تجھ ملاحت کے لون کی لذت
جس کا دل ہو کباب سو جانے

(۳) صفحہ ۲۸۴ فرد نمبر ۶۹ سے

اپنی انکھیاں کو ٹک نگاہ کرو
آج مخمور ہیں پیا کیا ہے

یہ شعر معتبر خاں عمر کا ہے جس کی نسبت گردیزی اور شفیق نے لکھا ہے کہ "از تربیت کردہ ہائے ولی دکنی است" [۲]

(۴) صفحہ ۲۸۵ فرد نمبر ۷۱ سے

جب نقش اس صنم کا نقاش کھینچتا ہے
بازو کے کھینچنے میں وہ ہات کھینچتا ہے

یہ شعر بھی عاشق برہانپوری کا ہے۔ شفیق نے مصرعۂ ثانی میں "کھینچتا ہے" کی بجائے "اینچتا ہے" لکھا ہے [۳]۔

---

[۱] چمنستانِ شعرا، صفحہ ۴۸۴ ۔ [۲] تذکرۂ ریختہ گویاں، صفحہ ۱۱۶، صفحہ ۱۱۷، چمنستانِ شعرا صفحہ ۴۳۵، ان دونوں تذکروں میں مصرعۂ اولیٰ اس طرح پر ہے ع
اپنی آنکھوں اُپر نگاہ کرو ۔ [۳] چمنستانِ شعرا، صفحہ ۴۴۳ ۔

(۵) صـ ۲۸۷ فرد نمبر ۹ سے

دیکھ کر پانو کی تری مہندی
مجکوں تلووں سے آگ لاگی ہے

یہ شعر شاہ فضل الدین فضلی کا ہے اور شفیق نے ان کے تذکرے میں نقل کیا ہے ۱۔

(۶) صـ ۲۸۷ فرد نمبر ۹۱ سے

یار کوں دیکھ میں ہوا قربان
اس تجارت میں مجکوں دارا ہے

یہ شعر عاشق برہانپوری کا ہے اور شفیق نے ان کے تذکرے میں نقل کیا ہے ۲۔

ان اشعار کے علاوہ اشعار ذیل بھی الحاقی معلوم ہوتے ہیں اور قدیم مخطوطات سے تصدیق کے محتاج ہیں۔

(۱) صـ ۷ غزل نمبر ۱۱ شعر نمبر ۵ سے

رکھا ہے تار تار کیا اس کے شوق میں
ہر دم خیال باندھ کے اس کی نین میں جا

(۲) صـ ۷ غزل نمبر ۱۱ شعر نمبر ۶ سے

جو دیکھتے رقیب اسی حال کوں تمام
دن رین جلتے رہتے وہ دوزخ اگن میں جا

ان پر یہ نوٹ درج ہے:۔ "انجمن کے کسی نسخے میں شعر ۵ - ۶ نہیں ہیں"

(۳) صـ ۲۶ غزل نمبر ۵۸ کا مقطع سے

ہنس کے تجھ خط کو دیکھ بولے ولی
چاند ہے متھ کا ہے گا بد ہالا

۱۔ چمنستان شعرا صـ ۲۸۴ اور گل عجائب صـ ۱۲۳ ، ۲۔ چمنستانِ شعرا صـ ۲۴۴ ،

اس پر نوٹ ۳ میں لکھا ہے :

" یہ مقطع (۱) ۸ سے لیا گیا ہے لیکن ولی کا نہیں معلوم ہوتا۔"

(۴) ص ۱۱۶ غزل نمبر ۱۹۲ شعر نمبر ۲ ۔

ہے گرم رقصِ شوق سُنیں مونسِ فلک
بولا ہوں جب سے نغمۂ عشاق ہیں ملک

اس پر کوئی نوٹ نہیں دیا گیا ۔ لیکن طبع اوّل ضمیمہ نمبر ۳ ص ۳۷ کے حاشیے میں یہ نوٹ ہے :

غزل نمبر ۱۶۵ کسی نسخے میں نہیں ہے اور غزل ۱۶۶ ن ۶ ، ۷ میں ہے دوسرا مطلع ان میں بھی نہیں ہے ۔"

فرہنگ

طبع اوّل کی طرح اس اڈیشن میں بھی ۲۰ صفحوں کی ایک فرہنگ آخرِ کتاب میں دی گئی ہے ۔ اس کے شروع میں دو صفحوں میں اشعارِ ولی کی کتابت اور املا کی نسبت بعض ضروری ہدایات ہیں ۔ فرہنگ میں ہندی اور دکنی الفاظ کے علاوہ وہ عربی فارسی الفاظ بھی دیئے گئے ہیں جن کا املا بدل گیا ہے یا جو بجائے ساکن کے متحرّک اور بجائے متحرّک کے ساکن باندھے گئے ہیں ۔ بعض کتابوں کے نام بھی اس میں آگئے ہیں جن کا ذکر ولی نے اشعار میں تشبیہً کیا ہے ۔ کئی الفاظ کے معنی صرف طبع اوّل سے نقل کر لئے گئے ہیں، جن میں سے اکثر غلط ہیں ۔ کلامِ ولی میں متعدد الفاظ و محاوراتِ گجراتی ایسے ہیں جو اس فرہنگ میں نہیں پائے جاتے ۔ اس لحاظ سے یہ فرہنگ ناقص معلوم ہوتی ہے ۔

فرہنگ کی غلطیاں حسبِ ذیل ہیں جن کی تصحیح بالمقابل درج ہے ۔

غلط	صحیح
آل ۔ ہندی بھاشا، گیلاپن، گیلا	یہ گجراتی لفظ આલ ہے جس کے

صحیح	غلط
معنی آنچ کے ہیں ولی ع کہ آلِ نبی پر نہ آوے گی آل۔	
فرہنگ نگار کو دھوکا ہوا ہے اور انہوں نے ادھار لکھ کر اہار کے معنی بیان کئے ہیں حال آنکہ یہ دونوں جداگانہ لفظ ہیں اور جداگانہ معنی رکھتے ہیں۔	آدھار، ادھار۔ غذا۔
یہ اُتڑ نہیں ہے بلکہ انیڑ ہے جس کو غلطی سے اُتّڑ پڑھ لیا گیا ہے جیسا کہ طبع اوّل کے ضمیمے میں ہے۔	اُتڑنا۔ ایک چیز پر دوسری رکھنا۔
جس شعر میں یہ لفظ آیا ہے وہ فعل کے ساتھ ہے یعنی اٹکنا، اٹک لینا، پھر دوسرے مخطوطات میں اس کی بجائے ہٹک لینا آیا ہے۔ یعنی باندھ لینا۔ ع جو لٹ کوں دیکھے ولی اٹک کر سجن نیں اس کوں ہٹک لیا ہے	اٹک۔ جگہ۔ مقام
یہ بُتا نہیں بتا ہے بمعنی بٹہ (رسل کا) جس کو گجرات میں بتا اور بتی بھی کہتے ہیں۔	بُتا۔ (ف۔ بوتہ) سونا چاندی گلانے کی گھریا۔
ایک جگہ یہ دزن کے معنی میں بھی آیا ہے۔	بھار۔ باہر
اصل میں یہ پانا، بانا اور بھانا سے ہے۔ بمعنی رکھنا، ڈالنا، گردن میں طوق بھاکر یا باکر بمعنی طوق ڈال کر۔	بھاکر۔ انداز سے جھکا کر
یہ لفظ کلیات میں صرف ایک جگہ آیا ہے اور اس کا اختلاف قرآۃ "ایتی" بتایا گیا	بتی۔ بغیر تشدید بتّی

صحیح	غلط
گیا ہے۔۔بتی ہندی میں بات کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع بتیاں ہے۔	
بیحاس ایک ہندی راگ کا نام۔	بھبھاس۔ایک راگنی کا نام۔
فراق زدہ۔اصل میں بہ تلفظِ گجراتی विजोगी اور سنسکرت वियोगी	بجوہی۔ ؟
اصل میں یہ سنسکرت لفظ विस्तार ہے۔اس کے معنی تفصیل، وسعت اور پہنائی کے ہیں۔	بستار۔ سازوسامان طول کلامی، دفتر۔
گجراتی میں پور کے معنی سیلاب کے ہیں۔ اور اسی معنی میں ولی نے استعمال کیا ہے۔ جیسے ندی کا پور یعنی سیلاب۔	پُور۔ پُر (دریا کا) بھرپور ہونا۔
جوش، غضب۔	جھال۔ جَل
یہ لفظ کلّیات میں کہیں نہیں نظر آیا البتہ جالا جلایا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔	جھالا ؟
جلال، رعب اور تابش۔	جھلجھلاٹ۔غصّہ غیظ و غضب کا اثر چمک دمک۔
غم و غصہ، کوفت۔	جھانجھ۔بے خودی، بے تابی۔
ولی نے ایک شعر میں معشوق کی بیتِ ابرو کو رعایتِ لفظی کی بنا پر نسخۂ حُسامی سے تشبیہہ دی ہے جو فقہ کی مشہور کتاب ہے یہ نام مصنف نے اپنے نام حُسام الدین پر رکھا ہے۔	حُسامی۔تلوار والا اور ایک کتاب کا نام۔

غلط	صحیح
دَسن۔ دانت۔	بعض نسخوں میں دنتن یا دتن کی تصحیف دَسن آئی ہے۔ چنانچہ اسی فرہنگ میں دنتن کو دَسن کی تصحیف بتایا گیا ہے جو غلط ہے۔
دیول۔ (دیو کی جگہ) مندر۔	اصل میں یہ سنسکرت देवालय یعنی دیوآلے کی خرابی ہے۔ وَلی نے اس کو صرف معبد کے معنوں میں استعمال کیا ہے، جیسے "دیولِ چین"
دھرم دھاری۔ ایمان والا نیک متّقی۔	متقشف، پابندِ مذہب (آرتھوڈوکس) دھرم چاری کے معنی مذہبی خیال کا آدمی۔
رام کلی۔ ایک راگنی کا نام۔	ایک ہندی راگنی۔
رج۔ خاک، جذباتِ شہوانی پیدا کرنے والی قوت، جذبہ، جوش،	اس کے معنی عموماً خاک اور گرد و غبار کے آتے ہیں۔ نہیں معلوم یہ دوسرے معنی کہاں سے پیدا کئے گئے ہیں؟ یہاں وَلی نے اس کو تمیز اور سوجھ سمجھ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ (دیکھو فرہنگِ نصرتی) ع رکھا ہے عشق میں بس پائے رج کر۔
سال۔ کانٹا، چھید، زخم، گھاؤ۔	ہندی میں اس کے معنی کانٹا اور چھید کے ہیں۔ لیکن زخم اور گھاؤ صرف قیاساً لکھ دیئے ہیں۔ گجرات کی اُردو میں ایک چیز کسی دوسری چیز میں سوراخ کرکے بٹھائی جائے تو اس کو سال کہتے ہیں۔ چنانچہ "سینے کا سال" محاورۃً بولا جاتا ہے۔
سُبل۔ خوش گفتار۔	اس لفظ کے یہ معنی کہیں نہیں آئے بلکہ یہ

غلط	صحیح
	سنبل یا سنبھل کی تعریف ہے۔ ع جگ میں مسیحا تجھے جیب سنبھل بولنا۔ یعنی زبان سنبھال کے بولنا۔
سُرچنا۔ پھیلانا۔	اصل میں یہ سنسکرت لفظ رچنا ہے اور اس میں سو لگا کر سُو رچنا بھی کہتے ہیں۔ ان دونوں کے معنوں میں بھی فرق ہے۔ رچنا کے معنی صرف بنانے، پیدا کرنے کے ہیں اور سُورچنا بمعنی بہترین ایجاد و تخلیق کے ہیں۔ اس لئے "پھیلانا" غلط ہے۔ ولی کے شعر میں بھی یہ معنی نہیں پائے جاتے۔ ع تج تجہ عذار دیکھ کے سُرجا ہے رنگِ گل
سڑک۔ کتنے کی جھڑپ یا وار۔	ہر تیز دھار والے اوزار سے کسی چیز کو کاٹنے میں جو آواز سرسراہٹ کی نکلتی ہے اس کو سڑک کہتے ہیں۔
سروالا۔ مغرور، گھمنڈی۔	یہاں "سروالا" کے معنی سانپ کے آئے ہیں۔ ع موت میں پیچ کھاتے سروالا۔ سانپ سر کچلے جانے کے باوجود پیچ و تاب کھاتا ہے۔ ولی نے رقیب کے اینٹھنے کو اس سے تشبیہ دی ہے۔
شمسیہ۔ منطق کا ایک رسالہ۔	نجم الدین عمر القزوینی معروف بہ الکاتبی نے منطق پر عربی میں یہ رسالہ لکھا ہے مگر ولی نے اس کی شرح کا ذکر کیا ہے

صحیح	غلط
قطب الدّین رازی اور تفتازانی نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔	
ریشم اور زری سے جو کپڑا بُنا جاتا ہے۔ اس کو طاسی نہیں طاس کہتے ہیں، یائے نسبت لگا کر "لباس طاسی" کہا گیا ہے۔	طاسی۔ ایک ریشمی کپڑا۔
بڑی چھری کو گجرات میں کاتا کہتے ہیں۔ غالباً یہ اسی کا مخفف کتّا ہے چھوٹی چھری کو کاتی اور کاتیاں بولتے ہیں۔ ایک قسم کی شمشیر کو بھی کتّی کہتے ہیں۔	کتا۔ تلوار جلّاد کی۔
اصل میں یہ گجراتی لفظ ہے سہاگنوں کے لئے جو کنگن بنوائے جاتے ہیں ان پر کریلے کے سے نقش و نگار ہوتے ہیں۔ یہ کنگن یا ہاتھوں کے کڑے سہاگ کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔	کریلا دھار۔ دکن میں چوٹی کی ایک خاص وضع (کریلا ایک آتش بازی جس میں سے آگ کے پھولوں کی دھار نکلتی ہے۔ مجازاً چوٹی)
اصل میں یہ گج کری چوڑا ہے یعنی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چوڑی جو دلہنوں کو پہناتے ہیں۔ دیوانِ ولی کے اکثر مخطوطات میں یہ لفظ "چوڑا" ہی آیا ہے۔	گج گری کا جوڑا۔ جوڑے کی ایک دلّی وضع۔
اصل میں یہ مکھ پاٹھ ہے یعنی ازبر کیا ہوا سبق۔ بعض مخطوطات میں بھی "مکھ پاٹھ" ہی لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ ہمارے نسخے میں "مکپاٹ" ہے۔	مکھ پات۔ منہ کے سامنے۔

غلط	صحیح
مطلع الانوار۔ ایک فارسی کتاب ہے شاہ عبدالحق محدث دہلوی مولف "اخبار الاخبار" کی۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کے حالات ہیں۔	یہ منطق اور حکمت کی مشہور درسی کتاب ہے جس کے مصنف سراج الدین محمد دالاُرموی ہیں۔ یہ حکمتِ اشراق میں ہے۔ چنانچہ ولی کا شعر بھی اسی کا مؤید ہے۔ ؎ اے صبح تجلوں نئیں خبر اس مطلعِ انوار کی ہر چند عالم گیر ہے تو حکمتِ اشراق کی اصل میں اس کتاب کا نام 'مطالع الانوار' ہے۔
وارڑم۔ غالباً دکنی زبان میں انار کو کہتے ہیں۔	یہ واو سے نہیں بلکہ ڈ سے ڈارڑم ہے گجرات اور مہاراشٹر میں انار کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اس فرہنگ میں کئی ضروری الفاظ درج ہونے سے رہ گئے ہیں، ان میں مندرجہ ذیل الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں :

اُدھر۔ معلّق، (اصل سنسکرت بہ معنی ہونٹ) گجرات میں عموماً بولتے ہیں۔

اَڑکا ہوا۔ پھنسا ہوا، رکا ہوا۔

اَڑ۔ ضد، ہٹ۔

اطول۔ قزوینی کی تلخیص المفتاح، کی شرح از ابنِ عرب شاہ فن معانی و بیان میں۔

اوجھل۔ گھونگھٹ، پردہ (گجراتی)

بالا۔ بہانہ (اردو : ٹالے بالے بتانا) ؏

کیوں تو دیتا ہے اب مجھے بالا۔

بھال۔ نوکِ سناں یا پیکانِ تیر۔

بے حال۔ خراب و خستہ

پٹکا۔ کمر میں باندھنے کا لمبا رومال یا کمربند (گجراتی)۔
تان لینا۔ کھینچ لینا (گجراتی)
چل بچل۔ جھولنے والا، تتلی (گجراتی)
چونا۔ ٹپکنا۔
حجاز۔ ایک عربی راگ کا نام منسوب بہ ملکِ حجاز۔
خال خال۔ کہیں کہیں، تھوڑا تھوڑا۔
دامی۔ دام میں آنے والا۔ ع مت ہو ہر دیدہ باز کا دامی۔
دھاوا۔ حملہ۔
رنگِ خزانی۔ زرد رنگ۔
سکی۔ سلائی (مرہٹی)
شاستر۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں۔
عراق } ایک عربی راگ کا نام منسوب بہ عراق۔
عشاق }
فند۔ مکروفریب۔
قطبی۔ منطق کی مشہور درسی کتاب 'شمسیہ' کی شرح از قطب الدین رازی۔
کر۔ ٹیکس، محصول، (گجراتی) ع
دل کی رعیت سے لے کر چوتھا کیا ہے دام دام۔
کسمل۔ کسی، کسبن کی خرابی۔
گن بھری۔ بہ ہمہ صفت موصوف (عورت)
گھانا، گھانی۔ کولھو (گجراتی)
لٹ۔ بالوں کی لڑ۔
لٹ پٹی۔ پگڑی کی صفت، اِدھر اُدھر لٹکی ہوئی بےپیچ کشادہ پگڑی۔
لڑاہنا۔ جھلانا، ہلانا (ہاتھ کا) (گجراتی)

مُلک ۔ للک ۔ للکار کر گانا (گجراتی)
مطوّل ۔ علامہ تفتازانی کی شرح تلخیص المفتاح فن معانی و بیان میں درسی کتاب۔
مختصر ۔ کتاب مختصر المعانی تلخیص المفتاح قزوینی کی شرح مختصر از علامہ تفتازانی۔
مناہی ۔ ممانعت (گجراتی)
مَنہل ۔ اس نام کی کئی عربی کتابیں ہیں غالباً یہ منطق کی کوئی کتاب ہے۔
مُہرِ بادامی ۔ بادام کی شکل کی مہر کا غذات پر لگانے کی۔
ہٹ چھٹا ۔ پھکیت، جس کا وار خالی نہ جائے۔
ہنسلی ۔ گلے میں پہننے کا ایک چاندی یا سونے کا زیور۔ اکثر بچوں یا نوجوانوں کو پہنایا جاتا ہے۔ (گجراتی)

علاوہ ازیں کلیات میں بعض الفاظ ایسے بھی ملتے ہیں جن کو ولی نے اپنے مخصوص املا یا متعیّن مفہوم کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ایسے لفظوں کو ان کے محلِ استعمال کے ساتھ ہم یہاں درج کرتے ہیں:

اِمداد کرنا ، بخشنا ، سرفراز کرنا۔ ع اہل گلشن پہ ترے قد نے جب اِمداد کیا۔
بستگی ۔ جمعیتِ خاطر۔ ع بستگی ہے خال سوں خوباں کے داغِ زندگی۔
ع تجھ لب کی شیرنی سوں ہوئی دِل کوں وابستگی
بند ۔ قید ۔ مقیّد ع تری انکھیاں کے ڈورے کا ہوا ہوں بند اے ظالم!
تغافلی ۔ تغافل ع نہ کر تغافلی اے مصرِ حُسن کے یوسف۔
چٹ بہ جاٹ ع جب سوں تجھ مکھ کی مجھ لگی ہے چٹ۔
ٹھاٹھ ۔ تیاری، آمادگی۔ ع تجھ نین دیکھنے کوں دل ٹھاٹھ کر چکا تھا۔
حسبِ ظاہر ۔ ظاہراً ، بہ ظاہر ے مجھ پہ ولی ہمیشہ دلدار مہرباں ہے
ہر چند حسبِ ظاہر طنّاز ہے سراپا
حقوق ۔ بجائے حق۔ ے تیرے لب کا حقوق ہے مجھ پر
کیوں بھلا دوں تیں دل سے حقِ نمک

خلّی۔ خلل انداز (رقیب کے لئے) ع
مت راہ دے خلوت منیں ایسے خلّی کوں

دَغلی۔ جھوٹا، فریبی (رقیب) ہرگز تو نہ دے راہ رقیبِ دغلی کوں

درکار۔ حاجت، ضرورت ع کر خرچ اگر درکار ہے اطلس تجھے سنجاب کوں

رُبابی۔ رباب بجانے والا ع اس تان کوں بجاوے رُبابی رباب میں۔

زرد رو۔ ناکام، سرخ رو کے مقابلے میں۔ ع
زرد رو ہے جو کیا ہے فکرِ تسخیر طلا۔

سَفَری۔ سفر کرنے والا، مسافر ع ہم دانہ وہم آب ملا اس سفری کوں

سالم۔ تن درست، صحیح ع کبھو سالم کبھی بیمار ہیں ہم۔

طومار۔ مسل، دفتری مراسلہ ع اس سحر کے طومار کوں پڑ کون سکے گا۔

قدم بوس۔ قدمبوسی ہری دیکھ تجھ مکھ کی جھلکار کوں
قدم بوس کرنے کوں آوے چلی

کنارے۔ برکنار، دور ع تجھ رخ سوں جب کنارے صبح نقاب ہووے
("صبح نقاب" ترکیب اضافی مقلوبی "نقاب صبح")

لباسی۔ نمائشی اے وائے جو لباس تن پہ رکھا
عاشقاں کے نزدیک لباسی ہے

لجانا (کسی کو) خجل کرنا۔ ع چلنے سے اے چنچل ہاتھی کوں لجاوے توں

مسند نشین۔ مستقل، ایک جگہ پر قائم رہنے والا
وحشی نگہ کوں ہرگز مسند نشیں نہ پاوے
محروم صید سوں ہے ہر آن شیرِ قالی

منتقش۔ نقش ہے شکل تجھ بت کی جو مجھ دل میں ہوئی ہے منتقش
ہے سمندر کی نمط آتش میں تصویر طلا

نگار۔ نقش و نگار۔ ع حنا سوں اس کے اُپر چھڑ نہ کر نگار سجن۔

اختلافاتِ نسخ

کلیاتِ ولی کی اشاعتِ ثانی میں اگرچہ اختلافاتِ نسخ کی بڑی حد تک تصحیح ہو چکی ہے۔ تاہم طبعِ اوّل کے ضمیمہ نمبر۲ کو دیکھتے ہوئے کئی اختلافاتِ قرأۃ ایسے ہیں جن کی تصحیح کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ انجمن کے نسخوں کے علاوہ ہم نے اپنے مخطوطے سے بھی ان اختلافات کی تصحیح میں مدد لی ہے۔ دیوانِ ولی کا یہ نسخہ اگرچہ اوّل آخر سے ایک دو ورق کم ہونے کے لحاظ سے ناقص ہے۔ تاہم وہ اکثر اختلافاتِ نسخ میں صحیح معلوم ہوتا ہے اس کی تحریر کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس لئے بارہویں صدی کے اوائل میں گجرات میں لکھا گیا ہوگا۔ جہاں ہم نے اس کا حوالہ دیا ہے وہاں "ہمارا مخطوطہ" لکھ دیا ہے اُس سے مراد یہی نسخہ ہے۔

نمبر صفحات	نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
ص۱	ع ۵/۲	مراد	مداد سے تجھ مکھ کے صفحے پہ نقطۂ خیال سرمایۂ ہر مداد دستا
ص۷	ع ۱۲/۵	کہنکر	بیگی (طبع اوّل کے ضمیمے میں ہنگی غلط ہے)
ص۱۲	ع ۲۳/۳	موسوم یک نقطہ	مجروح دل کوں میرے نازوادا سوں اپنے موہوم یک نقطہ (ن ۱ تا ۲) نقطہ پڑھنے سے وزن بھی ٹوٹتا ہے۔
ص۱۳	ع ۲۵/۱	دیکھیں	دیکھے (ن ۱ ، ۵)
ص۱۳	ع ۲۵/۱	نگھر گھٹ	ضمیمہ ۲ طبع اوّل میں مگر گھٹ یا کمر کھٹ دیا ہے غالباً یہ گجراتی لفظ نکر کھٹ ہے یعنی تن تنہا، واحد جس کے آگے پیچھے

نمبر صفحات، نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
		کوئی نہ ہو ع مجھ گھر میں اے نکھر کھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا۔
ص ۱۹ ع ۳۴/۴	بیم	پیم ع یاں پیم کے دریا میں گرداں ہے کشتیٔ عقل۔
ص ۱۴ ع ۲۵/۲	مکھ بات	پات (ن ۱ و ۳ تا ۵، ۷) پاٹھ ن ۶، ہمارے مخطوطے میں مکھ پاٹ ہے۔ صحیح لفظ مکھ پاٹھ ہے یعنی منہ پر یاد کیا ہوا سبق ع مکھ پاٹھ بولتا ہوں شکوہ تری کینہ کا۔
ص ۳۶ ع ۵۸/۱۰	مندمالا	منڈمالا ؎ سر عشاق سب اکٹھے کر ہاتھ میں لے چلا ہے منڈ مالا
ص ۳۸ ع ۶۰/۱۲	دل میں منقش ہوئی ہے	دل میں منقش ہو رہی (ن ۶)
ص ۳۹ ع ۶۴/۳	ادھکا ہوا ہے غم ترا؟	اڑکا ہوا ہے غم ترا
ص ۳۹ ع ۶۲/۵	خاکِ قدم تمھارا سے	خاکِ قدم تمھارا سے (بھارے وزن)
ص ۳۹ ع ۶۳/۳	جسوقت سوں تجھ قد کے تئیں لائے ہیں شاعر فکر۔	ع جسوقت سوں تجھ قد کے تئیں لایا ہے شاعر دُرِ فکر (مخطوطۂ حبیب گنج)
ص ۱ ع (۹)	اس تے نبل بولنا۔	اس تھیں نبل (ن ۱، ۴، ۶، ۷)
ص ۴۸ ع ۸۱/۳	مجھ سے دکھ بھرے۔	مجھ سی دکھ بھری ع تو مجھ سی دکھ بھری سے پھر جھٹا اقرار کرنا کیا۔
ص ۳۷ ع ۵۹/۱۰	پیچ	پینچ ع موت میں پینچ کھاٹے سر دالا (سانپ)
ص ۴۹ ع ۸۲/۲	آدھار	آہار (کھانا) ع جو بھوجن دکھ کا کرتے ہیں اسے آدھار کرنا کیا۔

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر غلط صحیح

ص ۴۸ ع ۸۱/۲ نگارا پوچھ یک کر۔ نکارا تو نجھ تک تک کر۔ غالباً یہاں
نکارنا بمعنی انکار کرنا گجراتی لفظ معلوم ہوتا
ہے۔ یعنی تونے خاموش ہوکر تکتے رہنے
سے اپنا انکار ظاہر کردیا)

ص ۴۹ ع ۔ ڈہیلے جو جیو سوں دوہیلے (دُکھی) ہمارا مخطوطہ ۶
دوہیلے جیو سوں جو بیزار اسے سنگھار کرنا کیا۔
دوہیلا (گجراتی) بمعنی مشکل کٹھن، دوہیلا جیو۔
سخت خانی۔

ص ۴۹ ع ۸۲/۴ خجالت کی گرد انجھواں کے پانی سوں گلابی ہیں ـــــ ملا کر (مخطوطہ حبیب گنج)

ص ۵۵ ع ۹۵/۵ گا ڑسٹ کا ڑسٹ (ن آتا ۷) ۶
یو شعر سُن دل سوں دلّی خطہ گھر کا کا ڑسٹ

ص ۴۹ ع ۸۲/۱ پرت کی جو کنٹھا پہنے ۶ جو کنٹھا برہ کی پہنے اسے گھر بار کرنا کیا۔
(مخطوطہ حبیب گنج)

ص ۵۰ ع ۸۴/۲ آپس کے گھر میں کاسی۔ آپس کے گھر منیں کاسی (کاشی بنارس)

ص ۵۲ ع ۸۷/۲ دل وحشی زدہ دلِ وحشت زدہ (مخطوطہ حبیب گنج،
معارف، نمبر ۳ جلد ۵۶ ص ۱۱۳)

ص ۵۸ ع ۹۷/۹ ودنازا ُٹھا جو نازا تھا (ہمارا مخطوطہ) ۶
سرتا قدم جو نازا تھا وہ غضب عجیب

ص ۵۳ ع ۹۰/۳ ماہی دل کا شکا۔ ۶ ماہی دِل شکار کرنے کوں۔

ص ۶۶ ع ۱۰۹/۱ کیا سب کھٹ گیا سب گھٹ۔

ص ۷۴ ع ۱۲۱/۵ سخت دِل سنگ دل (ضمیمہ ن ۶، ۷، ہمارا مخطوطہ)

ص ۷۶ ع ۱۲۳/۲ زار زار وحدت۔ راز دارِ وحدت (آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم)

نمبر صفحات نمبر غزل وشعر　غلط　صحیح

ص ۸۵ ع ۱۴۰/۲　مقبول　مقتول — ترے گل زارِ رنگین کا جو کئی مقتول ہے اے گل !
وہ اپنے خون میں جیوں گُل غرق ہے خونین کفن بھتر

ص ۸۶ ع ۱۴۲/۵　سُنے اس کوں یقین اٹھ　ع سُنے تب (ن ۳، ۴) اس کوں جان و دل سوں
(ن ۱تا ۷) حسّان عجم آکر۔ (ہمارا مخطوطہ)

ص ۷۶ ع ۱۲۳/۲　التفائے قدح　ابتغائے قدح (خواہش) یہ لفظ بامعنی اور زیادہ
صحیح معلوم ہوتا ہے اور غالباً التفا ابتغا کی تصحیف ہے،

ص ۷۷ ع ۱۲۴/۲　اپس کے مکھ پہ نہ کر زلف کوں اتا گستاخ۔　اپس کی دونوں زلف کوں نہ کر اِتا گستاخ۔
(مخطوطہ حبیب گنج)

ص ۷۷ ع ۱۲۴/۵　ولی کے دل میں ہے، شوخی سوں تجھ بھواں کی اِتی ——　ع
ولی کے دِل میں ہے شوخی سوں تجھ لباں کی بَتی (ن ۴)
بتی بمعنی بات۔ جمع بتیاں۔ کلّیات کا مصرع بالکل مہمل
معلوم ہوتا ہے۔ ن ۴ کو لیا جائے تو بامعنی ہوجاتا ہے۔

ص ۹۷ ع ۱۶۱/۸　جانُ جاتا ہے۔　جان جاتی ہے (ضمیمہ ن ۱، ۴ ہمارا مخطوطہ) ولی نے
جان کو کہیں مذکر نہیں باندھا۔

ص ۹۸ ع ۱۶۴/۲　دیکھا جو　جو دیکھا (ن ۶، ۷، ہمارا مخطوطہ)

ص ۹۸ ع ۱۶۴/۳　کھول چھاتی ہو اپنے سینے کوں —　ے کیوں چھپاتی ہے اپنے سینے کوں
دل میں آتا ہے مجھ کا کچھ وسواس
(دیوان اشرف) متن کا مصرعہ مہمل سا ہے "کھول
چھاتی" غالباً "کیوں چھپاتی" کی تصحیف ہے۔

ص ۹۸ م　تیری اداسی　تجکوں اداس — دیکھ تجکوں اداس آج اناں
دل میرا تجھ ستی ہوا ہے اداس
(دیوان اشرف)

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر — غلط — صحیح

ص۹۹ ع ۱۶۶/۵ — وطن بیچ — جو من بیچ (ضمیمہ ن ۲، ۳، اور دیوان اشرف) ع
خواہش ہے جو من بیچ بہارِ گل و نرگس

ص۱۰۱ ع ۱۶۹/۲ — بہ روزِ حشر سیں کیا باک اسکوں — ع خمارِ حشر سیں کیا باک اس کوں
ہوا خورشیدِ محشر جس کا ہم دوش — جو تیرے شوق کی مے سوں ہے مدہوش
متن کے نوٹ میں ایک نسخہ دیوان کا شعر اسی
طرح ہے۔ نیز دیوانِ اشرف میں بھی یہی ہے
اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیئے کہ پھر چھٹے
شعر میں ع ہوا خورشیدِ محشر ساتھ/سایہ ہم دوش،
بہ ادنا تغیّر موجود ہے۔

ص۱۰۰ ع ۱۶۸/۴ — وہ سجن ناز سوں بھلی باتاں۔ — نوٹ میں "بھلی باتاں" کی جگہ "کسی کی ماں"
لکھا ہے دیوانِ اشرف میں یہ مصرع اسطرح
ہے۔ ع وہ سخن ناشنو سخن میرا

ص۱۰۱ ع ۱۶۹/۶ — سایہ ہم دوش — ساتھ ہم دوش

ص۱۰۱ ع ۱۶۹/۴ — ع ترے جلوے سوں ہے گلِ تازہ و تر — یہ مصرع ن ۲، ۳ اور اشرف کی
غزل میں نہیں ہے۔ ان نسخوں اور اشرف کی غزل
میں یہ مصرع اس طرح پر ہے ع
ترے باج اے گلِ رشکِ چمن ہے
چمن میں بلبلاں کا ہر طرف جوش

ص۱۰۱ ع ۱۶۹ — ولی کوں یاد تیری دم بدم ہے۔ — ع سدا ہیگی ولی کوں یاد تیری (ن ۲، ۳)
اشرف نے اس مصرع کو یوں بدلا ہے ع
سدا ہے یاد تیری مجکوں اشرف۔ اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ ۲، ۳ کا اختلافِ

نمبر صفحات	نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
			قرأت صحیح ہے۔
ص ۱۰۲	ع ۱۷۲/۲	اچھے کا	اچھے گا (رہے گا) حق کے نزدیک اچھے گا۔ سودی خاص الخاص۔
ص ۱۰۳	ع ۱۷۴/۱	بوسۂ یار نے	ع بوسہ دے یار نے کیا ہے حریص۔ (دیوانِ اشرف)
ص ۱۰۵	ع ۱۷۴/۵	یک پلک آپ سوں جدا نہ کرے	ایک تِل الخ (اشرف) مصرعۂ ثانی مین خال کی رعایت سے تِل زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ خال تیرے کا دِل اِتلہے حریص۔
ص ۱۰۸	ع ۱۸۲/۵	ع وَلی بس اعتقادِ صاف سوں کہتا ہے یہ ہر دم	ع وَلی پھر پھر کہتا ہے اعتقادِ صاف سوں ہر دم (نؔ ۲، ۳، اور دیوان اشرف) مقطع کے اس مصرع میں اشرفؔ نے اپنا تخلص لفظ "ہر دم" کی جگہ پر اشرف رکھ دیا ہے ع کہ اپنے حفظ میں محفوظ رکھنا مجکوں یا حافظ۔ بی مصرع مطلع میں بھی وَلی نے لکھا ہے۔ اس لئے پھر پھر کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔
ص ۱۰۹	ع ۱۸۴/۳	جب سوں ہیگی دھیان ہیں تیرے یک قدم کہیں نہیں چلی ہے شمع	جب سوں ہے محو دھیان ہیں تیرے یک قدم کہیں نہیں ہلی ہے شمع (دیوان اشرف)
ص ۱۱۱	ع ۱۸۶/۳	کھلے دیکھ تجھ لب کوں آبِ حیات	کھلے دیکھ تجھ لب، کا آبِ حیات کرے یک نظر گر تو، شکر طرف (ن ۱۱ اور ہمارا مخطوطہ)

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر   غلط   صحیح

صـ۱۱۱ ع ۱۸۷/۱ پھرتے ہیں تیرے عشق میں مجنوں ہو یاراں ہر طرف —
گرتے ہیں تیرے برہ کے یکسر پو گاراں ہر طرف۔   ہے

پھرتے ہیں تیرے عشق میں مجنوں ہو یاراں ہر طرف
کرتے ہیں تیرے برہ کی یکسر پوکاراں ہر طرف
نوٹ ۲ میں پو بہ معنی پیہ اور گاراں بہ معنی
اولے لکھے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتے
یکسر اور ہر طرف کے بعد پو کی ضرورت نہیں رہتی۔
اور نہ یہاں اولے برسنے کا کوئی موقع و محل ہے
بلکہ اس معنی کے لحاظ سے مصرعۂ اولیٰ کا ربط
مصرعۂ ثانی کے ساتھ نہیں رہتا۔ یہ غزل صرف
ایک نسخے میں پائی گئی ہے اس لئے ضمیمے میں
رکھنی چاہیئے۔

صـ۱۱۹ ع ۱۹۹/۴   رخ پہ   رخ کوں (ن آ تا ۵ اور ہمارا مخطوطہ) ع
پہنچا ہے جا کے رخ کوں صنم کے بہ رنگ خال۔

صـ۱۱۶ ع ۱۹۲/۲   کلک   للک (للکار کر) ع
بولا ہوں جب سے نغمۂ عشاق میں للک۔
(اس پرنٹ میں جو نوٹ دیا گیا ہے وہ غلط
ہے) اشرف سے
میرے دل کتیں لے گیا تان اشرف
اداسوں للک کر وہ جب تان گایا

صـ۱۲۰ ع ۲۰۱/۸ کہ آل نبیؐ پر نہ آوے وبال۔ ع کہ آل نبیؐ پر نہ آوے گی آل ۔ آل
گجراتی لفظ ہے بہ معنی آنچ، گزند، کسی نسخے میں

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
		اس کا اختلاف موجود نہیں ہے۔ طبع اوّل میں صرف نوٹ میں "وبال" لکھ دیا گیا ہے۔
ص۱۱۷ ۱۹۵/۲	ع حُسن کے لینے کوں آئے ہیں یو استقبال ہال —	ع حُسن کے لینے کو یو آئے ہیں استقبال بال۔ (ن ۲ تا ۴، ۶، ۷ اور ہمارا مخطوطہ)
ص۱۱۸ ۱۹۶/۱	ع لب پہ دل بر کے جلوہ گر ہے جو خال۔	ع لبِ دل بر پہ جلوہ گر ہے خال۔ (ن ۳، ۵، ۷، اور ہمارا مخطوطہ)
ص۱۲۰ ۲۰۱/۳	ع موہا سرو نے گرچہ قمری کا دِل۔	طبع اوّل میں "لیا" ہے اور نوٹ میں "میا" موہا تیا سا لکھا گیا ہے لیکن موہ، موہن، اور موہ لینے کے سوا لفظ موہ کے مشتقات کلام ولیؔ میں نظر نہیں آتے۔
ص۱۲۰ ۲۰۱/۷	تیرا مثال۔	تیری مثال (ن ۱ تا ۵ اور ہمارا مخطوطہ) ع نہ دیکھا ہے آئینہ تیری مثال
ص۱۲۲ ۲۰۶/۱	ریزش	لرزش ع لرزش میں تجھ جفا سوں ہے مثل ستارہ دل۔ لرزش زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔
ص۱۲۳ ۲۰۵/۳	دِسے تجھ حُسن کے دریا پہ جوں موج — ع اگر رخسار پر چھوڑے تو کاکل۔	اگر رخسار پر چھوٹے یو تل (ن ۱ تا ۶ ہمارا مخطوطہ)
ص۱۲۴ ۲۰۸/۷	— جوں رنگ و بوے مے سوں ہے الخ —	جو رنگ و بوسے مے کی ہے الخ (ن ۱، ۳ تا ۵)
ص۱۲۵ ۲۱۰/۴	ع پھر نقش کا ٹرنا سوان کوں ہوا ہے مشکل۔	اٹکل ن ۱، اڈکل ن ۵، ۷، ہمارا مخطوطہ مشکل ن ۲ تا ۴ قافیے کا حرف روی مفتوح ہے اس لحاظ سے مشکل صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر غلط	صحیح
	جبکہ ن ۱، ۵، ۷، اور ہمارے مخطوطے میں اٹکل اور راڈکل ہے اس لئے اڈکل صحیح معلوم ہوتا ہے جس کے معنی غالباً شکل کے ہیں۔
ص۱۲۵ ع ۲۱۰ اس غزل کا چھٹا شعر۔	ع ہر جنس کا معمّا بوجھا گیا ہے لیکن۔ طبع اوّل ضمیمہ ع ۲ ص۸۷ کے نوٹ کے مطابق یہ شعر کسی نسخے میں نہیں ہے۔ اس پر یہاں متن میں کوئی نوٹ نہیں دیا گیا۔ ہمارے مخطوطے میں یہ شعر موجود ہے۔
ص۱۲۶ ع ۲۱۱/۴ دیکھیں گے بھر گھر بھر نظر۔	دیکھیں گے گر بھر کر نظر (ہمارا مخطوطہ)
ص۱۲۶ ع ۲۱۱/۷ ع دل کی رعیت سوں لیکر چوکھا کیا ہے دام دام ــــ	لے کر دکر بہ معنی ٹیکس) مطلب یہ ہے کہ دل کی رعیت سے ٹیکس وصول کرکے پائی پائی کا حساب چکا دیا۔ ہمارا مخطوطہ ع دل کی رعیت سوں جتا چکھیا ہے دام دام
ص۱۲۶ ع ۲۱۱/۱ ع تجھ حسن کے دیوان سوں پائے ہیں کئی احکام رام ــــ	ع پائے ہیں کئی حکّام کام (ن ۱، ۵، ۷)
ص۱۲۸ ۲۱۵/۴ جس کوں دیکھے سوں۔	جس کے دیکھے سوں (ن ۲)
ص۱۲۸ ع ۲۱۶/۲ ہے پری	ع ہے تری چشم جبھری کی قسم۔ انجمن کے ۸ نسخوں میں سے کسی نسخے میں "پری" نہیں ہے۔ اگر کسی اور نسخے میں ہو تو نوٹ دینا چاہیئے تھا۔
ص۱۳۲ ع ۲۲۲/۷ پیر فلک۔	پیر فلک (ہمارا مخطوطہ) انجمن کے نسخوں میں

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
		"تیرِ فلک" ہے مصرعۂ ثانی میں آسمان کا ذکر ہے اس لئے مصرعۂ اولی میں طبع اوّل کے مطابق "شیرِ فلک" (برج اسد) ٹھیک معلوم ہوتا ہے ؎ تیری نگہ کے تیر سوں زخمی ہوا شیرِ فلک تیری بھواں کے سہم سوں خم ہے کمانِ آسماں
ص۱۳۴ غ ۲۲۴/۵	تجلّی ہے شہِ شاہاں	تجلّاے شہِ شاہاں (ن ۳، ۴، اور ہمارا مخطوطہ) ع سو اس قلعے منیں دیکھو تجلائے شہِ شاہاں
ص۱۳۴ غ ۲۲۵/۲	جیوں مکھ ترا یو دیکھ کر	؎ جب سوں ترا مکھ دیکھ کر معشوق شب عاشق ہوئے تب سوں تو ملکِ حسن میں ہے بادشاہِ عاشقاں
ص۱۳۶ غ ۲۲۸/۴	بوجھتا ہے یوں۔	بوجھتا ہوں میں۔ (ہمارا مخطوطہ)
ص۱۳۶ غ ۲۲۸/۴	پھرتیاں ہوں۔	پھرتیاں ہیں۔ (ن ۱، ۵، ہمارا مخطوطہ) ؎ ترے بن رات دِن پھرتیاں ہیں بَن بَن کشن کے مانند اپس کے مکھ اُپر رکھ کر نگہ کی یا نسلی انکھیاں
ص۱۳۷ غ ۲۲۹/۳	قرر۔	قرآن ؎ قرآن کب ہو میسر ترا اے زہرہ جبیں ہر ایک آن ہے مجھ حق میں سو قرن تجھ بن۔ (ہمارا مخطوطہ، حبیب گنج)
ص۱۳۷ غ ۲۲۹/۷	ولی یہ دل کی حقیقت۔	ولی کے دِل کی حقیقت (ن ۱ تا ۷) ع ولی کے دل کی حقیقت بیان کیوں کے کروں
ص۔ غ۔	ع گرہ ہوا ہے زباں پر میری سخن تجھ بن۔	ع گرہ ہوا ہے زبان پر میری بچن تجھ بن۔ (ن ۱، ۳ تا ۵، ۷)
ص۱۴۵ غ ۲۴۲/۵	مجکوں گماں ہے۔	مجکوں ہے دل چسپ (ہمارا مخطوطہ اور

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر غلط	صحیح
	چمنستان شعرا ص ۳۵) گمان ہے بہ معنی پسند آیا ہے۔ (گجراتی)
ص ۱۴۵ ع ۲۴۳/۴ یک تل نہیں آرام	یک پل۔ ن ۱ تا ۳ میں یک تل ہے۔ لیکن یہاں طبع اوّل کا "یک پل" زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔
ص ۱۴۷ ع ۲۴۶/۴ نازکی لٹک	نازکی کٹک (لشکر فوج) سے اس وقت ہوشِ عاشق ثابت قدم ہو کیونکر سلطانِ حُسن آدے جب نازکی کٹک سوں (ن ۱، ۳ تا ۶، ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۴۵ ع ۲۴۳/۵ تب شعر مرا	یو شعر مرا (ن ۱، ۵ تا ۷، ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۴۷ ع ۲۴۷/۴ سخن اوپر	سخن گو پر ع سخن میرا ہوا ہے تب سے بالا ہر سخن گو پر۔ (ن ۱، ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۴۹ ع ۲۵۱/۲ تری جانب	میری جانب سے شب غم روزِ عشرت سوں بدل ہووے اگر دیکھے میری جانب وہ مہر ذرّہ پر در مہربانی سوں
ص ۱۵۰ ع ۲۵۲/۴ کیا قدر پوچھے	کیا قدر بوجھے۔
ص ۱۵۲ ع ۲۵۶/۵ طبع کے صافی کی	طبع کی صافی کی
ص ۱۵۲ ع ۲۵۵/۵ ہر استخواں سینے کے ہیں	سینے کا ہے (ن ۱، ۲)
ص ۱۵۲ ع ۲۵۵/۶ چھوڑاں ہے تب سوں بلبلاں عشق گلِ گل زار کوں	چھوڑیا ہے (ن ۵، ۶، ہمارا مخطوطہ) چھوڑے ہیں (ن ۲ تا ۴) عشقِ گل و گل زار کوں۔ (ہمارا مخطوطہ)

ص ۱۵۳ ع ۲۵۸/۵ ع کمر سوں نئیں جدا ہوتی کمر اس شوخ چنچل کی۔

نمبر صفحات	نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
			ع کمر سوں نئیں جدا ہوتی نظر اس شوخ چنچل کی. (ن ۱ تا ۵، ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۵۷	۲۶۵/۵	پلکاں کی قلم کوں الخ	؎ پلکاں کی قلم کر اپس آنجھو سے لکھا ہوں
ص ۱۵۷	۲۶۶/۱	مشرق و مغرب	وسعتِ منزل ؎ تجھ عشق میں دیکھا ہے یہ دل وسعتِ منزل (ن ۳، ۵، ۷)
ص ۱۵۸	۲۶۷/۷	کس سوں	کس کن ع کس کن و ئی آپس کا احوال جا کہوں میں (ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۵۸	۲۶۹/۱	آب زنگ	آب و رنگ.
ص ۱۵۹	۲۷۰/۴	سُننے کی تاب	سُننے کا تاب (ن ۱، ۵ تا ۷ اور ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۵۹	۲۷۰/۹	تری بھواں کی رتبۂ عالی کوں الخ	ع تری بھواں کے رتبۂ عالی پہ کر نظر (ن ۲ تا ۴)
ص ۱۵۹	۲۷۰/۴	حسنِ شعلہ زار	حسنِ شعلہ بار (بمبئی اڈیشن) حسن کی صفت شعلہ بار زیادہ صحیح ہے۔
ص ۱۵۹	۲۷۰/۱۲	ع اس تان کوں بجا آ ربابی رباب میں —	ع اس تان کوں بجادے ربابی رباب میں۔ (ن ۲، ۴، ۵، ۷) یہاں بجاوے بمعنی بجاتا ہے۔
ص ۱۶۰	۲۷۰/۱۵	اس کوں	اس میں ع ہرگز نہیں ہے خشت سوں فرق اس میں آدمی (ن ۱ تا ۴)
ص ۱۶۰	۲۷۱/۱	اگر کے باغ میں	اکرم کے باغ میں (ن ۱ تا ۵، ۷، ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۶۱	۲۷۲/۵	رات دن دو	رات دلیس ع رہتا رات دلیس اسی کے فراق میں (ن ۱ تا ۶)

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
		ہمارا مخطوطہ) دِیس گجراتی لفظ دِیوس کا مخفف
ص ۱۶۱ ع ۲۷۳/۴	یہ ائے ہیں	یو آیا ہے ؎ اے دل عقیقِ لب کا یو آیا ہے مشتری موتی نہ بوجھ زہرہ جبیں کے بلاق میں (ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۶۱ ع ۲۷۳/۲	جلتا ہوں رات دن میں پیا تجھ فراق میں ؎	آبِ حیات وصل سوں سینے کوں سرد کر جلتا ہے رات دِیس پیا تجھ فراق میں
ص ۱۶۱ ع ۲۷۴/۲	پھرتا ہے ہر سہر گھرو لے	پھرتا ہے گھر گھر و لے (ن ۲ تا ۴)
ص ۱۶۲ ع ۲۷۶/۲	رہے	اُہے ع تری زلفاں کے حلقے میں اُہے یوں نقش رخ روشن
ص ۱۶۳ ع ۲۷۶/۵	آشنائی سوں۔	آشنابی سوں زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے (دیکھو طبع اوّل کا ضمیمہ)
ص ۱۶۳ ع ۲۷۶/۵	ہو ویں	سو ویں ع کہ جیوں بادام کے دو مغز سو ویں یک نہالی میں۔ یک نہالی پر جو نوٹ ہے وہ اُڑ گیا ہے۔
ص ۱۶۴ ع ۲۸۰/۱	رکھیں نا (ن ۱)	نہ راکھے ن ۴۔ رکھیں نا نہی کا صیغہ ہے اور یہاں مضارع کی ضرورت ہے۔
ص ۱۶۴ ع ۲۸۰/۲	بیٹھا ہے سخن۔	بٹھلائے سخن ؎ خط کے تبئیں رحل زمرّد مکھ کوں تیرے اہلِ فضل مُصحفِ گُل بول کر کُرسی پہ بٹھلائے سخن
ص ۱۷۲ ع ۲۹۳/۱	گلے سوں	سِنے سوں ع ہر دن کوں عید بوجھ سِنے سوں لگا کرو (ن ۲، ۷ ہمارا مخطوطہ)
ص ۱۷۴ ع ۲۹۹/۶	رقیباں کوں	رقیباں کا ع کر رقیباں کا روسیاہ کرو

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر غلط صحیح

(ن ۱ تا ۴، ۶، ۷، ہمارا مخطوطہ)

صـ ۱۷۱ ع ۲۹۰/۳ ترے قدستی ہے عیدِ عاشقاں — تیرے قدسوں ہے نت عیدِ عاشقاں

(ن ۱، ۳، ۶، ہمارا مخطوطہ)

صـ ۱۷۱ ع ۲۹۲/۲ بخشے ہیں اس کسو سوں سنگھار الخ ع بخشے ہیں اس کے منہ سوں سنگھار آرسی کتیں۔

(ہمارا مخطوطہ)

صـ ۱۸۳ ع ۳۱۳/۴ آپس ستی — آلس ستی۔ سستی سے گجراتی میں آلس موڑنا انگڑائی لینے کو کہتے ہیں ۔

سینے سوں لگانے کی ہوئی دل کوں امنگ تازی
آلس ستی جب تجھ میں خمیازہ ہوا تازہ

(ن ۲، ۳، ۶)

صـ ۱۸۳ ع ۳۱۳ اندازہ — آوازہ (ن ۲ تا ۴)

صـ ۱۹۰ ع ۳۲۴/۱ دارالحرب کی شوخی۔ دارالضرب کی شوخی دونوں بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم "دارالضرب" معشوق کے لبِ لعلیں کی مناسبت سے صحیح تشبیہ معلوم ہوتی ہے۔ دارالحرب کی شوخی یعنی چہ؟

صـ ۱۹۰ ع ۳۲۴/۵ ستی ہے — سٹی ہے ع تجھ لب آگے سٹی ہے پستے کوں پست کر کر

صـ ۱۹۱ (ع ۶/۹) گیسوئے پائے دار — گیسوئے تاب دار۔ گیسو کی صفت پائے دار کہیں نہیں آئی۔

صـ ۲۰۴ ع ۳۴۷/۲ باہر یک رقم نکلے — بھاہر یک رقم (رپانا، بانا، بھانا۔ رکھنا، ڈالنا) ع تو دیوانہ ہو سا نکل یگ میں بھا۔ ہر یک رقم نکلے

صـ ۲۰۴ (۹) آیا ہے — آتی ہے ع آتی ہے میل عاشقی ویرانہ ہو ویرانہ ہو

(ن ۲، ۴، ۸، ہمارا مخطوطہ)

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر غلط صحیح

ص ۲۱۴ ۲۶۲/۷ پل پھسل جاوے۔ پل کھسل جاوے (طبع اوّل کا نوٹ) کھسلنا = اپنی جگہ سے ہٹ جانا (گجراتی)

ص ۲۱۹ ۲۶۹/۶ باٹ میں بات میں۔

ص ۲۱۹ ۳۰۹/۹ مثلِ مجنوں کیں مثل مجنوں کے۔

ص ۲۲۰ ۳۴۷/۵ ع جس نے محراب میں غم کے کیا۔ ع جن نے گرداب میں غم کے کیا محراب مجھے، گرداب مجھے۔

ص ۲۲۲ ۳۷۴/۱ دِکھلاتا ہے دِکھلایا ہے (ن ۱ تا ۳، ۵، ۷) ؎

حافظے کا حسن دکھلایا ہے نادانی مجھے
ہے کلیدِ قفل دانش طرز نادانی سبھے مجھے

ص ۲۲۲ ۳۷۴/۲ موج زن مؤمن ع مؤمن ہے دل میں میرے ہر رین میں پیچ و تاب (ن ۲)

ص ۲۲۲ ۳۷۴/۵ نگاہِ تیز نگہ کے تیر سے کھلایوں دل مرا تیری نگہ کے تیر کی خاطر
کماں آغوش جیوں کر کھولتی ہے تیر کے دیکھے
(ن ۱، ۴، ۶، ۷)

ص ۲۲۸ ۳۸۳/۳ سوزاں سوں سوز باں سوں۔

ص ۲۳۴ ۳۹۰/۵ لٹک اٹک ع سولٹ کوں دیکھے وتی اٹک کر الخ (ٹھیر کر)
(ن ۱، ۲، ۳، ۴، ہمارا مخطوطہ)

ص ۲۳۲ ۳۹۰/۵ سجن نین میں اٹک لیا ہے ؎ سجن نیں اس کو ٹنک لیا ہے (ن ۲، ۶، ہمارا مخطوطہ) سخن میں اس کے ٹھٹک لیا ہے (ن ۱) سخن میں اس کے اٹک لیا ہے (ن ۷)

ص ۲۳۴ ۳۹۳/۵ ع صفِ عشاق ہیں اسکوں۔ ع بہ حکم عشق اسے عشاق کی صف میں امامت ہے، امامت ہے امامت ہے (ن ۱، ۶، ۷)

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر　　غلط　　صحیح

ص ۲۳۴ ۔ ۳۹۳/۴ کنج خلوت　　کنج عزلت (ن ۲ تا ۴، ۶، ۷)

ص ۲۳۴ ۔ ۔ عشق بازی میں حقیقت یوں ۔　　عشق بازی کی حقیقت (ن ۲ تا ۷)

ص ۲۳۶ ۔ ۳۹۶/۲ میری　　میرا ع مونس و دمساز میرا آہ ہے فریاد ہے۔

ص ۲۳۶ ۔ ۳۹۷/۳ کھٹ　　گھٹ ع برہ آگ تیرا میرے گھٹ منیں۔

ص ۲۳۶ ۔ ۳۹۶ تل بتاتے دیکھ　　تل بتاتے دیکھ (دیکھوں ا تا ۷)

ص ۲۳۷ ۔ ۳۹۹/۱ طرۂ زرتار　　طرۂ طرّار (ہمارا مخطوطہ)

ص ۲۳۸ ۔ ۳۹۹/۷ عشق کا　　عشق کوں (ن ۱، ۳ تا ۷، ہمارا مخطوطہ) ع
ترک کرنا عشق کا دشوار ہے دشوار ہے۔

ص ۲۴۲ (۹) ۔ تشنہ لب کوں تشنگی مے کی نہیں ناسور ہے ۔ تشنہ لب کوں مے کے گر سنے منے ناسور ہے
پنبۂ مینا اسے جوں مرہم کافور ہے
طبع اوّل میں یہ شعر صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ص ۲۴۲ ۔ ۴۰۶/۵ غنچہ رنگ گل کے اپر　　ع غنچہ لب کے لب اُپر جوں بوئے گل تقریر ہے۔
غنچہ لب کے (ن ۲ تا ۵) لب اوپر (ن ۱، ۶، ۷)

ص ۲۴۴ ۔ ۴۰۸/۴ ۔ نکلتا ہے جب کٹاری ہاتھ لیکر ۔ عجب تیزی ہے تجھ پلکاں میں اے شوخ
دو عالم اس کٹاری سوں دو دھڑ ہے　　دو عالم اس دو دھارے سوں دو دھڑ ہے
طبع اوّل میں یہ شعر صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ص ۲۴۵ ۔ ۴۱۱/۲ بے خبر ... کسے　　نئیں خبر ... کسی (ن ۲ تا ۶، ہمارا مخطوطہ)
ع غیر حیرت نئیں خبر اس آئینہ رو کی کسی (یعنی کسی کو)

ص ۲۴۶ ۔ ۴۱۲/۷ ڈبے فرع　　فرع ع تو اصل دائرے میں ہے جگ کے ڈبے ہیں فرع
(ن ۲ تا ۴)

ص ۲۴۷ ۔ ۴۱۳/۴ سازِ نوا　　ساز و نوا ع
عشّاق پاس ساز و نوا سب نیاز ہے۔

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
ص ۲۴۷ غ ۴۱۲/۸	بھواں کی	بھواں کا ع محراب تجھ بھواں کا عجب ہے مقامِ خاص (ن ۲ تا ۵)
ص ۲۴۸ غ ۴۱۲/۱۲	بولا تجھے	بوی تجھے ع بوی تجھے صبا نے سرِ زلف یہ سخن (ن ۱ تا ۴)
ص ۲۵۰ غ ۴۱۶	۵ شعر کی غزل ہے	ہمارے مخطوطے میں یہ شعر زائد ہے۔
ص ۲۵۴ غ ۴۲۲/۲	کٹے کی سڑک	کتے کی سرک (چھری کا چلنا) ہے باشور و شار طفلاں رُسوا ہے ہر گلی میں؟ تجُ عشق میں یو میر اجاہ و جلال بس ہے
ص ۲۶۱ غ ۴۲۳/۷	اے دال	لے دل
ص ۲۶۲ غ ۴۳۵/۲	نقاب اپچاکر	نقاب اوچاکر (ن ۱، ۳، ۶) اُچانا = اُٹھانا
ص ۲۷۴ غ ۴۵۵/۲	نگاہ کی دہشت	نگاہ کی وحشت (ن ۳ تا ۵) ۶ شیراں تری نگاہ کی وحشت سوں ٹل گئے
ص ۲۷۷ غ ۹	دیوبیکا	دیوی کا ع ماہ میں کام کیا ہے دیوی کا۔ دیوی بمعنی چھوٹا چراغ۔
ص ۲۸۱ غ ۴۱	کدھر کوں	کس اوپر (چمنستانِ شعرا ص ۱۱۱)
ص ۲۸۹ غ ۳-۳-۴	خوش جھب	خوش چھب۔
ص ۲۸۹ غ ۷	بدمیں	بر میں ع لے کے بر میں وہ تیرے قد کا عصا
ص ۳۱۳/۱	لیا	گیا ع خورشید گیا مار کے سربام سحر پر
ص ۳۱۹ غ ۱۷	بلا ہے	بلائے ع مبندلے دِل بلائے آشنائی
ص ۳۲۹ غ ۲	تری ظاہری تب	تری ہووے ظاہر ع دست گیری تری ہووے ظاہر (ضمیمہ ۴، ۶)
ص ۳۳۶/۲۱	ہوئے کل یار کے دل کی کلی	ہوئے کل یاں اپس میں ناز و نیاز حسن دل کے گلے ہوا ہیکل

نمبر صفحات نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
ص ۳۳۵ / ۱۹	اس کوں آوے کل۔	اس کے گھر آ گل (ن ۴، ۵)
ص ۳۵۴ / ۹	جب (اور) جپ	سب اور تپ ے وہاں اشناں سب کرتا ہے عالم صبح اور شام تپ کرتا ہے عالم۔ ن ۲ میں آقام (آتیام) ہے۔ اگر اس اختلاف کو ترجیح دی جائے تو یہ شعر اس طرح پر ہوگا ے وہاں آتیام جب کرتا ہے عالم صبح اور شام جپ کرتا ہے عالم
ص ۳۵۵ / ۱۳	نہ کئی دقت سوں	نہ کوئی وقت ع نہ کوئی وقت کھینچے شوخ چنچل
ص ۳۵۵ / ۳۰	تھا ..... وہ	تا (ن ۲) وہ (ن ۷)
ص ۳۵۶ / ۱	دِکھوں میں	کوں دیکھوں (ن ۲، ۷) ع ہر اک جانب کوں دیکھوں فوج در فوج
ص ۳۵۷ / ۴	اس شہر کے نشے سوں	طبع اول میں "اس سیر کے نشے سوں" ہے۔ اس اختلاف کے لئے دوسرے نسخوں کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ اگرچہ سیر کی بجائے شہر زیادہ صحیح ہے جس میں احمد آباد گجرات کی طرف اشارہ ہے۔
ضمیمہ ص ۵ ع ۹	آبڑا	اُبڑا ع پیچ اپنے چیرۂ کُجلے کوں جو اُبرا دیا۔ (پگڑی کا اوپر کا پیچ)
ر ص ۶ ع ۱۱/۵	ذراسی ناس	ذرا بھی ماس ع رہا نہیں ہے بدن میں میرے ذرا بھی ماس
ر ص ۷ ع ۱۳		یہ غزل متن کی بجائے ضمیمہ میں دی گئی ہے

نمبر صفحات	نمبر غزل و شعر	غلط	صحیح
			اور اس پر نوٹ میں یہ لکھا ہے کہ یہ نسخہ ۱۰ میں ہے۔ ہمارے مخطوطے میں یہ پوری غزل موجود ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ غزل میں یہ شعر درج ہونے سے رہ گیا ہے جو طبع اوّل میں موجود ہے سارے فلک ہیں غم میں آگ سر و پا لگیں جب سوں سُنا یہ بیاں آہ دریغا دریغ ہمارے مخطوطے میں یہ شعر اس طرح ہے سارے فلک میں ملک غم میں ہیں سر پانوں لگ جب سوں سُنے یہ بیاں آہ دریغا دریغ
ضمیمہ ص ۸	ش ۱۳	آئی کہاں سوں خزاں	کاں سوں آئی یو خزاں (ن ۱ اور ہمارا مخطوطہ)

تذکرۂ ولی

مملکت ہند کا وہ حصہ جو جنوب مغرب میں واقع ہے اور جس کو گجرات دکن کہتے ہیں۔ اپنی زرخیز زمین کے ساتھ ساتھ بڑا مردم خیز خطہ بھی ہے پہلی صدی ہجری کی ابتدا ہی سے یہاں مسلمانوں کی آمد آمد شروع ہو چکی تھی۔ اس خطہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا کا مشاہدہ کرنے والے نفوس قدسیہ کے مبارک قدم اس کی سرزمین پر پڑے تھے۔ ساتویں صدی ہجری سے پہلے یہ ملک ہندو حکومت کے زیر نگیں تھا۔ اس کے بعد سلطنت دہلی کے مسلمان بادشاہوں نے اس کو فتح کر کے اپنی قلمرو حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اس پر خالص گجراتی نومسلموں کا ایک خاندان برسر اقتدار ہو گیا۔ جس نے تقریباً پونے دوسو برس تک اس ملک پر آزادانہ حکمرانی کی۔ اس عہد آفریں سلطنت کے اس مختصر دور میں ان گجراتی سلاطین نے نہ صرف اشاعت و تبلیغ اسلام سے اسلامی برادری کو وسعت دی، بلکہ مسلمانوں کی دینی تعلیم، اخلاق، تہذیب و تمدن اور ترفہ و خوشحالی کے علاوہ علوم و فنون اور صنعت و حرفت کی اس حد تک سرپرستی کی جس کی مثال سلاطین ہند کا کوئی حکمران خاندان مشکل سے پیش کر سکتا ہے۔ سلاطین گجرات کے اس عہدِ خیر و برکت میں مسلمانوں کے کئی شریف خاندان ہندوستان کے مختلف شہروں اور ممالکِ غیر سے آ کر یہاں آباد ہو گئے اور ان کی علم

دوستی اور معارف پروری کا شہرہ سن کر عرب و عجم کے کئی سادات و مشائخ گجرات میں آبسے۔ ان کی مذہبیت، دینی جوش اور پیشوایان مذہب کی تعظیم و تکریم نے کئی جلیل القدر اور نامور بزرگان اسلام اور صوفیائے کرام کو اطراف واکناف سے یہاں کھینچ بلایا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بے شمار خانوادے سادات عظام و مشائخ کرام کے یہاں وارد ہوگئے۔ جنہوں نے تبلیغ واشاعت دینِ مُبین کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کی خدمات جلیلہ انجام دیں۔ انہی خانوادوں میں سے ایک خاندان سادات علویہ کے ایک بزرگ سید بہاؤالدین مکیؔ عرب سے گجرات میں تشریف فرما ہوئے اور شہر محمد آباد عرف چانپانیر کو شرف اقامت بخشا۔ وہاں ان کی اولادیں ہوئیں۔ بڑھیں، پھلی پھولیں اور گجرات و دکن کے مختلف شہروں میں آباد ہوگئیں۔ چنانچہ اس خاندان شریف کے بقیۃ الصالحات ان اطراف میں ابتک موجود ہیں۔ یوں تو اس خاندان کے اکثر افراد نے اس حصۂ ملک میں تبلیغ دین اور رشد و ہدایت کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں؛ لیکن دسویں صدی ہجری کے اوائل میں اس خاندان کے چشم و چراغ علامہ حضرت شاہ وجیہ الدین[1] محمد آباد میں پیدا ہوئے جنہوں نے علوم دینیہ کی نشر واشاعت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی اور تجدید واحیائے دین میں سعی بلیغ فرمائی۔ ان کے کمالات علمی اور مہارت فنی کا آوازہ ملک ہند سے نکل کر عرب و عجم تک پہنچ گیا۔ ان کے مذہبی اور علمی کارنامے ہم مسلمانوں کی قابل رشک تاریخ علمی کا ایک زریں اور یادگار باب ہیں۔ اسی خاندان کے ایک گوہر شب چراغ

---

[1] آپ کے حالات کے لئے دیکھو مرآۃ احمدی صفحہ ۶۵، صفحہ ۷، آپ کے سوانح مختلف لوگوں نے لکھے ہیں: تذکرۃ الوجیہ۔ معارف میں مولوی ابوظفر کا مضمون فروری ۱۹۲۳ء

شاہ ولی اللہ تھے جو ہماری ملکی اور قومی زبان کے مصلح اعظم اور ہماری اردو شاعری کے باوا آدم تھے اور جنکی زندگی کے حالات سے ہم قارئین کو روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

خاندان اور نسب[1]

ولی سادات علویہ میں سے تھے اور ان کا سلسلہ نسب حضرت امام ہمام محمد تقی الجوادؑ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے اجداد امجاد میں سے حضرت سید بہاء الدین مکیؒ مظفر شاہ اوّل گجرات کے عہد میں گجرات تشریف فرما ہوئے اور چانپانیر میں قیام فرمایا۔ سلطان مظفر آپکے تقدس پر نظر کر کے ہمیشہ آپ کے ساتھ نہایت ادب و احترام سے پیش آتا اور ظاہری و باطنی مراعات کرتا تھا۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کی اولاد میں سے آپ کے پڑپوتے سید عماد الدین پرگنہ بیرگام کے قصبہ پائرزی کے عہدہ قضاۃ اور اجرائے احکام شریعت کے منصب پر فائز ہوئے[2] اور ان کے بیٹے قاضی سید نصر اللہ ہوئے جو حضرت شاہ وجیہ الدین رحمتہ اللہ علیہ کے والد ماجد تھے۔ سید نصر اللہ کی اولاد سے تین اولادیں ہوئیں۔ حضرت شاہ وجیہ الدین ۹۹۸ھ شاہ بہاء الدین المتوفی ۹۴۶ھ اور شاہ برہان الدین کے بیٹے حضرت شاہ

---

[1] خاندانی حالات مندرجہ ذیل مآخذ سے منقول ہیں۔ (۱) نسب نامہ حضرت شاہ وجیہ الدین جو ابتدا سے قلم بند ہوتا چلا آیا ہے جو اس وقت حضرت کے سجادہ نشین سید بڑا صاحب کے پاس موجود ہے جو ۱۲۷۰ھ میں لکھا گیا ہے (۲) ملفوظ کبیری از عبد المالک۔ (۳) قلمی بیاض از مولوی سعید احمد بن سید عابد علوی جو بارہویں صدی کے آخری ربع کی لکھی ہوئی ہے۔ (۴) اعراس نامہ از شیخ شرف الدین بن قاضی شیخ محمد مہروالی و عبد المالک۔

[2] مرآۃ احمدی (جلد سوم خاتمہ) صفحہ ۶۸ تا صفحہ ۔ (گائیکواڑ سیریز)

ہاشم تھے جنکی اولادیں دکن اور بیجاپور میں ہیں۔ شاہ بہار الدین کے دو بیٹے سید احمد المتوفی سنہ ۱ھ اور سید محمد المتوفی سنہ ۱۰۴۱ھ تھے جن کے بیٹے سید عبدالملک مصنف مصباح العالم المعروف بہ ملفوظات کبیری ہیں سید احمد کے بیٹے سید عبدالرحمٰن تھے جن کی شادی حضرت شاہ وجیہ الدین کے بیٹے میاں شاہ عبدالواحد کی دختر مسماۃ رابعہ بی بی سے ہوئی اور ان سے ولی کے والد شریف محمد اور ایک لڑکی نور بی بی ہوئیں۔ شریف محمد کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ لڑکوں میں (۱) شاہ ولی اللہ (۲) شاہ خلیل اللہ (۳) شاہ حبیب اللہ (۴) عبدالرحمٰن ہوئے۔ ولی ان سب میں بڑے تھے۔ حضرت شاہ وجیہ الدین سے ولی کا ددھیالی اور ننہالی دونوں طرف کا رشتہ تھا۔ اور وہ صحیح معنوں میں انہی کے خاندان سے تھے۔ اس لئے تذکرہ نویسوں نے ولی کا حضرت شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے ہونا بالکل صحیح لکھا ہے۔

ولی کے والد شریف محمد نے سنہ ۱۰۷۲ھ میں انتقال کیا، اور ان کے بھائی خلیل اللہ سنہ ۱۱۳۵ھ میں وفات پاگئے ولی کی تین بہنوں میں سے ایک سنہ ۱۱۲۲ھ میں دوسری سنہ ۱۱۴۴ھ میں اور تیسری سنہ ۱۱۵۷ھ میں فوت ہوئیں۔ شاہ حبیب اللہ اور عبدالرحمٰن سنہ اور سنہ تک علی الترتیب زندہ تھے جیساکہ بعض کاغذات پر ان کے دستخط سے معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ ولادت

ولی کے والد ماجد سید شریف محمد نے ۱۲ رجب المرجب سنہ ۱۰۷۲ھ میں وفات پائی چنانچہ عارف خدا علوی سے ان کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے[۱] سنہ ۷ جلوس عالمگیری (سنہ ۱۰۷۴ھ) کی ایک سند ہے جو "فرزندان سیادت پناہ شریف محمد

---

[۱] : اعراس نامہ۔

علوی" کی درخواست پر عطا ہوئی ہے[1]۔ ان فرزندوں میں ولیؔ سب سے بڑے تھے۔ جو غالباً اس وقت جوان یا سن رشد کو پہنچ چکے ہوں گے اور اگر اس وقت ان کی عمر کم از کم بیس بائیس سال کی فرض کر لی جائے تو ۱۰۵۰ھ یا اس کے کچھ بعد ان کی ولادت ماننی پڑے گی۔

نام ولیؔ کا پورا نام "شاہ محمد ولی اللہ"[2] تھا جیسا کہ خود ان کی مُہر اور دستخط سے ثابت ہوتا ہے[3]۔ انساب نامہ میں بھی یہی نام لکھا ہوا ہے اور اعراس نامہ میں ان کی تاریخِ وفات کے تحت میں بھی یہی نام درج ہوا ہے۔

اولاد و اعزہ ولیؔ کی شادی احمد آباد کے مشہورِ عالم علامہ شریف صدیقی[4] کی دختر مسماۃ امنۃ النبی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے دو لڑکیاں اور تین لڑکے ہوئے۔ لڑکوں میں سید احمد، سید مجتبیٰ اور سید امجد تھے۔ ان میں دو مقدم الذکر کی شادی مولانا فرید بن جمیل اللہ بن شیخ فرید بن علامہ شریف کی دونوں لڑکیوں سے ہوئی تھی ولیؔ کے برادر نسبتی مولانا شیخ فرید کے بیٹے جمیل اللہ اور ان کے بیٹے مولانا فرید کا قیام عالمگیر کے زمانے میں اورنگ آباد میں رہا، ان وجوہات سے ولیؔ اور ان کے فرزندوں کا اورنگ آباد آنا جانا قرین قیاس ہے۔

---

[1] اس سند پر مکرمت خان (المتوفی ۱۰۷۶ھ) حاجی شفیع خان (المتوفی ۱۰۷۹ھ) اور خواجہ محمد ہاشم (میر ملک حسین) دیوان صوبۂ گجرات بزمانہ صوبہ داری مہابت خاں اور شیخ نظام الدین (۱۰۸۱ھ) (راجہ جسونت سنگھ صوبہ دار گجرات کے دیوان) اور محمد لطیف خان دیوان (۱۰۹۳ھ) کی مہریں ثبت ہیں۔ [2] شعرائے اُردو کے اکثر تذکروں میں بھی یہی نام لکھا ہوا ہے [3] ولیؔ کی مہر کی شکل یہ ہے۔

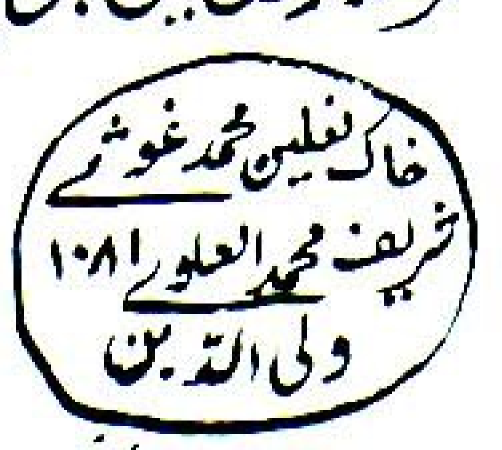

دستخط بخط نسخ "محمد ولی اللہ بن شریف محمد العلوی"[4]

ولی اور ان کی اولاد کا نسب نامہ حسب ذیل ہے :-

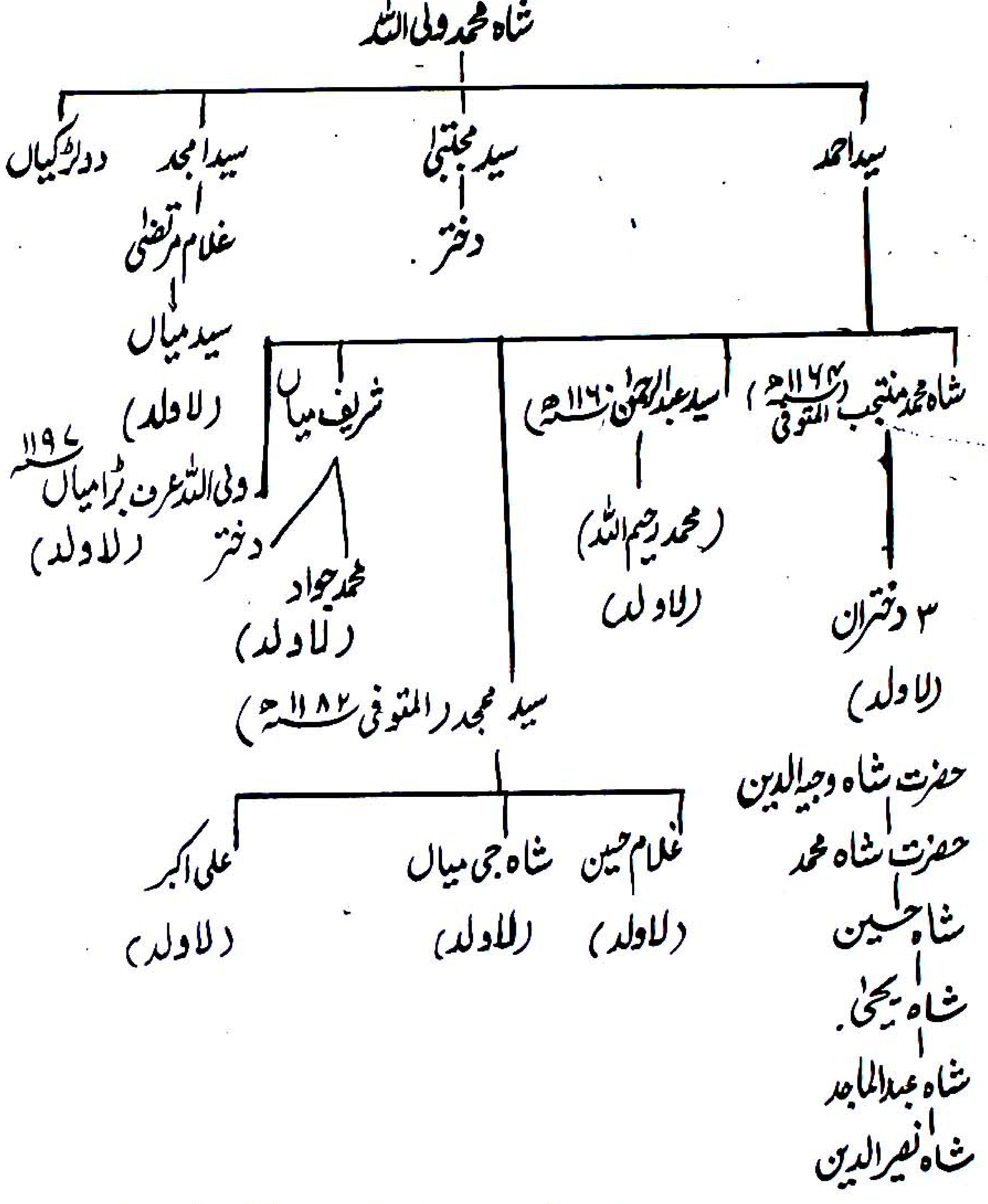

چند دستاویزوں اور حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ کے شجرۂ انساب سے پتہ چلتا ہے کہ ولی کی اولادیں چند پشتوں تک جاری رہیں اور ۱۲۲۵ھ تک بقید حیات تھیں۔ اس وقت ان کے بھائی شاہ خلیل اللہ کی اولاد احمد آباد میں موجود ہے۔

حضرت شاہ وجیہ الدین علوی نے ۹۳۵ھ میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں آپ خود آپ کے تلامذہ اور آپ کے بعد آپ کی اولاد درس و تدریس

کا کام کرتے رہے ۔ یہ مدرسہ آپ کے بعد تقریباً ۴۰ سو سال تک قائم رہا۔ اس میں آپ کے خاندان کے تمام حضرات تعلیم پاتے رہے ہیں۔

تعلیم و تربیت

ولی نے جب ہوش سنبھالا تو وہ اپنے خاندانی مدرسہ میں داخل کر دیئے گئے۔ اس مدرسہ میں انہوں نے تعلیم کی تکمیل کی یا نہیں، کون کون سی کتابیں پڑھیں، کن کن اساتذہ سے تحصیل کی، ان تفصیلات سے ہم محروم ہیں۔ تاہم ولی کی تصانیف کلیات اور رسالۂ نور المعرفت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالباً اس مدرسہ میں فارسی، عربی کا مروجہ نصاب ختم کر چکے ہوں گے۔ ان کی تصانیف میں عربی کی متعدد نصابی کتابوں کے نام اور مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات پائی جاتی ہیں، نیز آیات احادیث اور اقوال اور عربی فارسی الفاظ کے صحیح استعمال اور ترکیبوں سے ولی کی فضیلت علمی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے ان کی تاریخ وفات کے مادہ میں "افضل العلمار" کا خطاب دیا ہے وہ بالکل اس کے مستحق معلوم ہوتے ہیں۔ بعض ناواقفوں نے صرف ولی کے دیوان کو دیکھ کر ان کو معمولی استعداد کا آدمی ٹھہرایا ہے اور ان کی شعر گوئی کو محض بزرگوں کی صحبت کا نتیجہ بتایا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ولی علوم رسمیہ سے بے بہرہ نہ تھے۔ انہوں نے اپنے دیوان اور رسالۂ نور المعرفت میں (ان کا رسالہ نور المعرفت ان کی فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے جو ابو الفضل، طغرا اور ظہوری کی انشا پردازی کی یاد دلاتا ہے، اسی رسالہ میں ان کے فارسی اشعار بھی اس زبان میں ان کی قادر الکلامی کو ظاہر کرتے ہیں اسی میں) انہوں نے عربی کی بعض درسی کتابوں کا ذکر استعارۃً کیا ہے جس سے ان کی دستگاہ علمی کا حال معلوم ہوتا ہے۔

سے ولی نے عربی کی درسی کتابوں کے نام دیئے ہیں۔ (۱) شمسیہ (۲) قطبی (اسکی شرح) (۳) منہل (۴) حسامی (۵) مختصر المعانی (۶) مطول (۷) اطول (۸) حکمت الاشراق (۹) کشاف (۱۰)

غرضیکہ ولی نے اپنے وطن اور مولد و مسکن شہر احمد آباد گجرات میں اپنے خاندانی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور مختلف اہل فن اور اساتذہ کا فیض صحبت اٹھایا۔

حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ کے بھانجے حضرت سید میراں المتوفی ۱۰۵۵ھ بمقام بیجاپور) [1] کے فرزند علامہ سید اسماعیل اس مدرسۂ علویہ گجرات میں شیخ الحدیث تھے جن کا فیض صحبت ولی نے اٹھایا تھا جیساکہ ۱۳۰۵ھ کی ایک قلمی تحریر [2] سے معلوم ہوتا ہے اسی تحریر سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ ولی اپنا کلام ان کے ملاحظہ میں پیش کیا کرتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہو تو ماننا پڑے گا کہ ایام طالب علمی ہی سے ولی کو شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا جس وقت ولی اس مدرسہ میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس وقت خانقاہ حضرت شاہ وجیہ الدین کے صاحب سجادہ مولانا سید شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۰۸۴ھ تھے۔ غالباً اس زمانہ میں ولی کی عمر ۲۰ ۔ ۲۵ سال کی ہوگی۔

(ولی کے اساتذہ میں سید اسمٰعیل شیخ الحدیث مدرسہ علویہ کا نام ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ غالباً ان سے ولی نے علم حدیث کی تحصیل کی ہوگی۔ دیگر علوم کن سے پڑھے اور پڑھانے والے اساتذہ کون تھے ان کا حال معلوم نہ ہو سکا) تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خانقاہ حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہٗ کے سجادہ نشین سے ولی نے سلسلۂ شطاریہ [3] میں بیعت کی۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت

---

[1] سید میراں ابراہیم عادل شاہ کے زمانہ میں احمد آباد سے بیجاپور گئے تھے (تاریخ روضۃ الاولیاء بیجاپور) [2] مخطوطہ [illegible] مکتوبہ ۱۱۴۲ھ موجودہ کتب خانہ مولوی حکیم سید محمد قاسم صاحب ناظم سمیات حیدرآباد کے آخر میں یہ تحریر درج ہے (دیکھو یادگار ولی ص ۲۲۲)

[3] دیکھو تذکرۂ محبوب الزمن جلد دوم)

اس خانقاہ میں مولانا سید شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۰۸۴ھ صاحب سجادہ تھے جو علم ظاہر و باطن کے رہنما تھے سلسلۂ شطاریہ میں خود حضرت شاہ وجیہ الدین حضرت غوث گوالیاری کے مرید تھے۔ اس لئے ان کے خاندان کے افراد بھی اس سلسلہ میں بیعت ہوتے اور دوسروں کی بیعت لیتے رہے چونکہ وتی بھی اسی خاندان سے تھے لہذا وہ بھی اوّلاً اس سلسلہ میں منسلک ہو گئے یہی وجہ ہے کہ ہم وتی کی مہر میں "خاکپائے نعلین غوثی" لکھا ہوا پاتے ہیں۔ جس میں حضرت غوث کے نام سے نسبت کی گئی ہے جو اس سلسلہ کے بزرگ تھے۔

(ممکن ہے کہ مولانا سید حسین سے اس وقت جو سجادہ نشین تھے وتی نے تحصیل علم بھی کی ہو اس لئے کہ مرآۃ احمدی کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بعد ان کی اولاد و احفاد بھی اس مدرسہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔

"اولاد امجاد ایشاں پیوستہ مکتب علوم و تدریس بمضمون الولد سر لابیہ بر وسادۂ افادہ قیام دارند")

علمی قابلیت و تصانیف

وتی کی علمی استعداد اور قابلیت معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس دو ہی ذرائع ہیں۔ ایک ان کا دیوان اور دوسرا ان کا رسالہ نور المعرفت۔

ان کی تصانیف سے صرف دیوان اور رسالہ نور المعرفت دو ہی ہم تک پہنچے ہیں۔ دیوان کو انھوں نے ۱۱۱۲ھ کے بعد اور ۱۱۱۹ھ سے پہلے مرتب کیا ہوگا جبکہ وہ دہلی سے واپس آ گئے تھے۔ ۳ جلوس محمد شاہی (۱۱۳۳ھ) میں ان کا دیوان دہلی پہنچا تھا۔ یعنی ان کی وفات کے ۱۴ سال کے بعد۔ ہمارے پاس کوئی شہادت ایسی نہیں ہے۔ جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ وتی نے خود اپنا دیوان اپنی عین حیات میں جمع و مدوّن کیا تھا۔ ان

۱؎ تذکرۂ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی مطبوعۂ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۴ء صفحہ ۲۵۵۔

کے دیوان میں صرف ایک شعر ہے جسمیں دیوان جمع کرنے کا ذکر ہے،

شاعروں میں اپس کا نام کیا ؎

جب ولیؔ نے کیا یو دیوان جمع

لیکن یہی شعر مع پوری غزل کے اشرفؔ کے دیوان میں بھی پایا جاتا ہے جس میں ولیؔ کی بجائے اشرفؔ کا تخلص موجود ہے۔

جب سوں اشرفؔ کیا یہ دیواں جمع ؎

ہمارے خیال میں یہ پوری غزل اشرفؔ ہی کی ہے جو کلیات ولیؔ کے ضمیمہ میں ولیؔ کے نام سے درج ہوئی ہے۔ ولیؔ کا خود اپنے دیوان کو جمع یا مرتب کرنے کا کوئی ثبوت نہیں پایا جاتا۔ ۱۱۳۲ھ میں یعنی ان کی وفات کے ۱۴ برس بعد ان کے دیوان کا دہلی پہنچنا بتا رہا ہے کہ وہ وفات ولیؔ کے بعد ہی مرتب ہوا ہے۔ نیز اب تک جتنے قدیم قلمی نسخے دیوانِ ولیؔ کے پائے جاتے ہیں ان میں قدیم ترین نسخہ ۱۱۲۰ھ کا بمقام اورنگ آباد لکھا ہوا ہے۔ جس کا نواب نصیر حسین خان خیالؔ مرحوم کے کتبخانے میں موجود ہونا بتایا گیا ہے[1]۔ یعنی وفات ولیؔ کے دوسرے سال ممکن ہے کہ ان کی وفات کے فوراً بعد کسی نے اس کی ترتیب و تدوین کی ہو۔ ممکن ہے کہ ان کے شاگردوں میں (غالباً اشرفؔ نے) کسی نے مرتب کیا ہو۔ (دیوانِ اشرفؔ میں ولیؔ کی درجن بھر غزلیں اشرفؔ کے تخلص کے ساتھ موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اشرفؔ نے ولی کی ان غزلوں کو دیوان ولیؔ سے لیکر اپنے دیوان میں درج کر لیا ہو) دیوانِ ولیؔ کے مختلف مخطوطات میں کلام ولیؔ کا کمی بیشی کے ساتھ پایا جانا بھی اس کی تائید کر رہا ہے۔ یعنی جتنا کلام جس کو ہاتھ لگا اس نے جمع کر دیا۔

رسالہ نور المعرفت ولیؔ نے اپنے پیر طریقت حضرت شاہ علی رضا کے ارشاد کی تعمیل میں لکھا ہے۔ جس میں احمد آباد کے مشہور عالم متبحر حضرت

---

[1] یادگار ولی ص ۲۲۴،

مولانا شیخ نورالدین (جو ولی کے برادر نسبتی علامہ شریف صدیقی کے شاگرد رشید تھے [1]) کی مدح اور ان کے مدرسۂ ہدایت بخش[2] کی جس میں وہ درس دیتے تھے توصیف کی ہے۔ جیسا کہ رسالہ مذکور کے سببِ تالیف میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔

یہ رسالہ ولی نے ۱۱۱۵ھ میں یا اس کے بعد ہی لکھا ہوگا۔ کیونکہ مدرسہ اور مسجد کی تعمیرات ۱۱۱۵ھ کو اختتام کو پہنچی تھیں۔ اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ (قاضی نورالدین حسین صاحب رضوی شیرازی المتخلص بہ فائق ساکن بھروچ مولّف تذکرۂ مخزن شعرائے گجرات کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جس کی نقل مکتوبہ ۲۵ ربیع الاوّل ۱۲۷۰ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۸۵۳ء سے سید حسینی پیر صاحب علوی احمد آبادی نے ۱۳۵۰ھ میں لی تھی) موجود ہے جس کو اس مضمون کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ولی کی فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے جو ابوالفضل طغرا اور ظہوری کی نثر کی یاد دلاتا ہے۔ اس میں ان کے فارسی اشعار بھی اس زبان میں ان کی قادرالکلامی کو ظاہر کرتے ہیں۔

معاش ولی سا شاعری کا مشغلہ رکھنے والا اور آزاد رو شخص کسی ملازمت کا پابند نہیں ہو سکتا انہوں نے فن شاعری کو کسب معیشت کا ذریعہ نہیں بنایا چنانچہ ان کے کلام میں بھی کسی رئیس یا امیر کی مدح نہیں پائی جاتی۔ بلکہ بعض اشعار سے ان کی آزادانہ اور متوکلانہ زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۱۹، [2] یہ مدرسہ مولانا نورالدین کے شاگرد اور مرید محمد اکرم الدین مخاطب بہ شیخ الاسلام خان صدر صوبۂ احمد آباد نے جو شیخ الاسلام عبدالوہاب کے بیٹے تھے ایک لاکھ اور ۲۴ ہزار روپیہ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا اس مدرسہ کی تعمیر ۱۱۰۶ھ میں شروع ہوئی اور بتدریج عمارات و مسجد تعمیر ہوتی رہیں تا آنکہ ۱۱۱۵ھ میں اختتام کو پہنچا (مرآۃ احمدی جلد ۳ ص ۵۸)

کیا ہوں بر میں اپس کے لباس عریانی
ولی برہ نے دیا یو قبا مجھے تشریف

نیں منصب وجاگیر نہیں روز و وظیفہ
ہر روز ترا ذکر وظیفہ ہے ولی کوں

ولی کوں نہیں مال کی آرزو
خدادوست نیں دیکھتے زر کی طرف

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو انہیں کوئی منصب ملا تھا، نہ ہی جاگیر و وظیفہ۔ لیکن ان کے فرزندوں کی وجہ معاش کے لئے موضع اساروا (اساول) اور بھروچ میں حکومت نے اراضی اور روزینہ مقرر کیا تھا جیسا کہ بعض پروانہ جات سے معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ولی کی بافراغت زندگی اور ان دور دراز ملکوں کی سیاحت سے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ ان کی مستقل آمدنی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور رہا ہوگا۔

سیر و سیاحت

ولی خود بھی سیر و سیاحت کا شوق رکھتے تھے فارسی کا مشہور شعر ہے

بہار عمر ملاقات دوست داراں است
چہ حظ برد خضر از عمر جاوداں تنہا

ولی نے غالباً اسی کا ترجمہ کیا ہے۔

نہیں ہے سیر یک ساعت اگر باغ جوانی میں
کہوں کیا خضر کو حاصل ہے عمر جاودانی میں

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی۔ ایک مشہور قول ہے۔ ولی کا دکن خصوصاً اورنگ آباد آنا جانا اس لئے قرین قیاس ہے کہ ان کے اعزہ وہاں رہتے تھے۔ برہانپور میں ان کے قیام کا ذکر حمید نے کیا ہے۔

"دربلدۂ دارالسرور برہانپور نیز مدتے سکونت داشت" [1]

---

[1] گلشن گفتار۔

سنہ ۴۴ جلوس عالمگیری یعنی ۱۱۱۲ھ میں ابوالمعالی کے ساتھ ان کے دہلی جانے کا ذکر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے ۱ (قائم فٹ) ان کا دوسری بار سنہ ۲ محمد شاہی یعنی ۱۱۳۲ھ میں دوبارہ دلی جانے کا واقعہ غلط ہے۔ البتہ اس سنہ میں دیوان ولی کے دلی پہنچنے کا ذکر مصحفی نے کیا ہے۔ جس کو ولی کا دیوان لے کر وہاں جانا سمجھ لیا گیا ہے۔ مرتب کلیات ولی نے ان کا صوبۂ پنجاب میں سرہند وغیرہ تک جانا نہ معلوم کس بنا پر لکھ دیا ہے ۲ کسی تذکرہ یا ان کے دیوان میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ کابل و کشمیر تک گئے ہوں تو تعجب نہیں خصوصاً کشمیر کا نام ان کے اشعار میں ایک سے زائد مرتبہ آیا ہے جس سے صاف متبادر ہوتا ہے کہ وہ "کشمیر" سے محظوظ ہو چکے تھے۔

ولی کے دل کوں یوں ہوتی ہے راحت تجھ گلی بہتر
کہ جیوں ہوتی ہے خاطر منشرح کشمیر کے دیکھے (کلیات ص ۳۰۴)

ولی تیری گلی کوں دیکھ بولا۔
یہی ہے ہند اور کشمیر و کابل (ص ۱۳۹)

کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر
ہوا دیتی ہے اس کی یاد کشمیر (ص ۳۸۰)

سفر حج کے متعلق شفیق کا بیان موجود ہے:

"مردماں نقل می کنند کہ در سورت آمدہ بود و چندے رحل اقامت انگندہ احرام بیت اللہ بربست و زیارت حرمین شریفین نمود" ۳

خود ولی کے دیوان میں ایک قصیدہ ۲۰ شعر کا "مدح بیت الحرام" میں موجود ہے جس کے صرف مقطع میں بیت حرم کا ذکر ہے ورنہ ۱۹ اشعار

---

۱ ان پر دانہ جات کی نقلیں سید حسینی پیر صاحب احمد آبادی کے پاس موجود تھیں۔
۲ کلیات [illegible] کا نوٹ۔ ۳ چمنستان شعرا ص ۱۰۵۔

یں کہیں بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر بیت الحرام کی تعریف کر رہا ہے

آگ دوزخ کی اُچھے اس پہ قیامت میں حرام
اے ولی صدق سوں دیکھا ہے جو کئی بیتِ حرم (ص ۳۶۸)

بعض اشعار میں بھی سفرِ حج کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

ے روتے ستی فارغ ہو ولی پیو کوں دیکھا
کعبے کی زیارت کیا دریا سوں اتر کر

ے معنی طرف چلیا ہے سورت سوں یوں مرا دل
سورت ستی چلیا ہے کعبے جہاز گویا

شفیق نے (ص ۱۱۱) مندرجہ شعر کے حوالہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جب وہ مکہ میں تھے تو کسی جیب کترے نے ان کی جیب کاٹ لی تھی

ے

خبرداری سے اس معشوق کے کوچے میں جا اے دل
کہ اطرافِ حرم میں ہے ہمیشہ ڈر حرامی کا

عرب میں چور اور اُچکے کو حرامی کہتے ہیں۔

ولی کے سفرِ حج کی تاریخ کی باآسانی تعیین کی جا سکتی ہے کہ ۱۱۱۰ھ میں وہ اپنی اہلیہ کی وفات کے بعد ہی حج کو گئے ہیں یا پھر ۱۱۱۱ھ میں۔ کیونکہ ۱۱۱۲ھ میں ہم ان کو دکن میں پاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ولی نے یہ سفر بڑھاپے میں کیا تھا۔ جیسا کہ فراقِ گجرات والے قطعہ میں جو غالباً سفرِ حج کے دوران میں لکھا گیا ہے ان کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

اوّل سوں تھا ضعیف یہ پابستہ سوز میں
جوں بال تھا اگن کے اُپر بیقرار دل

احمد آباد کے مشہور اور صاحبِ سلسلہ بزرگ شیخ علیؒ رضا سرہندی جو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے اپنے بزرگوں سے نقشبندیہ سلسلۂ ارادت میں داخل تھے ولی نے ان سے سلسلہ نقشبندیہ

میں بیعت کی تھی، چنانچہ فتوت نے اپنے تذکرہ ریاض حسنی میں ولی کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

"دست بیعت بجناب حضرت شاہ علی رضا گجراتی قدس سرہ دارد"[1]

اپنے ایک شعر میں ولی ان کو اپنا "پیر کامل" کہتے ہیں۔

نقدِ شاہ نجف ولی اللہ پیر کامل علی رضا پایا (کلیات)

نقد بمعنی اولاد کے بھی آتا ہے دیکھو غیاث۔

صاحب مرآۃ احمدی نے ان بزرگ کا حال لکھا ہے، ۱۱۴۲ھ میں ان کا وصال ہوا صاحب وجد و حال بزرگ تھے[2]۔ ان کا مزار فی الحال احمد آباد میں روضۂ حضرت پیر محمد شاہ صاحب کے قریب اور شارع عام پر موجود ہے۔ نقشبندیہ کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ کی خلافت احمد آباد کے صاحب سلسلہ بزرگ حضرت شیخ یحییٰ چشتی سے حاصل کی تھی سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت شاہ عبدالاحد قدس سرہ عرف گل محمد متخلص "وحدت"، حضرت نبیرۂ حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی ان کے پیر طریقت تھے۔ مگر اعراس نامہ سے ایک خاص بات معلوم ہوئی کہ حضرت شاہ سعد اللہ گلشن بھی انہی کے مرید تھے اور اس لحاظ سے وہ شاہ علی رضا کے پیر بھائی تھے اور یہی وجہ شاہ گلشنؒ سے ولی کے تعلقات کی معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے مولانا نورالدین سے ولی کا دست بیعت ہونا لکھا ہے اور ثبوت میں ولی کے رسالہ انوار المعرفت کو پیش کیا ہے۔ حالانکہ رسالہ مذکور میں وہ صاف طور پر لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے پیر روشن ضمیر کے حکم کی تعمیل میں مولانا نورالدین اور ان کے مدرسہ کی تعریف کی۔

ان کا نام شاہ سعد اللہ اور تخلص گلشن تھا۔ زبیری خاندان سے تھے یعنی

---

[1] مقالات ہاشمی ص۴۲۵ [2] مرآۃ احمدی ص۱۰۵ خاتمہ جلد سوم [3] شاہ صاحب کے حالات مندرجہ ذیل کتابوں میں تفصیل سے پائے جاتے ہیں۔ (۱) سرو آزاد (۲) ریاض الشعراء والہ داغستانی (۳) تذکرہ بے نظیر از افتخار (۴) سفینۂ خوشگوار (۵) تذکرہ روز روشن۔

مشہور صحابی حضرت زبیرؓ بن العوام تک ان کا سلسلۂ نسب منتہی ہوتا ہے
ان کے بزرگ ملک عرب سے گجرات میں وارد ہوئے تھے اور وہیں
متوطن ہوئے تھے۔ ان کے اجداد میں سے اسلام خاں نامی بعض سلاطینِ
گجرات کے وزیر تھے۔ سلطنت گجرات کے انقراض اور شہنشاہ اکبر
کے استیلائے گجرات کے بعد ان کے بعض اسلاف برہان پور میں
منتقل ہوگئے پھر شاہ صاحب برہان پور سے دہلی چلے آئے اور وہیں
رہ پڑے۔ بڑے صاحب باطن بزرگ تھے ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۱ھ
میں وفات پاگئے۔ ولیؔ کے پوتے شاہ منتخب نے شاہ گلشن کی تاریخ
وفات لکھی ہے۔ " طوطیٔ گلشن بہشت " (اعراس نامہ)
ان کا مزار اس وقت دہلی میں پہاڑ گنج میں موجود ہے ان کا بار بار اپنے
آبائی وطن احمد آباد میں آنا جانا اور رہنا سہنا پایا جاتا ہے۔ بلکہ قریب
۲۲ سال کے وہ گجرات میں رہے ہیں، اورنگ آباد و دیگر بلاد دکن میں
رہے، برہان پور میں برسوں رہے اور غالباً ولیؔ سے وہیں احمد آباد یا
برہان پور میں ان کی ملاقات ہوئی ہوگی اور وہیں سے تعلقات استادی
وشاگردی قائم ہوئے ہوں گے۔ پھر جب وہ دلی تشریف لے گئے تو
وہاں بھی ولیؔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے جیسا کہ تذکروں
کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔ غرضیکہ شاہ صاحب سے ولیؔ کے
تعلقات قدیم معلوم ہوتے ہیں۔

تلمذ ۴۴ھ جلوس عالمگیری میں ولیؔ کا دہلی تشریف لے
جانا اور وہاں شاہ گلشن سے ان کی ملاقات کا حال
تذکرہ نویسیوں نے لکھا ہے۔ ان میں میر صاحب کا بیان ہے کہ ولیؔ
شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور اپنا کلام سنایا تو میاں صاحب
نے فرمایا کہ فارسی میں جو مضامین بیکار پڑے ہوئے ہیں ان کو اپنے

ریختہ میں کام میں لاؤ تم سے کون باز پرس کرے گا۔[۱] لیکن قائم نے اس ملاقات کا حال لکھتے ہوئے شاہ صاحب کا ولی کو ریختہ میں شعر کہنے کا حکم اور یہ مطلع ؎ (خوبی اعجازِ حسن یار گر انشا کروں) موزوں کرکے دینا بیان کیا ہے[۲] اور اس کے بعد لکھا ہے کہ۔

"بالجملہ ہمیں تفول زبان ایشاں سخن ایں بابا چناں حسن قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تر از مطلع آفتاب گردیدہ"[۳]

یہانتک تو صرف شاہ صاحب کی ملاقات اور ان کے فیض صحبت کا حال معلوم ہوتا ہے، لیکن میر حسن نے شاہ صاحب سے ولی کا استفادہ کرنا بھی بیان کیا ہے۔

"در خدمت شاہ گلشن قدس اللہ سرہٗ استفادہ حاصل نمودہ از توجہ آن بزرگوار مقبول اعلیٰ وادنیٰ گردید۔"[۴]

ان سے بڑھکر شہادت خود ولی کی ہے چنانچہ اس تلمذ کا ذکر انھوں نے اپنے رسالۂ نور المعرفت میں اس طرح کیا ہے۔

"مصنف ایں عبارت کہ بیمن ثنا پردازی بزرگان بخطاب ولی سرفراز است و از شاگردی زبدۃ العارفین حضرت شاہ گلشن ممتاز"[۵]

فرنچ مستشرق گارساں دتاسی نے شاہ گلشن کو ولی کا استاد بتایا ہے[۶]

۱؎ نکات الشعراء ص ۸۹ ، ۳؎ اس غزل کے متعلق دیوانِ ولی کے ایک قلمی نسخہ میں یہ نوٹ درج ہے "اس غزل کو طبقات الشعراء مؤلفہ منشی قدرت اللہ صدیقی مرادآبادی (۱۱۸۰ھ) میں حضرت شاہ گلشن کی طرف منسوب کیا ہے جس کو حضرت بطور تبرک ولی گجراتی کو مرحمت فرمائی تھی اور اس پر ولی کے ریختہ کی بنیاد ہے" (دیکھو کلیات ولی ضمیمہ ۲ ص ۷-۸)۔ ۴؎ مخزن نکات ص ۱۰، ۵؎ تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۰۴ ۶؎ ہمارا مخطوطہ نور المعرفت خاتمہ، ۷؎ خطبات گارساں دتاسی ص ۱۳۵۔

لیکن اردو ترجمہ میں محشی نے اس پر یہ نوٹ لکھا ہے۔

"شاہ گلشن برہان پوری تھے، دہلی میں جا بسے تھے ولی ان سے اس وقت ملا تھا جبکہ اس کی شاعری میں پختگی آچکی تھی مؤلف کو غالباً اس وجہ سے دھوکا ہوا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے یہ لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے ولی کو فارسی مضامین کو اردو میں منتقل کرنے کی ہدایت کی تھی۔"

لیکن جب ولی خود شاہ صاحب سے اپنی شاگردی کا اعتراف کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے اس بیان کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے بات اصل یہ ہے کہ یہ تذکرے ولی اور شاہ صاحب کے تعلقات پر کافی روشنی نہیں ڈالتے۔ فارسی تذکروں میں شاہ صاحب کے حالات جستہ جستہ ملتے ہیں۔

بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ ولی نے حضرت شاہ گلشن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ شاہ صاحب خود فارسی کے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے فارسی کے ایک لاکھ تیس ہزار اشعار انہوں نے کہے اور سات دیوان مرتب کیے۔ فن موسیقی میں اس قدر ید طولیٰ تھا کہ "خسرو ثانی" کہے جاتے تھے ایسے باکمال شاعر اور ادیب کا تلمذ ولی کو حاصل تھا جس نے ولی کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا اور ان میں فنون لطیفہ کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔

تذکروں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے ولی کو زبان ریختہ میں کہنے کا حکم فرمایا۔ اور یہ مطلع موزوں کر کے عنایت فرمایا۔

ولی نے اس پورے شعر کی پوری غزل کہی ہے لیکن اس کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ ۱۱۱۲ھ میں شاہ صاحب نے ولی کو ریختہ گوئی کا مشورہ دیا تھا حالانکہ یہ زمانہ ولی کی زندگی کے دور آخر میں ہے جس کے

۷ سال کے بعد وہ راہی ملک بقا ہوئے۔ اس واقعہ سے صرف اسقدر نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مطلع ایک زبان ریختہ میں عنایت کیا تھا اور اس کی برکت سے ولی کا کلام بہت مقبول اور مطبوع طبائع ہو گیا۔ اس سے ولی کی شاگردی پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا۔ رہا میر صاحب کا یہ بیان کہ شاہ صاحب نے ولی کو فارسی کے مضامین اپنے کلام ریختہ میں استعمال کرنے کو کہا خصوصاً ان کا یہ فقرہ کہ تم سے کون باز پرس کرے گا۔ تو یہ ہمارے خیال میں جس طرح شاہ گلشن جیسے ایک باکمال شاعر و ادیب اور صوفی بزرگ کی شایان شان نہیں ہے۔ اسی طرح ولی جیسے ایک فطری شاعر اور صاحب فن سے بھی بہت بعید امر ہے۔ میر صاحب جو ولی کے حالات سے کما ینبغی واقف نہ ہونے کے معترف ہیں نہ معلوم کہاں سے یہ گپ سن کر اپنے تذکرہ میں نقل کر دی ہے کہ جبکی ان کے معاصر تذکرہ نویسوں میں سے کسی نے بھی تصدیق نہیں کی۔ اس لئے صحیح واقعہ وہی معلوم ہوتا ہے جس کو قائم اور میر حسن نے نقل کیا ہے۔

احباب و معاصرین

ولی نے اپنے کلام میں اپنے بعض احباب و معاصرین کے نام سے اشعار کہے ہیں جن میں خود ولی کے بعض ہم نسب بزرگ بھی شامل ہیں۔ ان خاندانی اعزہ میں سے چار بزرگوں کا ذکر ولی کے کلام میں موجود ہے جو حسب ذیل ہے۔

۱۔ شاہ سراج الدین، ۲ شاہ شمس الدین، ۳ شاہ کامل، ۴۔ شاہ اکمل، یہ چاروں بزرگ حضرت شاہ وجیہ الدین کی اولاد میں سے تھے۔ جیسا کہ ان کے شجرۂ نسب کے ایک "شناختنامہ" سے پایا جاتا ہے۔

حضرت شاہ وجیہ الدین

- شاہ محمد
  - شاہ کبیر الدین
    - شاہ عبدالوارث
      - شاہ عابد
        - شاہ کامل
        - شاہ اکمل
- شاہ عبدالحق
  - غلام وجیہ الدین
    - سراج الدین
      - شمس الدین
        - علاؤ الدین
          - شاہ حامد

ان میں سے شاہ سراج الدین ولیؔ کے ہم عمر اور دوست تھے جن کی شادی میں شریک ہونے کا ذکر ولیؔ نے اس طرح کیا ہے ۔

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں
فانوس دل میں شوق ترا ہے سراج آج
وہ شوخ مجھ سے آ کے ملیا اس سبب ولیؔ
شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں راج آج

شاہ سراج کوئی شاعر نہ تھے جیسا کہ بعض دکنی اہل قلم نے ان کو سراج اورنگ آبادی تصور کر کے ولیؔ کے اشعار ان سے منسوب کر دیئے پروفیسر عبدالقادر سروری کہتے ہیں ۔

" ولیؔ کی ایک مسلسل غزل سے ان کے کسی دوست سراج کی شادی کا پتہ چلتا ہے اور جیسا کہ بعض محققین اس طرف راغب معلوم ہوتے ہیں شاید یہ سراج شاہ سراج ہی ہوں گے ۔ اس طرح کے قیاس کی گنجائش بھی ہے ۔ کیونکہ اگر ولیؔ کا انتقال ۱۱۵۵ھ میں ہوا ہو تو اس وقت سراج کی عمر ۱۸ سال کی ہو گی ولیؔ کی وہ غزل حسب ذیل ہے :-

.... مگر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"لیکن یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ولی کے دوست یہی سراج تھے۔ (مقدمہ کلیات سراج اورنگ آبادی ص ۵۹ سنہ ۱۹۴۰ سراج اورنگ آبادی کی سنہ ولادت ۱۱۲۷ھ بتائی گئی ہے۔ حالانکہ ولی کا سنہ ۱۱۱۹ھ میں انتقال ثابت ہو چکا ہے اس لئے سراج ولی کی وفات کے آٹھ سال بعد پیدا ہوتے ہیں

انہوں نے ۲۵ رجب ۱۱۱۹ھ میں رحلت فرمائی جس کے صرف دو ہفتہ کے بعد خود ولی بھی وفات پا گئے۔ ان کے پوتے شاہ حامد بن علاؤالدین بن شاہ سراج متوفی ۱۱۸۳ھ کی بیاض میں ان کی تاریخ وفات کا یہ قطعہ درج ہے۔

منبع جود و کرم چشمۂ فیض اتم
معدن لطف و کرم شاہ سراج زماں
زبدۂ اہل کرم اسوۂ صحبۂ عظام
مرجع کل انام کاشف سر نہاں
روشن تراز آفتاب ہادی راہ ثواب
خاتم الاولیا خطاب مرشد اہل جہاں (کذا)
بود روز دوشنبہ بست و پنجم رجب
کہ شدہ تاریخ وصالش شیخ قطب زماں (کذا)

شاہ شمس الدین شاہ سراج کے فرزند تھے جن کا ذکر ولی نے اس شعر میں کیا ہے۔

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا
چمن میں ہے شور جن کی ابروی پر چین کا

شاہ شمس الدین کا مزار موضع بسو درہ میں ہے فرزندان شاہ عبدالحق

بن شاہ وجیہ الدین کی مدد معاش کے لئے شہنشاہ جہانگیر نے بطور التمغا[1] عنایت کیا تھا۔ شاہ صاحب کا انتقال بھی اسی موضع میں ہوا اور ان کا مزار بھی وہاں ہے۔ فی الحال موضع بسودرہ ان کی اولاد میں سے محب مکرم سردار پیر سید احمد صاحب کی قبض و تصرف میں ہے۔

شاہ کامل و اکمل دونوں حقیقی بھائی تھے۔ ان دونوں بزرگوں کا ذکر وَلی نے اس طرح پر کیا ہے:۔

ولی اس ماہ کامل کی حقیقت کو جو نئیں سمجھا
وہ ہرگز نئیں بجھا عالم میں اکمل کے معانی کوں

شاہ اکمل کی تعریف میں وَلی نے یہ غزل صنعت توشیح میں کہی ہے:۔

حق نے تجھ قد کوں دیکھ مثل الف — خوش قداں کا تجھے امام کیا
کاف کوفی ہے اس کمر کا پیچ — جگ نے اسکوں سر کلام کیا
تجھ دہن نے کہ میم معنیٰ ہے — دلِ سیماب میں مقام کیا
تا کہے خلق تجکوں ماہ تمام — زلف تیری کوں حق نے لام کیا

نام تیرا ولی نے اے اکمل
شوق سوں وردِ صبح و شام کیا

شاہ اکمل حافظ قرآن بھی تھے جیسا کہ وَلی کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

حق ترا جگ میں کیوں نہ ہو حافظ — کہ تجھے حافظِ کلام کیا
اکملیّت کا تجکوں دعویٰ تھا — حق نے دعویٰ ترا تمام کیا

---

[1] یہ ترکی زبان کا لفظ ہے آل بمعنی سرخ اور تمغا بمعنی مہر۔ وہ سند جس پر سرخ مہر یا طغرا ثبت ہو۔ یہ انعام جاگیر کی ایک خاص قسم ہے جو واپس نہیں لی جاسکتی اور نسلاً بعد نسلٍ لڑکے اور لڑکیوں کی وراثت میں جاری رہتی ہے۔

ان دونوں بزرگوں کی اولادیں آج بھی احمدآباد میں موجود ہیں جن میں سے ہمارے محترم سید منظورالحسن عرف حسینی پیر علوی بھی ہیں۔

اس وقت کی رسم قدیم کے مطابق عموماً شعرا اپنے دوستوں کی تعریف اس طرح کرتے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا وہ ان کے محبوب تھے۔ اور اسی بنا پر بعض اہل قلم اور مصنّفین (آصفی، زور دیادگار ولی) احسن (مقدمہ) وغیرہ نے ولی کو رند شاہد باز سمجھ لیا ہے، لیکن یہ غلط ہے دیوان ولی میں عموماً تمام احباب کی تعریف ایک ہی طرز پر یعنی ان کا سراپا اور ان کی بعض خوبیاں دکھائی ہیں۔ ان احباب کے نام جو غزلیں لکھی گئی ہیں ان کو ہم ہر ایک کے نام کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں تاکہ اس سے ولی کے متعلق جو غلط خیال قائم کیا گیا ہے اس کی تردید ہوسکے۔

ولی کے زمرۂ احباب میں ان کے ایک محب بلکہ محبوب دوست سید ابوالمعالی یا سید معالی ہیں جن کی نسبت حمید نے لکھا ہے کہ وہ احمدآباد کے مشائخ زادے تھے۔ ولی کو ان سے خاص اُنس تھا چنانچہ ان کی تعریف میں کئی اشعار ہم کو دیوان ولی میں ملتے ہیں۔ اشعار ذیل میں ان کا سراپا اس طرح بیان ہوا ہے۔

ترا قد دیکھ اے سید معالی — ہوئی روشن دلاں کی فکر عالی
ترے پانواں کی خوبی پر نظر کر — ہوئے ہیں گلرخاں جیوں نقش قالی
شفق لوہو میں ڈوبا سر سوں پگ لگ — تو باندھا سر پہ جب چیرا گلابی
ہوا تیرے خیالوں سوں سراپا — مرا دل مثل فانوس خیالی
تری انکھیاں دسیں مجھ یوں نشۂ مست — پیا گویا شراب پرتگالی
گیا ہے خوف سوں اُڑ لعل کا رنگ — ترے یاقوت لب کی دیکھ لالی
خیال اس خال کا از بس ہے دلچسپ — نہیں دنیا میں یک دل اس سوں خالی
ترے لب اور ترے ابرو کے دیکھے — پڑھوں شعر زلالی اور ہلالی

تری انکھیاں میں ڈورے دیکھکر سرخ — بنائی خلق نے ریشم کی جالی
کرے تا استراحت مجھ انکھا میں — کیا ہے دو پلک توشک نہالی
اگر پوچھے وہ بے پروا مرا نانوں — کہو مشتاقِ رندِ لا ابالی
ہوئے معزول خوباں جگ کے جب سوں — ہوا تو حسن کے کشور کا والی
ولی تب سوں ہوا ہم کارِ فرہاد
سنا جب سوں تری شیریں مقالی (ص ۲۲۷)

ایک اور غزل میں غالباً انہی کا سراپا ولی کے پیش نظر ہے چنانچہ پانچویں شعر میں فرماتے ہیں۔

ہوا مجھ دل کی جنت میں سوں ہر یک آہ جیوں طوبیٰ
لٹک چلنا جو دیکھا بسکہ میں سید معالی کا (ص ۲۰)

ان رنگین اشعار کے لئے معذرت چاہتے ہوئے کہتے ہیں :-

رنگیلے شعر کا کہنا کیا تھا ترک مدت سوں
ترا قد یو ہوا ہے پھر کے باعث فکر عالی کا

سید معالی کی نسبت تذکروں میں صرف اسقدر لکھا ہے کہ ۱۱۱۲ھ میں ولی ان کے ہمراہ دلی گئے تھے۔

قائم نے لکھا ہے :-

"درسن چل و چار از جلوس عالمگیری بادشاہ ہمراہ میرابوالمعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بجہاں آباد آمد گاہ گاہ بزبان فارسی دو سہ بیت در وصف خط و خالش می گفت"۔ (مخزن نکات صہ۱۰)

حمید لکھتا ہے :-

"وبجانب میاں سید معالی کہ از مشائخ زادہ ہائے گجرات بودند میل تمام داشت"۔ (ص ۸)

ولی کی طرح ان کے شاگرد اشرف گجراتی بھی سید معالی کے حسن و جمال کی

تعریف میں ایک پوری غزل لکھی ہے۔

ے معانی حسن میں سب سوں بڑا ہے
اسے دیکھن کوں کئی عالم کھڑا ہے

ایک اور غزل میں اشرف نے لکھا ہے۔

ے جگت کے خوبرو سارے نہ ہوئیں کیوں حکم میں اس کے
دیارِ حسن میں فرخ سیر سیّد معانی ہے

اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ سید معانی فرّخ سیر کے زمانے یعنی ۱۱۳۱ھ تک گجرات میں بقید حیات تھے

ولی کے دیوان میں ایک غزل ۵ شعر کی ہے جو محمد مراد کی تعریف میں کہی گئی اس کا مطلع ہے۔

ے جس دلربا سوں دل کوں مرے اتحاد ہے
دیدار اس کا میری انکھاں کی مراد ہے

مقطع میں محمد مراد کا نام آیا ہے۔

ے مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے
جو مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے (ص ۲۵۹)

یہ اورنگ زیب کے محلات کے پروردہ اور دربارشاہی کے متوسلین میں سے تھے۔ پہلے احمدآباد صوبۂ گجرات کے پرگنات کی وقائع نگاری اور سوانح نگاری پر مامور رہے، پھر ترقی کر کے گودھرا اور رٹھاسرا (گجرات) کے فوجدار ہو گئے۔ ۱۱۲۲ھ میں اورنگ آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ اسی سال وہاں سے ان کا تبادلہ ہو گیا اور اسی سال وہ انتقال کر گئے لہ (مآثر الامراء ج ۳ ص ۶۸۲ تا ص ۶۹۲) غالباً قیام

لہ مآثر الامراء ج ۳ ص ۶۸۲ تا ص ۶۹۲۔

گجرات کے زمانہ میں ولی کے تعلقات ان سے قائم ہوئے ہوں گے۔

اسی طرح محمد یار خاں کی تعریف میں بھی ولی نے یہ مطلع کہا ہے۔

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد یہ ہندوستان
حسن کی دلی کا صوبہ ہے محمد یار خان

محمد یار خان شاہجہان آباد کے قلعہ دار امرائے عالی نسب میں سے آصف خاں کے پوتے تھے[۱] (دہلی کے ناظم تھے) اور غالباً قیام دہلی کے زمانہ میں ان سے تعلقات رہے ہوں گے معلوم ہوتا ہے کہ محمد یار خان خود بھی اچھے شاعر تھے اور شعراء کے قدر دان۔ اکثر ان کے مکان پر شعراء کا مجمع رہا کرتا تھا۔ اور مقامی و بیرونی مقامات سے آنیوالے شعراء ان کی شعری و ادبی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے قائم نے آزاد اور فراقی نامی دکنی شعراء کا ان کے ایام صوبہ داری میں دلی جانا بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ محمد یار خان کا انداز کلام کثرت صحبت کے سبب ان کو اسقدر پسند آیا کہ وہ دونوں ان کا اتباع کرتے جیسا کہ ان کے طرز کلام سے ظاہر ہے[۲]۔

ولی نے اپنے معاصرین میں سے دو دکنی شاعروں آزاد اور فراقی کا ذکر کیا ہے اور ان کے مصرعوں کی تضمین کی ہے۔

ع آزاد سے سنیا ہوں یو مصرع مناسب
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

ع ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جبکہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

---

[۱] منتخب اللباب میں خافی خاں نے ۱۱۱۷ھ، ۱۱۱۹ھ اور ۱۱۳۲ھ کے واقعات میں محمد یار خان کا ذکر کیا ہے۔ دیکھو ج ۲ صفحہ ۳۸۰، صفحہ ۵۴۲، صفحہ ۵۷۷ اور صفحہ ۹۱۵۔

[۲] مخزن نکات صفحہ ۷،

ایک شعر میں فراقی پر معاصرانہ طنز بھی کی ہے۔

ے ترے اشعار ایسے نیں فراقی
کہ جن پر رشک آدے گا ولی کوں۔

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولی کی ملاقات ان دونوں سے ہوئی تھی اور قرین قیاس ہے کہ محمد یار خان کے ہاں دتی میں ان سے صحبتیں رہی ہوں گی۔

ولی کے زمرۂ احباب میں چند ہندو دوست بھی تھے ان میں گوبندلال امرت لال، ببرلال اور کھیم داس بیراگی کے نام انہوں نے مستقل غزلیں لکھی ہیں۔ جن سے ولی کے ان کے ساتھ الفت آمیز اور دوستانہ روابط کا پتہ چلتا ہے گوبند لال کے نام کی ردیف میں ۵ شعر کی ایک غزل ہے۔

ے ہے آج خوش قداں میں کمالِ گوبندلال
استادِ چال سرو ہے چالِ گوبندلال
برجا ہے اس کے دل کوں کہوں گلشن بہار
آتا ہے جس کے دل میں خیالِ گوبندلال
خوباں حیا سوں غرق عرق ہوں تو کیا عجب
جس وقت جلوہ گر ہو جمالِ گوبندلال
ہے بسکہ بے مثال نہ دیکھا ہے خواب میں
آئینۂ خیال مثال گوبندلال
کر اس دعا کوں وردِ زباں اے ولی مدام
لطف خدا ہو شاملِ حالِ گوبندلال (ص ۱۲۱)

اس غزل سے پہلے کی ایک غزل کے مقطع میں ولی فرماتے ہیں۔

ہرگز نہ ڈبوے رسم وفا ہاتھ سوں ولی
یکبار اس غزل کوں سنے گر گوبندلال (ص ۱۳۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوبند لال کو بھی شعروسخن سے ذوق تھا۔
اسی طرح ایک شعر کی ایک غزل امرت لال کے متعلق لکھی ہے جس میں
ان کے نام کی ردیف رکھی ہے۔

شمع بزم وفا ہے امرت لال | سروِ باغِ وفا ہے امرت لال
ماہ نو کی نمن ہے سب کوں عزیز | اس سبب کم نما ہے امرت لال
دل مرا کیوں نہ بند ہو اس کا | آج رنگین قبا ہے امرت لال
خوش لباسی کی کیا کروں تعریف | وضع میں میرزا ہے امرت لال
اس سوں بیگانگی کبھو نہ کرے | جس ستی آشنا ہے امرت لال
لعل تیرے نے بھرے ہیں امرت سوں | نام تیرا بجا ہے امرت لال

اے ولی کیا کہوں بیاں اس کا
لطف میں دلربا ہے امرت لال (صنٹ ۱۳۰، صنٹ ۱۳۶)

ان اشعار سے امرت لال کی وفاداری، خوش لباسی اور حسن کی تعریف نکلتی ہے۔ بیر لال بھی ایسے ہی ایک محبوب دوست تھے جن کے نام ایک غزل کے مطلع میں اس طرح آیا ہے:-

دیکھا جو بیر لال کوں اکرم کے باغ میں
پہنچی ہے بوئے عشق کی اس کے دماغ میں

اکرم سے مراد شیخ الاسلام عبدالوہاب کے پوتے شیخ محمد اکرام الدین ہیں جو ولی کے زمانہ میں احمد آباد کے صدر صوبہ اور مولانا نورالدین کے شاگرد تھے۔ غالباً انھوں نے کوئی باغ لگایا ہو گا۔ جہاں ولی اور ان کے احباب تفریحاً سیر کو جاتے ہوں گے۔

یہ تینوں غالباً احمد آباد کے بنیہ یا کائستھ یا ناگر قوم میں سے ہوں گے کہ لال کا لاحقہ عموماً گجراتی بنیوں یا ناگروں اور کائستھوں کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک نوجوان بیراگی کھیم داس

نامی سے بھی ولی کو انس تھا جس کی تعریف میں ولی نے یہ غزل کہی ہے :-

ہے بسکہ آب و رنگِ حیا کھیم داس میں
آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

ہے اسکے مکھ سوں جلوہ نما موجِ آبِ تاب
موتی کی مثل گرچہ ہے سادہ لباس میں

براگیوں کے پنتھ میں آ کر وہ مہ جبیں
بیراگ کوں اٹھا کے چڑھایا اکاس میں

لگتا ہے اس گروہ میں وہ سروِ نازنیں
گویا گلِ گلاب کیا جلوہ گھاس میں

اس کی بھواں کوں بوجھ کے شمشیر آبدار
اہل ہوس کی عقل ہے دائم ہراس میں

آوے فلک سوں زہرہ اتر گردہ مہ جبیں
یک تان گاوے رام کلی یا بھاس میں

جاتا ہوں باغ یاد میں اس چشم کے ولی
شاید کہ بو اسی کی ہو نرگس کے باس میں

ان اشعار سے جہاں بیراگی موصوف کی سادگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنِ موسیقی میں بھی دخل رکھتا جو عموماً اس فرقہ کے لوگوں کا شیوہ ہے۔ بیراگیوں کا ایک فرقہ ہے جو عموماً ترکِ علائق اور ترکِ لذت کر کے دنیاوی معاملات سے کنارہ کش رہتا ہے۔

(محبوب الزمن ج ۲ ص ۱۱۳۶ ص ۱۱۳۷)

آصفی ملکاپوری نے گوبند لال کو گوہر لال کر دیا ہے اور اس کو نیز امرت لال کو دلی کا بتایا ہے جس کے لئے کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا۔ کھیم داس بیراگی کو "اورنگ آباد کا لالہ کھیم داس" بنا دیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔

تلامذہ

ولی جیسے ماہرِ فن استاد اور موجد ریختہ گوئی کے کئی شاگرد ہوں گے جن کے ناموں سے ہم واقف نہیں صرف چند شعرائے گجرات کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ ان کو ولی ایسے جگت اُستاد سے فخرِ تلمذ حاصل تھا اگرچہ ولی کے کلام میں ان میں کسی کے نام کا اشارہ نہیں پایا جاتا۔ ان میں اشرف سب سے پیش پیش ہے۔ ولی نے اپنے کلام میں صرف اشرف کے ایک مصرعہ کی تضمین کی ہے :-

اشرف کا یو مصرع ولی مجکوں ہے دلچسپ

"الفت ہے دل و جاں کو میرے پیہم نگر سوں"

لیکن اس سے استادی شاگردی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ شفیق نے اشرف کو صرف معاصر ولی لکھا ہے[1]، لیکن حمید نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ۔ "محمد اشرف، اشرف تخلص گجراتی، بلا واسطہ شاگرد ولی محمد طبع رنگین داشت شعرئیں در نواح گجرات شہرت دارد و دیوانِ لطیف تصنیف"[2] اس کے بعد اس کی یہ غزل نقل ہے جس کا مطلع ہے۔

ہوا ہوں بستۂ زلفِ سجن شکن کی قسم

ہوا ہوں صید رام من ہرن ہرن کی قسم

اسی ردیف میں مگر مختلف بحر و قافیہ میں ولی کی دو غزلیں موجود ہیں۔ حمید کے بیان کی توجیہ اس طرح کی گئی ہے:۔

"حمید کا مدعا غالباً یہ ہے کہ اشرف باضابطہ شاگرد ولی تو نہ تھا لیکن اس کے کلام سے فیض اٹھایا ہے شاید ایسا ہو۔ لیکن اب تک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرف یا ولی کے کلام سے ان کے استاد و شاگرد ہونے کا ثبوت ملتا ہے"۔ بہر حال معاصرت مسلّم ہے"۔

(رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۵ء میں شیخ چاند مرحوم کا مضمون اشرف پر)

لیکن "بلا واسطہ شاگرد" کے معنی تو یہ ہوتے کہ وہ براہ راست شاگرد تھا تاہم اگر حمید کا بیان ناقابل تسلیم ہو جسکی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تو ہم ذیل میں خود اشرف کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جس میں اس نے ولی کے مصرعوں کی تضمین کرتے ہوئے اس حیثیت سے ذکر کیا ہے کہ جیسے ایک شاگرد اپنے استاد کا ذکر کرتا ہے۔

---

[1] چمنستانِ شعراء [2] گلشنِ گفتار

ے یو مصرع شعر ولی اشرف تو کر ورد زباں
غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو

ے کرتا ہے یو مصراع ولی صید دل اشرف
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا

اشرف ولی کا شاگرد ہے جب ہی تو وہ اس پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے

ے ہے جب سوں شعر میرا شعر ولی سے ہمرنگ
اشرف تیرے سخن کی نت آرزو ہے دل میں

ے ولی کے طور پر مجھ سا نہیں کوئی ریختہ بولیا
سخن ہے ملبذل جگ میں زبان اصفہانی کا

ے شعر کہنے میں ہے اشرف کوں ولی کا مرتبہ
اس سبب سے شاعراں ہیں مدتی سوں اسکے مرید

کیا مندرجہ ذیل دو شعروں میں ولی کی شاگردی کا اظہار نہیں ہوا:۔

ے مجکوں ہے ارشاد اے اشرف ولی سوں یو سخن
"ترک کرنا عشق کوں دشوار ہے دشوار ہے"

ے ولی نے یو غزل اشرف کرم سوں مجکو بخشی ہے
سو اپنے نام سے اسکوں کیا جاری نکو پوچھو

ہم نہیں سمجھتے کہ حمید کے بیان اور اشرف کے ان اشعار کے بعد ولی سے ان کا تلمذ ثابت کرنے کے لئے اب کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے۔ حمید نے اپنے تذکرہ میں اشرف کا نام محمد اشرف لکھا ہے ہمارے سامنے جو مخطوطہ دیوانِ اشرف کا ہے اس میں بھی ہر جزو کے شروع میں "اشرف الموسوی المدنی الشاہی" لکھا ہوا ہے۔ ایک دستاویز پر اشرف کی مہر اور دستخط پائے گئے ہیں۔ (۱۰۹۸ھ کا یہ فروخت مکان کا دستاویز ہے۔ جو حضرت شاہ وجیہ الدین کی اولاد سے شیخ یحیٰی کی صاحبزادی امتہ السلام

کے نام سے ہے اس پر ولی کے دستخط بھی ہیں۔ یہ دستاویز سید حسن علی اختر غوثی دولت خانہ احمد آباد کے پاس موجود ہے)

"آنچہ در متن است بندہ محمد اشرف ولد غفران پناہ حضرت شیخ محمد موسیٰ مدنی قدس سرہ را قبول است" اس کے نیچے حسب ذیل مہر ہے

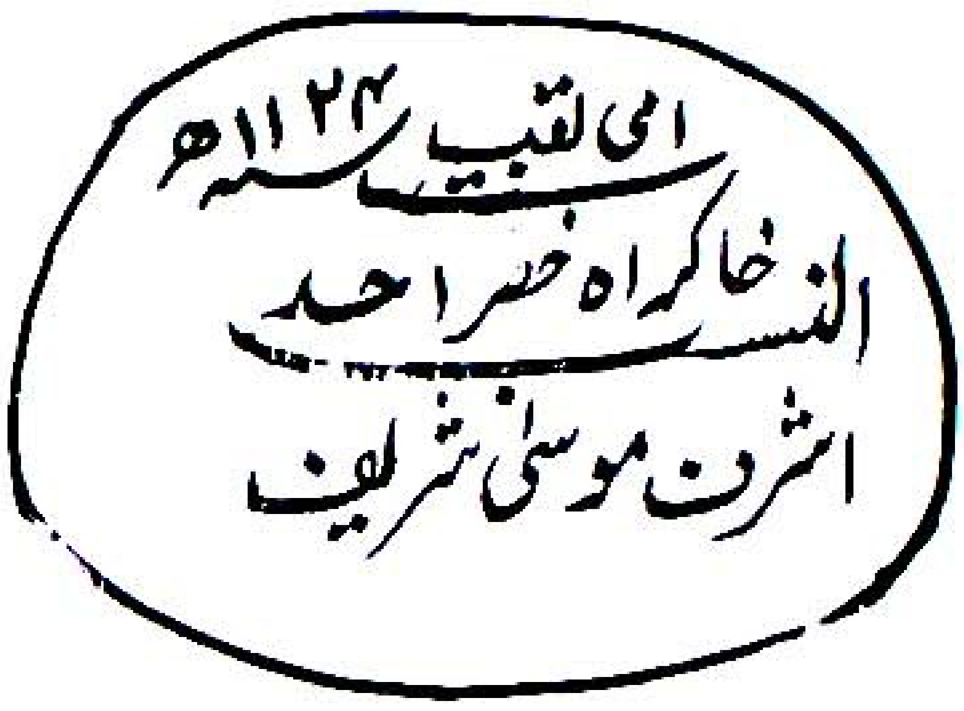

خاک راہ حضرت احمد اشرف موسیٰ شریف النسب امی لقب سنہ ۱۱۲۴ھ

ہمارے خیال میں یہ اسی اشرف کی مہر اور دستخط ہیں ان کے والد محمد موسیٰ مدنی کے نام سے وہ اپنے تئیں "موسوی المدنی" لکھتا ہے۔ "شاہی" سے مراد حضرت شاہ عالم سے ارادت ہے خود شیخ موسیٰ مدنی کی مہر ایک دستاویز پر اس طرح ہے۔

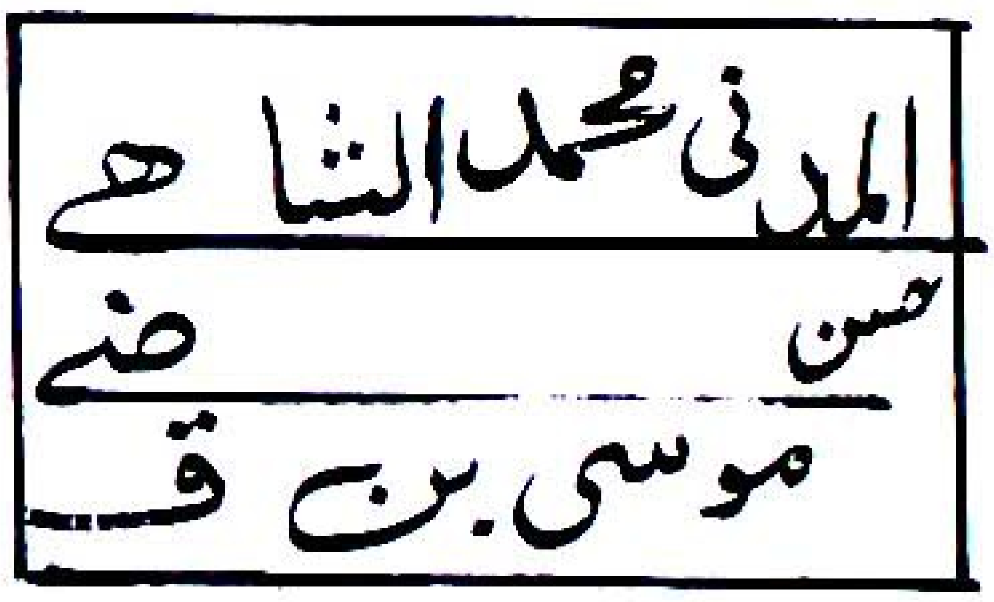

موسیٰ بن قاضی حسن المدنی الشاہی

الموسوی المدنی الشاہی یہ تینوں نسبتیں اشرف کے نام کے ساتھ ہیں خود ان کے والد کے نام کے ساتھ بھی موجود ہیں۔

ولی کی بیوی نے ۱۱۱۱ھ میں ان کو داغ مفارقت دیا۔ اس عالم پیری میں جبکہ ولی کی عمر ۵۵ یا ساٹھ سال سے کم نہ ہوگی رفیقہ حیات کا اس طرح جدا ہو جانے سے شاعر کے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور غالباً اسی سال یا دوسرے سال وہ حج بیت اللہ کو چلے گئے "مدح بیت الحرام" میں جو قصیدہ ان کے کلیات میں ہے اس کی نسبت میں بعض اشعار ولی

کے اس سانحۂ غم کی طرف صاف اشارہ کرتے ہیں۔

کیا ہے غم مجکوں اگر جگ میں نہیں مونس غم
آہ یہ بس ہے مرے درد کوں دل کے مرہم
جگ کی مجلس ستی "دل سوز" ہوئی بسکہ عدم
شمع کے باج نہ دیکھا ہوں کہیں رشتۂ غم
شمع مجھ حال پہ دل جال اپس کا سب بس
ہو کے بیتاب دم صبح چلی ملک عدم
دل پر درد کوں دارو ہے اگن پر روغن
داغ پر داغ ہوا زخم پہ میرے مرہم
تجھ بن اے پاک گہر دل سوں ہوا حاصل مجھ
موج دریا کی نمی غم کے تئیں چھپے غم پیہم
عشرت جم کی نمی عیش اچھو تجھ کوں صنم
جام لب تیرے دہن کوں ہو مبارک جم جم
گل کوں غیرت سے کیا تو تجھ گلاب اے ظالم
سینہ چاکاں کے اوپر کیا ہے اتنا جور و ستم (صفحہ ۳۶۶ کلیات)

کون کہہ سکتا ہے کہ ولی نے اپنی شریک زندگی کے ماتم میں یہ پُر درد نوحہ نہیں لکھا۔ "مونس غم" "دل سوز" اور "شمع" اور "پاک گہر" سے اس رفیقۂ حیات کی صفات حمیدہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ولی کی ان کے ساتھ دلبستگی اور گہری موانست کا پتہ بھی چلتا ہے۔

ان پاک گہر بی بی کی تاریخ وفات ان کے پوتے شریف میاں نے اس طرح لکھی ہے۔

" بانوی نیک (خو) و پاک سرشت
کرد رحلت سوئے سرائے بہشت

سال تاریخ از خدا جستم
سلخ شعبان بگفت وآب بہشت   (اعراس نامہ ص۹۲)

"سلخ شعبان" کے عدد ۱۱۱۲ نکلتے ہیں ان میں سے "آب" کے تین عدد کا تخرجہ کیا جائے تو ۱۱۱۰ھ ہوتے ہیں "آب بہشت" یعنی آب کو چھوڑ (از ہشتن)

فنون لطیفہ سے دلچسپی

ولی کی شاعری میں جمالیاتی عنصر بہت نمایاں ہے جس کا سبب ان کی سچی حسن پرستی اور جمالیاتی مذاق صحیح (ہے شاعری) کے ساتھ ساتھ دیگر فنون لطیفہ سے شوق و رغبت رکھنے کے اشارات ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ فن مصوری نے شاہان مغلیہ کے زمانہ میں بڑی ترقی کی ہے اور گجرات کے بعض مسلمان مصوّرین کا دربار اکبری میں پہنچنا بعض تواریخ سے معلوم ہوتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات میں شعروادب کے ساتھ ساتھ مصوّری سے بھی لوگوں کو دلچسپی پیدا ہوئی ہو گی۔ ولی کے بعض اشعار میں مصوری کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

تیری کمر مصوّر چترا ہے کس ادا سو ل

ولی کے زمانے میں فرنگیوں (پرتگیزوں) نے گجرات کے سواحل پر بعض حصص ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اکثر یوروپین سیّاح گجرات میں آیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ممکن ہے کہ یورپ کی مصوّری کے بعض شاہکار یہاں پہنچے ہوں ۳ سنہ جلوس میں مقرب خان صوبہ دار گجرات نے ایک فرنگی پردہ جو فرنگی نقاشی کا بہترین نمونہ مانا گیا تھا۔ جہانگیر کی خدمت میں بھیجتا ہے (توزک ص۶۸) اسی سال وہ امیر تیمور کی ایک تصویر جو کسی فرنگی مصوّر کے ہاتھ کی تھی دربار میں بھیجتا ہے (توزک ص۷۳) ولی کے ایک شعر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ہوئے ہیں دنگ تصویر فرنگ دیکھ
تیری صورت کہ بو رشک دمن ہے

گجرات میں دمن فرنگیوں کا ایک مقام ہے۔

فن موسیقی میں اہل گجرات کو ولی سے تقریباً شہرت حاصل ہو چکی ہے گجرات کا مشہور مغنی بیجو باورا کے کمال موسیقی دانی کا ذکر گجرات کی تواریخ میں مذکور ہے۔ جس نے ہمایوں کے دربار میں گرفتاری کے بعد اپنے کمال فن سے بادشاہ کو اس قدر خوش کر دیا کہ اس نے نہ صرف انعام واکرام سے مالا مال کر دیا بلکہ اس کے ساتھ ہی دیگر گجراتی اسیران جنگ کو بھی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بھی کئی فن موسیقی کے ماہرین گجرات میں ہوئے ہیں۔ خود ولی کے دوستوں میں ایک بیراگی کھیم داس تھا جو بہت اچھا گویا تھا چنانچہ ولی اس کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

آوے فلک سوں زہرہ اتر کر وہ مہ جبیں
یک تان گا دے رام کلی یا بھاس میں

یہ دونوں راگ اسقدر مشکل ہیں کہ اچھے گویئے گانا تو درکنار ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔

ان کا یہ شعر بھی فن موسیقی کے اصول سے تعلق رکھتا ہے:۔

ملنا بجا نہیں ہے مخالف سوں ایک آن
اس تان کو بجا اے ربابی رباب میں

مندرجہ ذیل اشعار میں ان کی موسیقی سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔

ہے گرم رقصِ شوق منیں مونس فلک
گایا ہوں جب سے نغمہ عشاق ہیں ملک

اے زہرہ جبیں کشن ترے مکھ کی کلی دیکھ
گاتا ہے ہر اک صبح کوں اُٹھ رام کلی کوں

اس پر شفیق نے یہ اصلاح دی ہے کہ اگر گاتا ہے کی بجائے "کہتا ہے" لکھا ہوتا تو حرف گیروں کے طعن سے بچتا۔ لیکن شاید شفیق نے اس سے مطلب یہ لیا ہے کہ کشن ہر صبح کلی سے رام کہتا ہے حالانکہ یہاں گانا زیادہ موزوں ہے۔

گجرات کے چند قدیم شعرائے اردو

گجرات میں آٹھویں صدی ہجری کے بعد سے اردو شعر و شاعری کے آغاز کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے پہلے وہ یہاں وجود میں آچکی تھی۔ اگرچہ نویں اور دسویں صدی کے صرف چند شعرائے قدیم مثلاً شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ، شیخ محمود دریائی بیرپوری (۸۷۳ھ - ۹۴۱ھ) اور شاہ علی جیو گام دھنی (۸۹۶ھ - ۹۷۳ھ) اور شاہ خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) کا کلام دستیاب ہوا ہے۔ جو گجرات کی قدیم اردو یعنی گوجری زبان میں ہے لیکن اس کے بعد کے زمانے کے گجراتی شعراء کا کلام نہیں ملتا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ زوالِ سلطنت گجرات کے بعد سے اکثر مسلمان شرفا صوفیا اور مشائخ کے خاندان دکن کے مختلف حصّوں میں جا بسے تھے اس لئے ان میں سے اکثر گجراتی شعراء اور مصنّفین کا کلام گجرات میں کہیں محفوظ نہ رہا یا لوگوں کی بے توجہی سے ضائع ہو گیا اور آج ولی اور ان کے چند معاصرین کے سوا گجراتی شعراء کا قدیم کلام نہیں ملتا۔ ان چند شعراء میں سے بھی اکثر شعراء کو ہمارے بعض اہلِ قلم نے دکنی بنا دیا ہے۔ یا بنانے کی کوشش کی ہے۔ صرف اس بنا پر کہ ان کا کلام ایسی زبان میں ہے جو دکنی اردو سے ملتی جلتی ہے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے حالات کا پتہ نہیں چلتا ایسی صورت میں ان کے کلام کا نمونہ پیش کر کے ان کو دکنی

منوا لینا زیادہ آسان کام تھا۔ ممکن ہے کہ بالارادہ اور دیدہ و دانستہ ایسا نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ تحقیق و جستجو کو کام میں نہ لا کر محض یکطرفہ رائے قائم کرتے ہیں عجلت سے کام لیا گیا ہے۔ جو گجراتی اور دکنی زبانوں کی خصوصیات پر کامل غور و تفحص نہ کرنے کا نتیجہ ہے، چنانچہ ولی گجراتی کو دکنی مان لینے کی ایک بیّن مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔

گجراتی شعراء کو دکنی سمجھ لینے میں جو دھوکا ہوا ہے اس کا خاص سبب ہمارے خیال میں گوجری اور دکنی زبان کی ما بہ الامتیاز خصوصیتوں سے ناواقفیت یا اغماض ہے۔ مختلف اوقات میں گجراتی صوفیا اور شعراء کا نقل مکانی کر کے دکن میں جانا ان کے تذکروں اور تاریخوں میں مذکور ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ذریعہ سے گوجری زبان کی دکن میں کافی اشاعت ہوئی جس نے دکنی زبان پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اکثر محاورے، الفاظ اور ترکیبیں دکنی میں عام طور سے رائج ہو گئیں اور دونوں زبانوں میں اس قدر مشابہت پیدا ہو گئی کہ ان میں فرق کرنا دشوار ہو گیا۔ ان حالات میں گوجری کو دکنی مان لینا یا گجراتی مصنّفین اور شعراء کو دکنی شمار کر لینا قرینِ قیاس ہو سکتا ہے ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ بعض ہم نام دکنی شعراء اور مصنّفین کے ساتھ گجراتی مصنّفین کے ناموں کو خلط ملط کر دینے سے ان کو غلط طور پر دکن سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں ہے کہ دکنی زبان و ادب کی اشاعت کی دُھن میں ہمارے دکنی مصنّفین اور اہلِ قلم نے اہلِ گجرات کے کئی ادبی و شعری کارناموں پر بے جا تصرّف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اُردو زبان و ادب کے محقق پروفیسر شیرانی مرحوم نے بالکل صحیح طور پر فرمایا ہے کہ:

"دکنی زبان و ادبیات نے ہمارے تخیّل پر اسقدر زبردست قبضہ پالیا ہے کہ غیر دکنی مصنّفین کو دکنی تسلیم کر لیا گیا ہے اور ہمیں مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ دکن کی شہرت نے گجرات کے کئی کارناموں کو اس سے چھین لیا ہے اور ایک گجراتی یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہے ؎

طالع شہرت رسوائی مجنوں بیش است
ورنہ طشتِ منِ داغ ہر دو زیک بام افتاد

دکنی اہل قلم نے "دکھنیات" کے شوق میں کئی گجراتی مصنّفین اور شعراء کے کلام کو گجرات سے نکال کر دکن میں شامل کر دیا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں مدزمانہ حال کی بعض تصانیف وغیرہ میں پائی جاتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ایک دکنی ادیب کا یہ خیال گجراتی شعراء اور مصنّفین کے متعلق بالکل صحیح اور درست ہے کہ "بدقسمت شاعروں اور مصنفوں کی ایک پوری جماعت ہے جو اس ستم ظریفی کا تختہ مشق بن گئی ہے" اس جماعت میں سے سردست ہم مندرجۂ ذیل شعراء و مصنّفین گجرات کے نام پیش کرتے ہیں :-

(۱) احمد (۲) ولی (۳) اشرف (۴) رضی (۵) امین (۶) فتح شریف (۷) غلامی (۸) رحمان (۹) عاجز (۱۰) ہاشم علی (۱۱) عزلت (۱۲) محمود گجراتی (۱۳) فخری

ان شعراء میں سے بہت کم ایسے ہیں جن کے حالات تذکروں میں پائے جاتے ہیں اور وہ بھی صرف چند سطروں سے زیادہ نہیں ہیں ان میں سے صرف ولی کا دیوان چھپا ہے بعض شعراء کے دواوین کے مخطوطات ملتے ہیں یا ان کا متفرق کلام کہیں کہیں تذکروں اور قلمی بیاضوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے بعض مصنّفین نے ان کے کلام کا نمونہ اپنی کتابوں میں

دیاہے۔ اور اس پر رائے زنی کی ہے اور ان کو دکنی شعرا میں شمار کر لیا ہے اس مضمون میں ہم ان کے اس خیال کی تردید کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ان کا تعلق گجرات سے تھا۔

میر تقی نے اپنے تذکرے میں احمدی گجراتی نامی شاعر احمد کا صرف نام لکھا ہے اور اس کی ایک غزل کے ۵ شعر نقل کئے ہیں (نکات الشعراء)

میر حسن نے دو احمدوں کا ذکر کیا ہے اور ان دونوں کو گجراتی بتایا ہے:

(۱) "احمد گجراتی از قدیم است دیگر احوالش معلوم نیست از دست:

ہوئے دیدار کے طالب خودی سے خود گزر نکلے

نہ پائی راہ دانش میں خرد شاں بے خبر نکلے (ص۴)

(۲) "احمد: احمد گجراتی دیگر در زبان سنسکرت و بھاکا می گویند کہ تصانیف بسیار دارد چوں معاصر شاہ ولی اللہ بود دو سہ ریختہ نیز گفتہ:

شب جھوٹے وعدوں پر جو تیرے ہم بہک گئے

کوئی لاکھ بار گھر سے اٹھے در تلک گئے

پوچھی تھی کل بتاں سے کہیں دل کی میں خبر

سو آج آ کے سر سے وہ میرے پک گئے

احمد بتا میں کیا کروں اب راہِ عشق میں

سر پر تو سایہ بخت پڑ گئی اور پانو تھک گئے (ص۵)

قائم نے احمد کے تذکرہ میں لکھا ہے۔ (ص۷تا۸)

"احمد گجراتی شعر ہندی می گفت کہ عبارت از گیت (کبت؟) دوہرہ باشد، در علم سنسکرت و بھاکا ید طولی داشت و در فن خود سرآمد روزگار بود والحق کہ دو سہ دوہرہ از تصنیفش شنیدہ شد زاں کلامش بسیار دلنشین است چوں معاصر شاہ ولی اللہ بود گاہ گاہے فکر شعر ریختہ نیز می نمود چنانچہ ایں دو سہ بیت از نتائج اوست:-

شب جھوٹے وعدوں پر جو ترے ہم بہک گئے
کوئی لاکھ بار گھر سے اٹھے در تلک گئے
پوچھے تھے کل میاں سے اس دل دیکے میں خبر
سو آج لا کے سر تے میرے پٹک گئے
احمد بتائیں کیا کروں اب راہِ عشق میں
اک سانجھ پڑگئی ہے دوجی پاؤں تھک گئے "

علی ابراہیم خاں نے بھی اسی احمد کا تذکرہ لکھا ہے جو قائم کے تذکرہ سے منقول معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح میر قدرت اللہ قاسم نے (مجموعۂ نغز ۲ جلد ص۲۷۳) دو قدیم احمدوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) "اول عزیزے از قدما کہ دیدہ شد چندے از اشعارش در دیرین سفینہا ایں سہ بیت او راست ؎

گر بیضۂ زاغے کسے در زیر سیمرغے نہد	از اصل خود ناید بروں آخر کگیلا ہوئے پر
گر طفلکے بازیگرے خوانندہ و عالم شود	اصلے کہ دارد کے رود آخر زنبورا ہوئے پر
گر بچۂ شیرے کسے با شیر روبہ پرورد	مردی کہ دارد کے رود آخر بگھیلا ہوئے پر

(۲)۔ دوم شخصے از سکنۂ دارالسرور برہانپور شیریں کلام غلام احمد نام ایں شعر او راست

شکر خدا نشاط جہاں میں ہے آشکار
غنچے دلوں کے کھل گئے گلشن میں ہے بہار
یاں تک ہوا ہے جشن کہ شبنم چمن کے بیچ
گوہر کے ڈالتی ہے گلوں کے گلے میں ہار

میر حسن نے جس احمد گجراتی قدیم کا ذکر کیا ہے اس کو میر نے "احمدی گجراتی" لکھا ہے۔ اور اس کی غزل کے ۵ شعر نقل کئے ہیں جس کا ایک مطلع

میرحسن نے بھی نقل کیا ہے۔ شفیق نے میر صاحب کے تتبع میں احمد کا تذکرہ انہی سے نقل کیا ہے۔

ان تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ کل چار شاعروں کا تخلّص احمد تھا جن میں سے دو گجراتی تھے اور ایک برہانپوری اور ایک قدیم شاعر احمد جس کا ذکر قائم نے کیا ہے مجہول الحال ہے۔ میر نے صرف احمد کا نام اور چند شعر نقل کر دیئے ہیں اور قائم نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کچھ حال ان کا لکھا ہے اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میر حسن نے میر اور قائم کے تذکروں کی بنا پر ان دونوں کو دو جداگانہ احمد خیال کر کے دونوں کا علیحدہ تذکرہ کیا ہے اس لئے خیال ہوتا ہے کہ احمد گجراتی صرف ایک ہی ہے۔ رہا قاسم کا قدیم احمد تو وہ مجہول الحال ہے۔ دوسرا احمد برہانپوری جس کا نام غلام احمد تھا پروفیسر شیرانی مرحوم نے احمد دکنی کا ذکر کیا ہے جو محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ۔ ۱۰۲۰ھ) کا درباری شاعر تھا اور جس نے مثنوی لیلیٰ مجنوں اس کے حکم سے لکھی تھی اس کے متعلق پروفیسر نے لکھا ہے کہ "احمد کے حالات زندگی سے ہم بے خبر ہیں" (پنجاب میں اردو ص ۱۷۱)

اس طرح کل دو احمد ہوتے ہیں جن میں سے ایک گجرات کا اور دوسرا دکن کا تھا۔ ان دونوں احمدوں کو ہمارے دکنی مصنّفین نے گڈمڈ کر دیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ احمد تخلّص کا کوئی گجراتی شاعر نہیں تھا، بلکہ وہ دکنی احمد ہے جس کو تذکرہ نویسوں نے گجراتی لکھ دیا ہے۔

اسپرنگر نے کئی احمدوں کا ذکر کیا ہے جن میں سب سے پہلے اس نے علی ابراہیم کے حوالہ سے احمد گجراتی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

"میر اور ذکا کے خیال میں ان کا تخلّص احمدی ہے مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے" (ص ۲۰۰)

مؤلف اردو شہپارے (ص ۱۴۲) لکھتے ہیں:۔

"اس شاعر کے نام سے متعلق تھوڑی سی پیچیدگی ہے۔ میر حسن اور قائم نے احمد گجراتی لکھا ہے، عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعراء میں اس کو برہانپور کا باشندہ بتلایا ہے اور اس کا نام غلام احمد علی لکھا ہے۔ لیکن شمالی ہند کے تذکرے دکنی شعراء اور دکنی ادب کے متعلق مستند معلومات بہم نہیں پہنچاتے اسی لئے ان بیانات کو بالکلیہ صحیح تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورۂ بالا تذکروں میں احمد کی شاعری کے چند نمونے درج ہیں جو شاعرانہ نقطۂ نظر سے تو بے حد دلچسپ ہیں لیکن ان سے اس کے حالات زندگی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔"

راقم نے جامعۂ اڈنبرا کے کتب خانہ میں اس کے سات مرثیوں کا ایک مخطوطہ دیکھا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا نام تیم احمد تھا اور وہ برہانپور کا باشندہ تھا۔ یہ باتیں ہر مرثیہ کے آخری اشعار میں درج ہیں۔ اس نے اپنے مرثیوں میں وہی ردیف قافیے استعمال کئے ہیں جن کو برہانپور کے مشہور مرثیہ گو ہاشم علی نے استعمال کیا ہے۔" اسی احمد کو انہوں نے صفحہ ۳۴۸ پر احمد گجراتی" (ف ب ۱۷۰۰) اور صفحہ ۲۱۱ پر ہاشم علی گجراتی لکھا ہے لیکن مؤلف کے ایک ہم وطن اہل قلم کا بیان ہے کہ تیم احمد ایک اور شاعر تھا جو ان دونوں سے جداگانہ ہے۔

"احمد تخلص کے دکن میں متعدد شعرا ہوئے ہیں۔ قطب شاہی دور میں ایک احمد تھا جو وجہی کا ہمعصر تھا۔ دور مغلیہ کا یہ دوسرا احمد جو برہانپور کا باشندہ تھا۔ شمالی ہند کے تذکرے نویسین میر حسن اور قائم احمد کو گجراتی بتاتے ہیں، عمدۂ منتخبہ اور عیار الشعراء میں اس کو غلام علی احمد کے نام سے برہانپور کا باشندہ بتایا گیا ہے۔ اسپرنگر نے بھی اسی احمد کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے ان دونوں

احمدوں کا وجود ہو، مگر ہم جس احمد کا ذکر کرتے اور اس کے مرثیے پیش کرتے ہیں وہ ان دونوں سے جداگانہ ہے۔ اس کا نام یتیم احمد تھا اور یہی تخلص کرتا تھا۔"

مؤلف مذکور نے بھی اگرچہ اُردو شہ پارے کے مؤلف کی طرح گجراتی اور برہانپوری احمدوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اور ان کے وجود کو مشتبہ بتایا ہے تاہم یتیم احمد کو وہ ایک جداگانہ شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے مضمون "دکن کے بعض مرثیہ گو" (مقالات ہاشمی (ص ۲۱۵)) میں یتیم احمد کے مرثیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس شاعر کا نام اور تخلص یتیم احمد تھا۔

تذکروں کے بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ احمد گجراتی کے علاوہ ایک احمد دکنی یا برہانپوری بھی تھا۔ اس لئے جن تذکرہ نویسوں نے احمد گجراتی نامی ایک شاعر کا ذکر کیا ہے تو اس کو غلط بتلانے کی کوئی وجہ نہ تھی جبکہ اس کے گجراتی ہونے کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ اور شمالی ہند کے تذکروں پر ایک عام اعتراض کر دینا نہ صرف بیجا بلکہ اصول تحقیق کے خلاف ہے۔ پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ ذکر تو احمد کا ہو اور تذکروں کی غلطی بتا کر اسکو ایک دوسرے شاعر سے تعبیر کیا جائے۔ میر اور اس کے تتبع میں شفیق نے کیا ہے۔ اشرف اور اسکے دو ایک شعر نقل کرکے ولی کا ہمعصر بتایا ہے۔ اشرف کا ذکر ایک قدیم دکنی تذکرہ نویس خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا بیان حسب ذیل ہے۔

"اشرف محمد اشرف اشرف تخلص گجراتی بلا واسطہ شاگرد ولی محمد طبع رنگین داشت، شعرش در نواح گجرات شہرت دارد، و دیوان لطیف تصنیف نمودہ اشعار اوست۔

ہوا ہوں بستۂ زلفِ سجن شکن کی قسم
ہوا ہوں صید ام منہرن ہرن کی قسم
پتنگ دار ہے دل جب سے شمع رو پہ فدا
اگن میں شوق کے جلتا ہے تن لگن کی قسم
پیا دیکھا جو ترے جام چشم کی گردش
ہوا ہوں شوق کی مئے سے مگن نین کی قسم
پڑا ہے خاک تن جو برہ کے کوچے میں
ہے پائمال ترا اے سجن چرن کی قسم
یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف
تمام شاعرِ ملکِ دکن سخن کی قسم (صہ ۱۲، صہ ۱۳)

ہم نے اشرف کے وطن خاندانی حالات اور اس کی شاعری پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے جو رسالہ اردو میں شائع ہوا ہے (بابت جنوری ۱۹۴۷ء) اس میں ہم نے اشرف کا گجراتی اور شاہ گردوئی ہونے کے متعلق معتبر اور ناقابل تردید شہادتیں پیش کی ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) دیوان اشرف کے دو قلمی نسخوں میں اس کا نام جا بجا حاشیوں پر "اشرف الموسوی المدنی الشاہی" لکھا ہوا ہے۔ اس کی تصدیق احمد آباد کی اس دستاویز سے بھی ہوتی ہے جس پر اشرف کی مہر اور دستخط ثبت ہیں اور اس میں اس کا نام محمد اشرف اس کے باپ کا نام محمد موسیٰ مدنی لکھا ہوا ہے۔ اس سے اشرف کی دو نسبتوں موسوی اور مدنی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) نسبت شاہی احمد آباد کے مشہور بزرگ حضرت شاہ عالم بخاری قدس سرہٗ کے خاندان سے بیعت و ارادت کو ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ اشرف کے دیوان میں اس کا یہ شعر موجود ہے۔

پیر اشرف کے شاہ عالم ہیں
خلف الصدق سیّد الاقطاب

(۴) کتاب اعراس نامہ قلمی میں جو مشاہیر و بزرگان احمد آباد و گجرات کی تواریخ وفات پر لکھی گئی ہے۔ خود اشرف اس کے والد شیخ محمد موسیٰ مدنی اور اس کے دادا شیخ حسن محمد مدنی کی وفات کی تاریخیں ملتی ہیں۔

(۵) اشرف کے کلام میں گجراتی الفاظ و محاورات بکثرت پائے جاتے ہیں۔

(۶) اپنے کئی اشعار میں اشرف نے ولی کی تعریف کی ہے۔ اسکے اشعار کی تضمین کی ہے۔ خود کو اس کا پیرو بتایا ہے اور ولی کی ۱۳ غزلیں اپنے دیوان میں اپنے تخلص سے نقل کی ہیں، اور ایک غزل کے متعلق لکھا ہے کہ یہ مجھے ولی نے عنایت کی ہے۔ مزید برآں دستاویز مذکور (نمبر ۱) پر ولی کے بیٹوں اور سات خاندانی اعزہ کے دستخط اور مہریں اس پر ثبت ہیں۔ ولی نے بھی اشرف کے مصرعے کی تضمین کی ہے۔

ان تمام باتوں سے حمید کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اشرف احمد آباد گجرات کا باشندہ اور ولی کا شاگرد تھا۔ لیکن ہمارے دکنی ارباب قلم نہ صرف حمید کے بیان کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس وہ اشرف کو دکنی شعرا میں شمار کر کے اس کے کلام کو "دکنی کارنامہ" بتلاتے ہیں چنانچہ اردو شہ پارے کے مؤلف لکھتے ہیں۔ (ص ۱۴۷)

"اسپرنگر کے کیٹلاگ میں ذکا کے تذکرہ کے سلسلہ میں اسکو ولی کا ہمعصر بتلایا ہے اور کچھ نہیں! اس قسم کے بیانات شفیق اور قائم کے تذکروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مؤخر الذکر کا بیان ہے کہ وہ حاتم کے زمانہ میں بھی تھا۔" لیکن قائم کے تذکرے میں اشرف کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا گیا۔ آگے چل کر اشرف کی ایک تصنیف جنگ نامہ حیدر کے سلسلہ میں کہتے ہیں:-

"وہ ایک اچھا شاعر تھا۔ اس کے مذہبی جوش نے دکنی زبان میں ایک

اہم کارنامہ پیش کرنے میں اس کی بڑی مدد کی ۔" (ص ۱۴۸)

مؤلف مذکور نے اپنے ایک مضمون میں اشرف کو شاعرانِ دکن میں شمار کیا ہے :-

" دکن کے شعراء میں ولی نے ملا خیالی، حسن شوقی، فراقی، آزاد، رنگین اور اشرف وغیرہ کا ذکر کیا ہے ۔" (یادگار ولی ص ۵۴)

ایک دکنی مضمون نگار نے بھی اشرف کو دکنی خیال کیا ہے :-

" قدیم تذکروں میں اشرف نامی شاعر کے یہ دو شعر ملتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ اشرف دکنی ہی ہوا ۔" ("دکنی شعر کا سفر شمالی ہند" مندرجہ یادگار ولی ص ۱۹۶)

کسی تذکرہ نویس نے اشرف کو "دکنی" نہیں لکھا، غالباً ولی کی معاصرت کی بنا پر اس کو دکنی سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خود اشرف نے بھی اپنے وطن کو ملک دکن اور زبان کو دکنی زبان کہا ہے ۔ اس وجہ سے شاید ہمارے ادیبوں کو دھوکا ہو گیا، لیکن اشرف کے سوا دوسرے شعرائے گجرات نے بھی اپنی زبان کو دکنی کہا ہے[1]

رضی

رضی کا ذکر صرف دکنی تذکرہ نویس حمید نے کیا ہے اور اس کو متوطن احمد آباد اور ولی کا شاگرد بتایا ہے وہ لکھتا ہے :-

محمد رضی ۔ رضی تخلص نیز متوطن احمد آباد از شاگردان رشید ولی محمد ہم دراں جواب ریختہ محمد اشرف مذکور رموز دل ساختہ ۔ جوان خوش ظاہر بودہ از دست ریختہ :-

خرابِ نرگسِ مستانہ ہوں نین کی قسم
برنگِ بلبلِ دیوانہ ہوں چمن کی قسم

---

[1] دیکھو ولی گجراتی پر ہمارا استدراک رسالہ مصنف بابت اکتوبر ۱۹۶۱ء

جمالِ انجمن آرائے شمع رخ پہ ترے
شبِ وصال میں پروانہ ہوں لگن کی قسم
عذابِ روز قیامت سیں کچھ نہیں پروا
شہیدِ خنجرِ جانانہ ہوں کفن کی قسم
پیا کی چشم کی وحشت کو دیکھ جیوں مجنوں
شکار دامن ویرانہ ہوں ہرن کی قسم
دیکھا ہے جب سے رضی پیچ و تاب طرۂ یار
مزار خاک سے جیوں شانہ ہوں شکن کی قسم (ص۱۳)

رضی اور اشرف کی معاصرت اور رضی کے متوطن احمد آباد ہونے کی مزید شہادت حسب ذیل ہے۔

۲۔ اعراس نامہ میں رضی الدین کی تاریخ وفات اس طرح درج ہے۔

"۱۶ ذی الحج میاں رضی الدین از فرزندان سید احمد جعفر شیرازی"

سید احمد جعفر شیرازی قدس سرہٗ احمد آباد کے مشاہیر اولیا میں سے تھے۔ اور صاحب تذکرۂ فائق کے جد امجد رضی کا کلام (مثنوی) ۱۱۸۹ھ کا لکھا ہوا ہمارے مکرم سید حسینی پیر صاحب احمد آبادی کو وہاں کے سادات شیرازی کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا تھا جو عرصہ ہوا انھوں نے مولوی عبدالحق صاحب کو بھیج دیا ہے۔

۳۔ ۲۹ رمضان ۱۱۳۱ھ ۷ سنہ جلوس فرخ سیر کی ایک دستاویز پر محمد اشرف کی مہر اور دستخط اس طرح پر ہیں۔

"محمد اشرف بن غفران پناہ محمد موسیٰ مدنی عفی عنہما"

اسی دستاویز پر دوسری مہر میں "محمد رضی الدین" اور ۱۱۲۴ھ لکھا ہوا ہے یہی سنہ محمد اشرف کی اپنی مہر میں پایا جاتا ہے جس سے ان دونوں کی معاصرت [illegible]

کی تضمین بھی کی ہے جن میں سے مندرجہ ذیل مصرعہ رضیؔ کے گجراتی ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ ؎

اسس مصرع رضی سوں ہے اشرف مجھے لگن
ہوں عشق پیچ عشق میں ولل ول گیا ہوں میں

ولنا خاص گجرات کا محاورہ ہے جس کے معنے جھکنا، مڑنا، بل کھانا ہیں۔

لیکن دکنی مخطوطات کے مؤلف نے رضی کو عہد آصفیہ کے مرثیہ گویوں میں شامل کر لیا ہے۔ (ص ۹۳۲، ص ۶۳۳ دکنی مخطوطات)

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"دیوان بیاض میں رضیؔ کے نو مرثیے ہیں جن کے ۸۷ شعر ہوتے ہیں۔ حافظ رضی الدین اسی دور کا درد مند مرثیہ گو ہے۔ خواجہ خان مصنف گلشن گفتار نے اس کو ولیؔ کا شاگرد بتایا ہے (کذا) یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا البتہ دونوں ہمعصر تھے۔ رضی کے مرثیوں کی دکن میں بڑی شہرت تھی اس کے مرثیوں کی تضمینیں کی جاتی تھیں (کذا) اس کے مرثیوں میں ادبیت نہیں پائی جاتی مگر ان کا اصل جوہر سوز و گداز اور مرثیہ پن ہے جس کے باعث ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی (مرثیوں کا نمونہ پیش ہے) رضیؔ کے نو مرثیوں میں سے جو دیوان بیاض میں شامل ہیں۔ مؤلف دکنی مخطوطات نے بطور نمونہ چند مرثیے نقل کئے ہیں۔ (ص ۹۳۶، ص ۹۳۷)

آل نبی کے غم سے رہو یوں پکار
دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دل میں چھپا رکھا تھا حضرت حسین کا غم
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
بچھڑے حسین سوں جو بے اختیار رلے
باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را

پیاسے فرات کے سب کو ثر پہ یوں سنے گے
هات الصبوح هبوا یا ایها السکارا
فریاد واہ ویلا کلثوم کے زباں کا
در رقص و حالت آرد پیران پارسارا
کرتے تھے شاہ سب سوں صحرائے کربلا میں
با دوستاں مروت با دشمناں مدارا
لعنت ہے ظالماں پر جن کے طرف سوں ہر دم
گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را (کذا)
آل نبی سوں رکھنا ہر دم منے محبت
اشهر لنا دلیلی من تبسله العذارا
تقسیم حوض کوثر آل نبی کریں گے
سلطان بندہ بشارت پیران پارسارا
حافظ رضی قرآں میں لعنت ہے ظالماں پر
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

(یورپ میں دکنی مخطوطات، صفحہ ۱۳۶)

مؤلف اردو شہ پارے (۱/۱۱۱) رقمطراز ہیں :-

"ہاشم علی کے دیوان میں ایک اور شاعر کا بھی ذکر آتا ہے کہ وہ اپنے مرثیے نمبر ۱۰۱ کے عنوان میں لکھتے ہیں:

"تضمین غزل خواجہ حافظ شیرازی کہ حافظ رضی نامی شاعر کردہ"

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حافظ رضی تخلص کے نو مرثیے بیاض مذکور میں درج ہیں، اور جو اچھے مرثیہ گویوں میں ہے۔ ہاشم علی کے زمانے سے پہلے گذرا تھا۔ یا اس کے زمانے میں تھا۔ رضی غالباً گجرات کا شاعر تھا۔ خود اس نے حافظ کی مشہور غزل "دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا"، کی تضمین ایک

اور شاعر بے خبر کی تقلید میں کی ہوگی۔ بیاض میں بے خبر کی تضمین کے بعد ہی حافظ رضی کی تضمین نقل کی گئی ہے۔ لیکن حافظ رضی کا یہ مرثیہ بے خبر اور ہاشم علی دونوں کے مرثیوں سے بہتر ہے۔" (اُردو شہ پارے ص۱۵۹ ص۱۶۰)

اس بیان میں رضی کے "شاعر گجرات" ہونے کا دکنی کی زبان سے اعتراف ہے، مندرجۂ بالا بیانات سے رضی کا متوطن گجرات، ولی اور اشرف کا ہمعصر ہونے کا پتہ چلتا ہے اور چونکہ وہ احمد آباد کا باشندہ اور ولی کا ہمعصر تھا۔ اس لئے اس کا شاگرد ولی ہونا قرین قیاس ہے۔ اس طرح حمید کے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے بیان کو بلا دلیل غلط کہہ دیا جائے۔

ان مرثیوں کے سوا وہ مثنوی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اور جو غالباً انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

ان مراثی کے دیکھنے سے مؤلف کی یہ رائے کہ "اس کے مرثیوں میں ادبیت نہیں پائی جاتی" صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ نہیں معلوم "ادبیت" کی تعریف ان کے نزدیک کیا ہے؟ دوسری طرف مؤلف اُردو شہ پارے نے رضی کے مرثیہ کو بیخبر اور ہاشم علی کے مرثیوں سے بہتر بتایا ہے۔

امین

مطبوعہ تذکروں میں سے امین تخلص کے دو ایک قدیم شاعروں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اسپرنگر نے نمبر ۱۴۲ پر سرور کے حوالے سے "میر محمد امین ساکن دکن" لکھا ہے اور پھر نمبر ۱۴۳ پر دوسرے امین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امین میر محمد امین ساکن بنارس شاگرد میر غلام علی آزاد یہ دکن چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ (تذکرۂ قاسم)

میرے خیال میں یہ وہی شخص ہیں جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے (ص۲۲ [illegible] شعراء) لیکن [illegible] کا ذکر کرنا [illegible]

گجرات کا باشندہ تھا جس نے مثنوی یوسف زلیخا لکھی ہے اور اس میں صاف طور پر اپنی زبان کو گوجری بتایا ہے۔ اس کے حالات کا پتہ نہیں چلتا صرف اسکی مثنوی سے اسقدر معلوم ہوسکا ہے کہ وہ گودھرا (گجرات) کا باشندہ تھا۔ وہیں اس نے اپنی یہ مثنوی لکھی ہے۔ اس امین گجراتی کو ہمارے دکنی مؤلفین نے شعرا دکن میں سے بتایا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسپرنگر نے اس کی مثنوی یوسف زلیخا کو "دکنی نظم" لکھ دیا ہے۔

مؤلف اردو قدیم نے لکھا ہے (صـ ۸۸):۔

"ان کا نام شیخ محمد امین ہے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں گزرے ہیں انہوں نے یوسف زلیخا کے فسانے کو دکنی میں منظوم کیا ہے۔"

اسی طرح "دکن میں اردو" کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

"امین شیخ محمد امین اورنگ زیب کے عہد میں موجود تھے۔ یوسف زلیخا کے فسانے کو دکنی میں منظوم کیا ہے سنہ ۱۱۰۹ ہجری میں یہ ضخیم کتاب ختم ہوئی۔"

اردو شہ پارے کے مؤلف (ج ۱ صـ ۳) اس امین کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہ گولکنڈہ کا دوسرا شاعر امین ہے (پہلا شاعر عبداللہ کے زمانہ کا ہے جس نے قصۂ ابوشحمہ کو منظوم کیا اور جو نامکمل رہا اس کا نام شیخ محمد امین تھا) اس کی کتاب یوسف زلیخا اورنگ زیب کے عہد میں سنہ ۱۱۰۱ھ میں ختم ہوئی۔"

اس میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

(۱) پہلا امین جو قصۂ ابوشحمہ کا ناظم ہے اور شاہ عبداللہ کے زمانہ کا ہے گولکنڈہ کا دوسرا شاعر امین ہے اور یہ دوسرا امین ہے جس نے یوسف زلیخا لکھی۔ مؤلف مذکور اپنی ایک اور تالیف تذکرہ اردو مخطوطات (صـ ۲۷) میں "فقہ ہندی" نام کے ایک مخطوطے کے مصنف عبدی کے متعلق قیاس آرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ممکن ہے کہ عبدی کا دوسرا تخلّص امین ہو کیونکہ اس نام کا ایک گجراتی شاعر تقریباً اسی زمانے میں گذرا ہے جس نے اورنگ آباد میں عرصہ تک قیام کیا تھا اور ۱۱۰۹ھ میں ایک مثنوی یوسف زلیخا منظوم کی تھی ..... ایک اور شاعر امین ابوالحسن تاناشاہ کا ملازم تھا جس نے ۱۰۹۰ھ میں ایک مثنوی قصّہ ابوشحمہ لکھی تھی ممکن ہے کہ یہ تینوں شاعر ایک ہی ہوں زمانہ تینوں کا ایک ہے"

اس بیان میں مؤلّف نے عجیب تعقید پیدا کر دی ہے اور تینوں شاعروں کو (جن میں سے صرف ایک کا تخلّص امین تھا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا) ایک ہی تصور کرنے کا امکان ظاہر کیا ہے صرف اس لئے کہ "زمانہ تینوں کا ایک ہے"

اب مؤلّف "دکنی مخطوطات" کا بیان پڑھئے اسکی کتاب یوسف زلیخا کے مخطوطے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اسپرنگر کی صراحت حسب ذیل ہے :-

یوسف اور زلیخا کے عشق کی کہانی، دکنی نظم میں مصنّف شیخ محمد امین اورنگ زیب کے عہد ۱۱۰۹ھ میں لکھی گئی ہے"

اشرف گجراتی

گجرات میں صدیوں تک اُردو زبان اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی رہی امیر خسرو سے لے کر ولی گجراتی کے زمانے تک اس نے یہاں نشو ونما پائی اور نویں صدی ہجری میں اس کی ادبی تشکیل بھی ہوئی، باایں ہمہ یہ امر تعجب خیز ہے کہ ولی کے پیش روؤں میں سے صرف چند قدیم شعرائے گجرات کا کلام دستیاب ہوا ہے اور ان میں سے کئی ایک شعرا اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ ولی کے ہمعصر اور مابعد کے شعرا کا کلام اور ان کے حالات کا بھی پتا نہیں ملتا۔ متاخرین شعرائے گجرات کے متعلق فائق کے تذکرۂ مخزن الشعرا میں چند قدیم اور اکثر متاخر شعرا کے کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں، لیکن نہ تو اس میں ان شعرا کے مفصّل حالات ملتے ہیں اور نہ ان کا وہ کلام ملتا ہے جو قدیم گجراتی اُردو میں لکھا گیا ہے اور جس کو مصنّف نے قصداً چھوڑ دیا ہے، کچھ عرصے سے بعض قدیم گجراتی شعرا کے کلام کا پتا لگا ہے تو ان کو ہمارے بعض مصنّفین نے "دکنی" شعرا میں شمار کر کے ان کے ادبی کارناموں سے گجرات کو محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہاں اشرف گجراتی کو پیش کرنا چاہتے ہیں جو گجرات کا باشندہ اور ولی کا شاگرد و ہمعصر تھا۔

اور گجراتی شعرا کی طرح اشرف کا ذکر بھی عام طور پر اُردو شعرا کے

تذکروں میں نہیں ملتا۔ میر، شفیق اور قاسم نے اس کے تخلص کے تحت میں اس کے صرف دو ایک شعر نقل کیے ہیں[1] البتہ حمید اورنگ آبادی نے اپنے تذکرے میں اس کا نام محمد اشرف اور اس کا وطن گجرات بتایا ہے نیز اس کو ولی کا "بلا واسطہ شاگرد" لکھا ہے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اشرف کا کلام نواح گجرات میں مشہور ہے اور اس کا ایک دیوان بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حمید نے اشرف کی ایک ۵ شعروں کی غزل بھی نقل کی ہے[2] حمید کے برعکس بعض دکنی اہلِ قلم نے اشرف کو دکنی شعرا میں شمار کیا ہے[3] لیکن ہماری تحقیق کے مطابق وہ ٹھیٹھ گجراتی شاعر تھا جس کے لئے نہایت معتبر اور اندرونی شواہد اس مضمون میں پیش کیے گئے ہیں۔

دیوان اشرف (موجودہ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو) پر رسالہ "اردو" (بابت جولائی ۱۹۳۵ء) میں "بادہ کہن" کے عنوان سے ایک مختصر تبصرہ شائع ہوا تھا، جس میں بعض اشعار اور غزلیات بھی مخطوطۂ مذکور سے نقل کی گئی تھیں اور اگرچہ بعض اشعار سے اشرف کے متعلق چند باتیں بیان کر کے اس کی شاعری پر بھی مختصراً بحث کی گئی تھی۔ لیکن اشرف کے نام، وطن، خاندانی وذاتی حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی اور نہ اس کے گجراتی اور شاگردِ ولی ہونے کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح "اردو شہ پارے" (ص ۱۴۷) میں بھی اشرف کے زیرِ عنوان اس کی ایک مثنوی اور چند مرثیوں کی روشنی میں اس کی نسبت مختصر طور پر چند امور کا ذکر کیا گیا ہے۔ دیوان اشرف کے

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۱، چمنستان شعرا ص ۳۵، مجموعۂ نغز جلد ا ص ۶۲، شفیق اور قاسم دونوں نے اشرف کو ولی کا معاصر بتایا ہے۔ [2] گلشنِ گفتار ص ۱۲،

[3] ملاحظہ ہو یادگارِ ولی، ص ۵۴ و ص ۱۹۶، اردو شہ پارے ص ۱۴۸ جہاں اس کی مثنوی کو "دکنی زبان کا ایک اہم کارنامہ" بتایا گیا ہے۔

بلا استیعاب مطالعے سے اور بعض دستاویزوں کی مدد سے ہم نے اشرف کے حالات مرتب کیے ہیں اور اس کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالی ہے جن کو ہم ذیل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

نام، نسب اور وطن

دیوان اشرف کے اس مخطوطے میں جو ۱۱۲۹ھ کا لکھا ہوا انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے، نیز اس نسخے میں جو پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب کے پاس ہے، اشرف کا نام ہر جُز کے شروع میں حاشیے پر "اشرف الموسوی المدنی الشاہی" لکھا ہوا ہے۔ کتاب "اعراس نامہ" (قلمی) میں جو بزرگانِ احمد آباد و گجرات کی وفات کی تاریخوں کا ایک معتبر مجموعہ ہے۔ اشرف کی تاریخِ وفات اس طرح پر درج ہوئی ہے۔ "۸ ربیع الثانی محمد اشرف الموسوی المدنی" (ورق ۲۱) اسی کتاب میں یہ تحریریں بھی ملتی ہیں:

"۲۳ ربیع الاول مغفرت پناہ شیخ محمد موسیٰ مدنی"

"۱۱ ربیع الثانی میاں حسن محمد مدنی والد شیخ محمد موسیٰ مدنی تاریخہ کان شیخ حسن ۱۰۹۸ھ"

اسی طرح ۲۹ رمضان ۱۱۳۱ھ کے ایک دستاویز میں محمد اشرف کے نام کی مہر اور اس کے اوپر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

"کذا سمعتُ لراقمہ محمد اشرف ابنِ غفران پناہ محمد موسیٰ مدنی عفی عنہما"

تین اور دستاویزوں میں جو علی الترتیب ۱۰۹۸ھ، ۱۱۰۱ھ اور ۱۱۰۲ھ کے لکھے ہوئے ہیں، محمد موسیٰ کی مہریں اور دستخط بہ شرحِ ذیل موجود ہیں:

۱۔ ۱۲ محرم ۱۰۹۸ھ دستخط: "حررہ محمد موسیٰ" اس کے نیچے یہ مہر بہ خطِ طغرا لگی ہوئی ہے:

"موسیٰ ابن قاضی حسن محمد المدنی الشاہی"

۲۔ ا محرم ۱۱۰۱ھ دستخط: "من الشاہد بن محمد موسیٰ بن حسن محمد المدنی الشاہی" مہر میں "کلّمَ اللّٰہُ مُوسیٰ تکلیماً" کا قرآنی سجع لگا ہوا ہے۔

۳۔ ۱۱۰۲ھ دستخط: "بندہ شاہد است حررہ محمد موسیٰ بن قاضی محمد حسن المدنی"۔

ان تحریروں اور مہروں سے اشرف کی تینوں نسبتوں کا پتا چلتا ہے۔ "موسوی" کی نسبت اس کے والد محمد موسیٰ کے نام کے ساتھ ہے، دوسری "مدنی" اس کے بزرگوں کے اصلی وطن کی طرف ہے، جس کا اشارہ اس کے اس شعر میں پایا جاتا ہے۔

طینت میری یوں عاشق خاکِ مدنی ہے
جیوں بادِ یمن محوِ نسیم عربی ہے

تیسری نسبت "شاہی" حضراتِ شاہیہ یعنی احمد آباد کے مشہور بزرگ شاہ عالم بخاری قدس سرہٗ کے خاندان سے ارادت و بیعت کی ہے۔ اس آخری نسبت کا ذکر خود اشرفؔ نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

پیر اشرفؔ کے شاہ عالم ہیں
خلف الصدق سید الاقطاب

حضرت شاہ عالم قدس سرہٗ کے سلسلۂ سہروردیہ کے تمام مریدین خود کو لقبِ "شاہی" سے مخاطب کرتے تھے، چنانچہ احمد آباد کے مشہور عالم مولانا نور الدینؒ بھی خود کو "شاہی" لکھا کرتے تھے۔

ایک اور دستاویز میں جو ۱۱۲۴ھ کے بعد محمد موسیٰ متوفی کے ورثا کے مابین تقسیمِ میراث کی بابت لکھا گیا ہے، محمد اشرفؔ کی مہر اور دستخط لگے ہوئے ہیں:

"آنچہ در متن است بندہ محمد اشرف ولد غفران پناہ حضرت شیخ محمد موسیٰ مدنی قدس سرہ را قبول است۔"

"خاکروب حضرت احدامّی لقب
اشرف موسیٰ شریف النسب"

یہ دستاویز مذکورۂ بالا دوسرے دستاویزوں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے اشرف کے خاندانی حالات پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ اس میں چند امور خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً محمدّ موسیٰ کی اولاد کا نام متن میں اس طرح لکھا ہوا ہے:

"رلیجے خدیجہ و فخر النسا و محمد سلطان و محمد اشرف..... و ورثا مرحومہ مغفورہ آجے بی بی و محمد اکبر و محمدّ پناہ۔"

متوفّی کی میراث میں متعدد مکانات وعمارات کا ذِکر ہے، ان کے علاوہ متوفی کے وظیفے اور روپیے کا بھی ذِکر کیا گیا ہے اس پر کئی شاہدین کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں، من جملہ ان کے شاہ ولی اللہ احمد آبادی کے خاندان کے مندرجۂ ذیل اصحاب کے دستخط اور مہریں بھی اس پر لگی ہوئی ہیں:

۱۔ نصیر الدین ابن السیّد عبد الماجد العلوی (حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے پڑپوتے)
۲۔ فرید ابن محمد جمیل اللہ الصدیقی (شاہ ولی اللہ کے برادر نسبتی شیخ فرید کے پوتے)
۳۔ امجد بن محمد ولی اللہ (شاہ ولی اللہ کے بیٹے)
۴۔ محمد یحییٰ ابن سیّد غنی محمد العلوی (شاہ ولی اللہ کے بھانجے)
۵۔ شریف احمد ولی اللہ العلوی (شاہ ولی اللہ کے پوتے)
۶۔ عنایت اللہ بن حبیب اللہ العلوی (شاہ ولی اللہ کے بھتیجے)

۷۔ محمد رضا ابن حبیب اللہ العلوی (ایضاً) [۱]

مندرجہ بالا تحریرات سے ہم حسب ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں:

(۱) یہ محمد اشرف ہمارا یہی شاعر اشرفؔ ہے۔

(۲) اس کے باپ کا نام شیخ محمد موسیٰ مدنی تھا جس کی بنا پر وہ خود کو موسوی لکھتا ہے۔ اور انہوں نے ۱۱۲۴ھ یا اس سے کچھ عرصے پہلے وفات پائی۔

(۳) اشرفؔ کے دادا کا نام قاضی حسن محمدؔ تھا جنہوں نے ۱۰۹۹ھ میں رحلت فرمائی۔ ان کا مادۂ تاریخِ وفات "کان شیخ حسن" ہے جس سے بہ حساب ابجد ۱۰۹۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔

(۴) اشرفؔ کا خاندان اصل مدینہ سے گجرات آیا تھا جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو مدنی لکھتا ہے۔

(۵) اس کے خاندان کو حضرت شاہ عالم قدس سرہ کے خاندان۔ سلسلۂ سُہروردیہ میں بیعت وارادت تھی، جس کی بنا پر وہ خود کو شاہی لکھتا ہے۔

(۶) اس کے باپ دادا مشائخ اور قضاۃ میں سے تھے اور ان کی مذہبی حیثیت سے ان کے علوِّ مرتبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ مندرجہ شہادتوں میں کہیں اس کی سیادت کا ذکر نہیں ہے، لیکن اس کی ایک مثنوی میں (جس کا ذکر آگے آتا ہے) اس نے خود کو سیّد لکھا ہے اور غالباً اسی بنا پر اس نے اپنی مہر میں اپنے نام کے ساتھ "شریف النسب" لکھا ہے۔

---

[۱] شاہ ولی اللہ کے اعزہ اور رشتے داروں کے لئے ہمارا ماخذ حضرت شاہ وجیہ الدین علویؒ کے خاندان کا نسب نامہ ہے جس کا ایک معتبر و مستند نسخہ اسی خاندان کے ایک فرد سیّد منظور حسن علوی عرف حسینی پیر صاحب کے پاس ہے۔

کیا جنگ یو سیّد اشرف تمام
بہ حقِّ محمّد علیہ السلام ۱؎

(۷) اشرف کے اعزّہ میں دو بڑی بہنیں، ایک بڑے بھائی، ایک چھوٹی بہن اور دو چھوٹے بھائی تھے، جن کے نام دستاویز میں بتائے گئے ہیں۔

(۸) اس کے والد محمّد موسیٰ کی مالی حالت اچھی ہوگی جیسا کہ ان جائدادوں وظیفے اور یومیے کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کو غالباً خزانۂ شاہی سے وظیفہ اور یومیہ ملتا ہوگا اور ان کے بعد بھی ان کے جاری رہنے کا حال اس دستاویز سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۱۲۴ھ میں فرخ سیر کا دورِ حکومت تھا۔ ممکن ہے کہ یہ وظیفہ عالمگیر کے عہد سے ان کے نام جاری ہوا ہو۔

(۹) دستاویز کے شاہدین میں شاہ ولی اللہ کے بیٹوں اور خاندانی عزیزوں کے دستخط اور مہریں لگی ہوئی ہیں، جن سے اشرف کے اس خاندان کے ساتھ ذاتی تعلّقات اور مراسم کا پتا چلتا ہے اور اس کے شاگردِ ولی ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

ان دستاویزی شہادتوں کے بعد اشرف کے نام، اس کی نسبتوں اور وطن کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہتا اور اس کے دیوان کے مخطوطوں اور حمید کے بیان کی من کل الوجوہ تصدیق ہو جاتی ہے۔

اشرف کے زمانے کی تعیین

اشرف نے اپنی مثنوی "جنگ نامۂ حیدر" میں جو ۱۱۲۵ھ میں لکھی گئی ہے۔ بہادر شاہ جہاں دار شاہ اور فرخ سیر کا ذکر کیا ہے ۲؎ جس کا عہدِ حکومت

۱؎ یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۳۴۷، ص ۳۴۹،
۲؎ [illegible] ص [illegible]،

۱۱۲۴ھ سے ۱۱۳۱ھ تک ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دیوان میں نادر شاہ کے حملۂ ہندی کی نسبت بعض اشارات پائے جاتے ہیں ؎

بس کہ ہے اندھیر ملکِ ہند میں
زلف کے کوچے میں مارا مار ہے

کشورِ ہند میں از بس کہ ہوا ہے اندھیر
زلفِ دل بر کے ہر یک مو کو پریشانی ہے

یا الٰہی دفع کر اس ظالم بدبخت کوں
جس کی بے مہری دستخط سوں فسانہ ہند ہے

شاہ دلی شاں ہر یک گوشے میں اپنے وقت کا
فقر کے کشور میں ہر گدا نادر شاہ ہند ہے

یہ اشارات نادر گردی کے حالات سے متعلق ہو سکتے ہیں کہ نادر شاہ کی آمد نے دہلی میں اس کے قتلِ عام نے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہ "ظالم بدبخت" نادر کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ نادر شاہ کے حملۂ ہند اور اس کی قتل و غارت و تاراج کے حالات احمد آباد میں برابر پہنچتے رہے ہوں گے جیسا کہ اس وقت کے ایک انگریز مصنف[1] جیمس فریزر نے جو صورتِ حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔

... در ... شعر ... میں بہ عہدِ محمد شاہ وقوع پذیر ہوا تھا اس ... تک نصرت کا ... پایا جاتا ہے ... ان سے پا ...

۱۔ تاریخ نادر شاہ از جیمس فریزر مطبوعہ لندن ۱۷۴۲ء (رابطہ مکرر در ہند) کا دیباچہ۔ اس میں مصنف[1] لکھتا ہے کہ ان حالات کی تفصیل نادر کا ایک افسر سربلند خان خطوط کے ذریعے علی محمد خان (جو مصنف[1] مرآۃ احمدی) کے بیٹے مرزا مغل کو، جو میرے گہرے دوست تھے، لکھ کر احمد آباد بھیجا کرتا تھا اور وہ مجھے دے دیا کرتے تھے۔

مغل بادشاہوں کا زمانہ پایا. وہ اورنگ زیب کے آخری دور میں پیدا ہوا اور بہادر شاہ (۱۱۱۸ھ - ۱۱۱۹ھ) جہاں دار شاہ (۱۱۱۹ھ - ۱۱۲۴ھ) فرخ سیر (۱۱۲۴ھ - ۱۱۳۱ھ) اور محمد شاہ (۱۱۳۱ھ - ۱۱۶۲ھ) کے عہد میں نادر شاہ کے حملوں کے وقت زندہ تھا۔ اس لئے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نے طویل عمر پائی تھی، ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی وہ زندہ رہا ہو۔ مذکورہ بالا تمسک نامے میں اشرفؔ کی مہر ۱۱۲۴ھ کی ہے۔ اگر اس وقت اشرفؔ کی عمر کم از کم ۲۵ سال کی فرض کر لی جائے تو اس نے ۶۰ سال سے کم عمر نہ پائی ہوگی۔ "اردو شہ پارے" کے مؤلف نے "تذکرۂ قائم" کے حوالے سے اشرفؔ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قائم کے زمانہ میں بھی تھا۔[1] لیکن قائم کے پورے تذکرے میں اشرفؔ کا کہیں نام تک نہیں آیا۔

علمی وفنی قابلیت

اشرفؔ کی علمی قابلیت کا اس کے بعض اشعار سے پتا چلتا ہے۔ ایک شعر میں اس نے اپنے کلام کو متعدد علوم و فنون کا جامع لکھا ہے ؎

بدیع و معنی و منطق تصوف و حکمت
ہر یک علم کوں میرا کلام ہے جامع

اشعارِ ذیل سے اس کا حافظِ قرآن ہونا معلوم ہوتا ہے ؎

ڈر نکو اشرفؔ اندھاری گور سوں
شمع روشن نورِ قرآں ہوئے گا

اس کی گور البتہ روشن ہوئے گی ؎
جو کہ اشرفؔ حافظِ قرآن ہے

اپنے "ہرفن مولا" ہونے کا دعویٰ اس شعر میں کیا ہے۔

---

[1] ص ۱۴۷، ج ۱۔

ہے اشرف کوں ہر فن میں اپنا کمال
کہ جیوں کوئی اچھے کامل ایک فن

قیاس ہوتا ہے کہ اس نے اس وقت کی درسیات کی تحصیل کی ہوگی قرآن حدیث اور فقہ سے باخبر معلوم ہوتا ہے۔

نور معنی فقہ و نقل و خبر
شمع بزم دلیل و برہاں ہے

ایک مقطع میں ایک حدیث شریف "خیر الامور اوسطھا" کو اپنے الفاظ میں باندھا ہے

بیچ میں خوباں کے اس کوں دیکھ اشرف بول اٹھیا
مرحبا یا سیدی لاخیر الا فی الوسط

فارسی میں اس کی مہارت کے بکثرت شواہد اس کے کلام میں موجود ہیں، چنانچہ فارسی کی لطیف ترکیبیں ولی کی طرح نہایت خوبی سے اپنے اشعار میں استعمال کی ہیں:

بزم عروسان چمن، جام نشاط جاودانی، بدمست صہبائے جوانی، خیال پیچ و تاب کاکل مشکیں، خدنگ عشوۂ ابرو کمان، توتیائے چشم بینش، چراغ بزم عرفاں، زینت گلزار رضواں، غیرت خورشید تاباں، سودائے خال دلبر، آئینۂ طوطی نما، یک بیاباں مرغ ہوش، نغمہ سرائے انبساط، چاشنی بخش حلاوت، فروغ صبح صادق، بہار جلوۂ طور تجلی، رشتۂ موج رم آہو، خورشید اوج حسن، دام طرۂ پیچان آہ، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے دیوان میں بھی ایک ملمع غزل موجود ہے جس کے ہر شعر کا مصرعۂ ثانی فارسی ہے۔

جس نے اس رشک پری کا یک نظر پایا ہے دید
تا قیامت پائے ہوش خویش در دامن کشید

مست مخمور ہے سرشار ہے بے ہوش ہے
ہر کہ خوردہ جرعۂ از لعل مے گوں نبید

عندلیبِ شوق ہے نغمہ سرائے انبساط
سبزۂ خط تا بہ گُل زار رخت اے گُل دمید
لال طوطی کوں پھڑکتے دیکھ تیرے ہات پر
یک بیاباں مُرغِ ہوشِ عاشقاں ازخود پرید
آسماں سارا مشبک ہے، نہیں یو اختراں
تیرِ آہِ عاشقاں ازبس کہ برگردوں رسید
رقص میں سرگرم لولیؑ فلک ہے رات دِن
نغمۂ عشّاق ازآہ درونم تا شنید
فیض نورِ مہرِ حسن عارضِ دل دار سوں
ازنگاہی اشرفؔ بے دل بہ مطلب وا رسید

اس نے فارسی کی ایک مثنوی کا ۸۰۶ ابیات میں اُردو میں ترجمہ کیا ہے، اس سے فارسی زبان میں اس کی دست گاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

مذہب و عقائد اشرفؔ کے مرثیوں اور اس کی مثنوی میں اہلِ بیت کی منقبت اور ان سے عقیدت کی بِنا پر "اُردو شہ پارے" کے مؤلّف نے لکھا ہے کہ "وہ حضرتِ علیؓ اور آپ کے خاندان کا پرستار تھا، جس سے اس کے شیعہ ہونے کا پتا چلتا ہے"۔ لہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت شریف میں اشعار اور غزلیں کہی ہیں۔ اسی طرح شہیدانِ کربلا کے مرثیے بھی لکھے ہیں جن میں سے چند اس کے دیوان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے دیوان میں قطعۂ ذیل ائمۂ اثنا عشر کی مدح میں پایا جاتا ہے ؎

محمّد سرورِ عالم علیؓ ہیں ساقیٔ کوثر
بتولِؓ پارسا خاتونِ جنّت زوجۂ حیدرؓ

لہ صفحہ ۱۴۷۔

مہِ برجِ سپہر خلق و خورشیدِ کرم یعنی
چراغِ خانۂ دیں بو محمدؓ سبطِ پیغمبرؐ
شہِ اورنگِ اقلیمِ شہادت سبطِ ثانی ہیں
امام و قبلہ گاہِ عابدیں سجّادؓ دیں پرور
گلِ رنگیں بہارِ گلشنِ ہر علم باقرؓ ہیں
فروغِ صبحِ صادق لمعۂ مہرِ رخ جعفرؓ
بہارِ جلوۂ طورِ تجلّی کا تماشا ہے
خیالِ موسیٰ کاظم کلیمِ شوق کے دل پر
ہمیشہ فیضِ انوارِ الٰہی سوں درخشاں ہے
علیؑ موسیٰ جعفر رضا کا روضۂ انور
تقی ہیں وہ امام المتقیں تقویٰ ستی جن کے
ہیں توڑیا گردنِ دیو رجیم نفس بدگوہر
نقی ہیں وہ کہ جن کی یاد کے صیقل ستی ہر دم
ہوا ہوں صدق سوں آئینۂ دل کا نیں روشنگر
امیر ذرّہ پرور عسکری ہیں وہ کہ ہے دائم
ازل کا سایۂ ہر سلطانِ ملکِ دین کا رہ بر
یہی اے کارسازِ خلق اشرف تجھ سوں منگتا ہے
ظہورِ مہدیٔ ہادی ہمارے دور میں توں کر

اس قطعے اور اس کے مراثی کو دیکھتے ہوئے اشرف کے پیرو مذہبِ امامیہ ہونے کا گمان ہو سکتا ہے، لیکن اس کا ایک شعر ایسا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ائمہ اربعہ یعنی حضرات خلفائے راشدینؓ کا بھی معتقد تھا۔

اخلاص سوں نظر کر لے صاحب بصیرت
ہر چار یار حضرت تمثیلِ چار قل ہے

وہ حضرت شاہ عالم صاحب قدس سرہٗ اور ان کے خاندان کا مرید و معتقد تھا، جن کا سنّی العقیدہ ہونا مسلّم ہے۔

ولی سے تلمّذ

اشرفؔ کو بعض تذکرہ نگاروں مثل میر شفیقؔ اور ذکاؔ نے ولیؔ کا ہمعصر بتایا ہے اور حمیدؔ نے تو اس کو "بلا واسطہ شاگردِ ولیؔ" لکھا ہے۔ رسالۂ "اردو" کے تبصرہ نگار نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شفیقؔ نے اشرفؔ کو معاصرِ ولیؔ لکھا ہے، لیکن حمیدؔ اورنگ آبادی نے اس کو بلا واسطہ شاگردِ ولیؔ لکھا ہے۔ حمیدؔ کا مدّعا غالباً یہ ہے کہ اشرفؔ باضابطہ شاگردِ ولیؔ تو نہ تھا، لیکن اس کے کلام سے فیض اٹھایا ہے۔ شاید ایسا ہو، لیکن اب تک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرفؔ یا ولیؔ کے کلام سے ان کے استاد شاگرد ہونے کا ثبوت ملتا ہے بہر حال معاصرت مسلّم ہے"۔[۱]

"یہاں "واسطہ" کے معنی شاید ذریعے یا تعلّق کے لئے گئے ہیں، حال آنکہ "بلا واسطہ" کے معنی عموماً "براہِ راست" کے لئے جاتے ہیں بہرحال اشرفؔ باضابطہ شاگردِ ولیؔ ہو یا بے ضابطہ لیکن اس کے گجراتی اور ولیؔ کے ہم وطن ہونے کے علاوہ اس کے دیوان میں بعض اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن سے اس کا ولیؔ سے تلمّذ ظاہر ہوتا ہے۔ اشعارِ ذیل کو ہم اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

ولیؔ کے طور پر مجھ سا نہیں کوئی ریختہ بولیا
سخن ہے مبتذل جگ میں زبانِ اصفہانی کا

شعر کہنے میں ہے اشرفؔ کوں ولیؔ کا مرتبہ
اس سبب سب شاعراں ہیں صدق سوں اسکے مرید

---

[۱] رسالۂ اردو، بابت جولائی ۱۹۳۵ء صفحہ ۵۵۸،

ہے جب سوں شعر تیرا شعرِ ولیؔ سے ہم رنگ
اشرفؔ ترے سخن کی رنت آرزو ہے دل میں

ولیؔ نے یو غزل اشرفؔ کرم سوں مجکوں بخشی ہے
سو اپنے نام سوں اس کوں کیا جاری نکو پوچھو

اس آخری شعر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولیؔ خود غزلیں کہہ کر اشرفؔ کو دے دیا کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ولیؔ کی تیرہ ۱۳ غزلیں اشرفؔ کے دیوان میں اشرفؔ کے تخلص کے ساتھ موجود ہیں[1] اس کے علاوہ اشرفؔ نے ولیؔ کے چند مصرعوں کی تضمین بھی کی ہے۔

کرتا ہے یو مصراع ولیؔ صیدِ دل اشرفؔ
"پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا"

یو مصرعِ شعرِ ولیؔ اشرفؔ تو کر وردِ زباں
"غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو"

مجکوں ہے ارشاد اے اشرفؔ ولیؔ سوں یہ سخن
"ترک کرنا عشق کا دشوار ہے دشوار ہے"

خود ولیؔ نے بھی اشرفؔ کے ایک مصرع کو تضمیناً ہے

اشرفؔ کا یو مصراع ولیؔ مجکوں گما ہے
"الفت ہے دل و جاں کوں میرے سیم نگر سوں"

ان اشعار سے نہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ اشرفؔ نے ولیؔ کے کلام سے فیض اُٹھایا ہے اور اس کے کلام کا تتبّع کیا ہے، بلکہ ولیؔ کے ساتھ اس کے شاگردانہ تعلقات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شاعر اپنا کلام

---

[1] کلیاتِ ولیؔ، طبع دوم، غزلیات نمبر ۱۱۳، ۱۵۰، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۸، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴،

دوسرے شاعر کو نہیں دیتا تاوقتیکہ اس کے ساتھ اسنادانہ تعلق نہ ہو۔

اشرفؔ کے دیوان کے مطالعے سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا کلام ولیؔ کے کلام سے بڑی حد تک متاثر ہے اور اس نے اکثر غزلیں ولیؔ کی زمینوں میں اور اسی کے انداز پر لکھی ہیں، یوں تو دونوں کے کئی اشعار اور متعدد غزلیں ایک ہی ردیف و قافیے میں پائے جاتے ہیں مگر ان سب کو نقل کرنا بے جا طوالت ہو گی۔ اس لئے یہاں اشرفؔ اور ولیؔ کے صرف ان اشعار کو نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے جو ہم قافیہ اور لفظاً و معناً آپس میں قریبی مماثلت رکھتے ہیں ؎

اشرفؔ	ولیؔ
تجھ شوق میں چشموں سُوں میرے چشمے ہیں جاری	جاری ہوئے انجھو میرے یو سبزہ خط دیکھ
اے شوخ ٹک آ سیر کر اس آبِ رواں کا	اے خضر قدم سیر کر اس آبِ رواں کا

جو کوئی میرے سخن اوپر سخن بیجا کرے یا رب
نہ پاوے دُو جہاں کے باغ سوں پھل زندگانی کا

ولیؔ جن نے نہ باندھیا دل کوں اپنے نونہالاں سوں
نہ پایا پھل جہاں میں اُن نے ہرگز زندگانی کا

اشرفؔ کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے یہ غزل ولیؔ کی غزل پر لکھی ہے ؎

سخن ہے متبذل جگ میں زبانِ اصفہانی کا
ولیؔ کے طور پر مجھ سا نہیں کوئی ریختہ بولیا

فریاد کہ وُو ظالم بے داد نہ آیا
بے داد کہ وُو قاتلِ جلّاد نہ آیا

مدت ستی مشتاق ہیں عشاق جفا کے
بے داد کہ وہ ظالم بے داد نہ آیا

کرتا ہوں سدا نالہ و فریاد و فغاں میں
وو شوخ ولے سننے کوں فریاد نہ آیا

پہنچی ہے ہر اک گوش میں فریاد ولیؔ کی
لیکن وو صنم سُننے کوں فریاد نہ آیا

اس غزل کے مقطع میں اشرف نے ولی کے مطلع کے مصرعۂ اولیٰ کو تضمین کیا ہے ؎

اشرف	ولی
نیم بسمل تھا تیغ ناز ستی	غمزۂ شوخ نے بہ نیم نگاہ
نگہِ شوخ نے تمام کیا	کام عشاق کا تمام کیا

عاشقاں کے رکت کوں کر پامال	سرخ رویاں منیں سر آمد ہے
ہے یو تجھ حق میں بہترین حنا	تجھ قدم کے اثر سوں رنگِ حنا

اے شکر لب قند سوں تجھ لب کی ہیں باتاں لذیذ
حرفِ تر اس کے ہیں جیسے حلوۂ سوہاں لذیذ (ولی)

کیوں حلاوت بخش ہوئے اس کوں نبات و قند و شہد
اس شکر لب سوں جسے لاگیاں میٹھی باتاں لذیذ (اشرف)

مندرجۂ ذیل غزل کی بحر مختلف ہے لیکن قافیہ و ردیف ایک ہے ؎

ہر جھلک دیتی ہے تجھ رخسار کی
آرسی کوں در بسِ حیرانی ہنوز

رات دن دیکھا تھا تیری زلف کوں
دل میں ہے باقی پریشانی ہنوز (ولی)

تجھ رُخِ روشن کی صافی دیکھ اے رشکِ پری
آرسی ہے غرقۂ دریائے حیرانی ہنوز

بس کہ رکھتا ہوں خیالِ کاکلِ پُر پیچ یار
دِل میرا ہے بستۂ دامِ پریشانی ہنوز (اشرف)

پروا کفن کی نئیں مجھے اے شمع بزم عاشقاں
تجھ عشق میں جو سر دیا اس کوں کفن سوں کیا غرض
ہرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو
جو نیہ کے کوچے میں ہے اس کوں وطن سوں کیا غرض (ولی)
ہر نس زبان حال سوں کہتی ہے شمع انجمن
جو سر کٹا دے عشق میں اس کوں کفن سوں کیا غرض
جو حسن لیلیٰ یاد کر آوارہ و مجنوں ہوا
ہے دشت پیمائے جنوں اس کوں وطن سوں کیا غرض (اشرف)

جو یار نیں ہے میرے پاس از بہار چہ حظ
وگر وجھے نہ ہوئے دل کا غمگسار چہ حظ (ولی)
نہیں جو سیرِ گلستانِ حسنِ یار چہ حظ
نہیں جو بادۂ گل رنگ خوش گوار چہ حظ (اشرف)

کس سوں ولی اپس کا احوال جا کہوں میں
سر تا قدم میں غم سوں غم خانہ ہو رہا ہوں
باتاں لگن کی مت پوچھ اے شمع بزم خوبی
مدت سوں تجھ جھلک کا پروانہ ہو رہا ہوں (ولی)
احوالِ دل سوں میرے ہے بے خبر وو ظالم
غم خوارگی سوں جس کے غم خانہ ہو رہیا ہوں
یو حسن کی جھلک میں دیکھیا ہوں جب تی تب تی
اے شمع تجھ لگن میں پروانہ ہو رہیا ہوں (اشرف)

میں سورۂ اخلاص ترے رُو سوں لکھا ہوں
بسم اللہ دیوان تجھ ابرو سوں لکھا ہوں
تجھ چشم کی تعریف کوں آہو کے نین پر
اگر قلم نرگس جادو سوں لکھا ہوں (ولی)

والشّمس کی تفسیر ترے رُو سوں لکھا ہوں
واللّیل کے معنے ترے گیسو سوں لکھا ہوں
تجھ چشم کے مدہوش کی کیفیتِ مستی
خط قدح نرگس جادو سوں لکھا ہوں (اشرف)

سجن کے باج عالم میں دگر نئیں
ہمن میں ہے ولے ہم کو خبر نئیں
ولی اس کی حقیقت کیوں کے بوجھوں
کہ جس کا بوجھنا حدِّ بشر نئیں (ولی)

وہی ہر ٹھار ہے اس بن دگر نئیں
نہ ہے حیف اس ستی تجکوں خبر نئیں
حقیقت اسکی کنہ معرفت نئیں
سمجھناں بوجھناں حدِّ بشر نئیں (اشرف)

تجھ ذقن کی لذتاں میں محو پایا سیب کوں،
سیب کوں ہے چاہ تب سوں جب سیں دیکھا تجھ ذقن (ولی)

ہر ذقن کے چاہ کوں ہے بس کہ تجھ یوسف کی چاہ
چاہ سوں خالی کیا آپس کوں چاہِ ہر ذقن (اشرف)

سب چمن کے گُل رخاں کا تو ہے زیب اے گُل بدن
گُل بدن تجھ سا نہ دیکھا گرچہ دیکھا سب چمن (ولی)
ہر چمن میں گُل گریباں چاک ہے تجھ رشک سوں
رشک سوں رو رو رکت رنگیں ہوا ہے ہر چمن (اشرف)

ناز کی سرکشی کوں دیکھوں گا
آج میرا نیاز نام رکھو (ولی)
بندۂ باوفا ہے یو اشرف
تم وفادار اس کا نام رکھو (اشرف)

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو ہشیار ہو
کب تک رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو
یوں چتر داغِ عشق کوں رکھ سر پر اپنے اوّلاً
تب فوجِ اہلِ درد کا سردار ہو سردار ہو (ولی)
اے مستِ جامِ بے خودی ہشیار ہو ہشیار ہو
یو خوابِ غفلت کب تلک بیدار ہو بیدار ہو
تسخیرِ ملکِ عاشقی تجکوں اگر ہے آرزو
اے دل الم کی فوج کا سردار ہو سردار ہو (اشرف)

اے دل سدا اس شمع پر پروانہ ہو پروانہ ہو
اس نو بہارِ حُسن کا دیوانہ ہو دیوانہ ہو
چاہے کہ شاہِ حسن کوں لادے اپس کے حکم میں
ٹک عشق کے میدان میں مردانہ ہو مردانہ ہو (ولی)

اے شمع بزم عاشقی پروانہ ہو پروانہ ہو
محوِ خیالِ جلوۂ جانانہ ہو جانانہ ہو
ابرو کماں کے تیر سوں اشرفؔ نکو کر خوف توں
یو عشق کا میدان ہے مردانہ ہو مردانہ ہو (اشرفؔ)

جس دل ربا سوں دِل کوں میرے اتحاد ہے
دیدار اس کا میری انکھاں کا مراد ہے
شاید کہ دامِ عشق میں تازہ ہوا ہے بند
وعدے پہ گل رخاں کے جسے اعتماد ہے (ولیؔ)
جس شوخ خوش ادا سوں مجھے اتحاد ہے
اس کا خیال میری کمال مراد ہے
البتہ دامِ لطف سوں مجکوں کریگا صید
اس باوفا کے قول اُپر اعتماد ہے (اشرفؔ)

کیوں کے جاوے بوالہوس اس کی گلی میں ہو دلیر
ہر نگاہِ تیز اس کی تیر ہے تروار ہے
مت نصیحت کر ولیؔ کوں اے سخن ناآشنا
ترک کرنا عشق کوں دُشوار ہے دُشوار ہے (ولیؔ)
کیوں سلامت جا سکوں مدِ نظر سوں اس کے میں
ہر نگاہِ شوخ سرکش ناز کی تلوار ہے
مجکوں ہے ارشاد اے اشرفؔ ولیؔ سوں یو سخن
ترک کرنا عشق کوں دُشوار ہے دُشوار ہے (اشرفؔ)

ولی

تشنہ لب کوں تشنگی مے کی نہیں ناسور ہے
پنبۂ مینا اسے جیوں مرہم کافور ہے
یاد سوں ساقی کے نس دن ہر پلک ہے شاخ تاک
اشکِ حسرت اس اُپر جیوں خوشۂ انگور ہے

اشرف

جسکے دِل میں تجھ نگہ کے تیر کا ناسور ہے
سیر نرگس حق میں اس کے مرہم کافور ہے
یاد چشمِ مست ساقی جسکے دل میں ہو مدام
ہر سخن میں اس کے فیضِ بادۂ انگور ہے

زندگی میں طائرِ دِل کی خلاصی کیوں کے ہو
پنجۂ زلفِ ستم گر چنگلِ شہباز ہے
دردمنداں کی نظر سوں اس کا گرنا ہے بجا
جو بہ رنگِ طفل اشکِ عاشقاں غماز ہے

مرغِ دل کوں عاشقاں کے صید کرتا ہے سدا
پنجۂ مژگاں نہیں یو چنگلِ شہباز ہے
کیوں کے رہوے جگ منیں پوشیدہ سوزِ دردِ عشق
اشک و آہ و رنگِ زردِ عاشقاں غمّاز ہے

تجھ نین کی ہے نگاہ راست تیر بے خطا
کج ادائی تجھ بھواں کی جوہرِ شمشیر ہے

کیوں نہ پاؤں میں غنیم غم اُپر فتح و ظفر
یادِ تجھ ابرو کی دل کے ہات میں شمشیر ہے

کیا تجھ عشق نے عالم کوں مجنوں
مجھے تجھ رشکِ لیلیٰ کی قسم ہے

دیوانا ہوں تیرا مانندِ مجنوں
ادائے چشمِ لیلیٰ کی قسم ہے

ترے لب پر جو خطِ عنبریں ہے
خطِ یاقوت سوں نقشِ نگیں ہے
سویدا کی نمط جاوے نہ ہر گز
خیال اس خال کا جو دل نشیں ہے

خیالِ نقشِ یاقوتِ لب یار
ہماری خاتمِ دل کا نگیں ہے
سویدا کا نہیں تل دِل پہ میرے
خیالِ خالِ دل بر دِل نشیں ہے

ولی

اے عزیزاں مجھے نہیں برداشت
سنگ دل کا فراق بھاری ہے

کھولنا زلفاں کا کچھ درکار نئیں اے خوش نین
یک نگاہِ ناز تیری دو جہاں کا دام ہے

دیکھ کر تجھ لباں کی یو سرخی
خونِ دل لعلِ رشکِ مرجاں ہے

نہ جانوں کس پری رو کا گزر ہے آج مجلس میں
کہ حیرت سوں ہر اک گل رو مثالِ نقش قالی ہے

آتشِ شوق زلف دل بر سوں
دل عاشق کبابِ شامی ہے

اشرف

کیوں نہ ہوئے غم سنے پہ جیوں پربت
سنگ دل کا فراق بھاری ہے

کیوں نہ ہوے حاصل پریشانی میں جمعیت مجھے
آشیانِ مرغِ دل زلفِ پری کا دام ہے

لب پہ تیرے کہ سرخئ پاں ہے
رشک یاقوت و لعل مرجاں ہے

گزر جس باغ میں ہے اس پری پیکر کا اے اشرف
ہر اک گل پیرہن حیرت منیں جیوں نقش قالی ہے

آتشِ عشقِ زلفِ دل بر سوں
دل اشرف کبابِ شامی ہے

مندرجہ بالا اشعار کے تقابلی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اشرف نے بڑی حد تک کلام ولی کا تتبع ہی نہیں کیا بلکہ اس کی خوشہ چینی کی ہے۔ یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن اشرف ایسے ماہرِ فن قادر الکلام شاعر سے تعجب ہوتا ہے کہ اس نے ولی کی کہی ہوئی متعدد غزلیں اپنے نام سے اپنے دیوان میں شامل کر لی ہیں اگرچہ اس نے ایک غزل کے مقطعے میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ولی نے اس کو یہ غزل بخش دی ہے اس لئے اس نے اس کو "اپنے نام سے جاری کیا" اور ممکن ہے کہ اسی طرح اور

غزلیں بھی ولی نے اس کو عنایت کی ہوں، لیکن ایک شاعر کے لئے کسی دوسرے کا کلام، خواہ وہ اس کے اُستاد ہی کا کیوں نہ ہو، اپنے نام سے دیوان میں شامل کر لینا کسی طرح مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ اس پر اصطلاحی "سرقے" کا اطلاق کیا جائے گا جس سے اس کی شاعرانہ قابلیت پر حرف آتا ہے۔

احباب کا ذکر

ولی کی طرح اشرف نے بھی اپنے اشعار میں اپنے بعض احباب کا ذکر شاعرانہ انداز سے کیا ہے اور بعض کی تعریف میں پوری غزلیں لکھی ہیں۔ ان میں زیادہ تر اُن دوستوں کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے۔ اُن کا سراپا بیان کیا ہے اور ان کے اوصاف حمیدہ و اخلاقِ پسندیدہ کا ذِکر کیا ہے۔ اور خود کو اُن کا والہ و شیدا بتایا ہے۔ اس سے عام طور پر یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ یہ سب کے سب اشرف کے محبوب و مطلوب تھے جن سے اس نے عشق و محبت کا اظہار کیا ہے لیکن یہ قیاس صحیح نہ ہو گا اس لئے کہ اس وقت شاعرانہ طور پر خصوصاً غزلیات میں عزیز دوستوں کی مدح طرازی کا یہی دستور تھا، جیسا کہ خود ولی کے اشعار و غزلیات میں بھی پایا جاتا ہے۔

اشرف کے دیوان میں مندرجۂ ذیل احباب کے نام سے اشعار اور غزلیں موجود ہیں:۔

۱۔ رضی۔ جس کو حمید نے متوطن احمد آباد، اشرف کا معاصر اور ولی کا شاگردِ رشید لکھا ہے، اور اشرف کی ایک غزل کے جواب میں اس کی غزل نقل کی ہے۔ ..ن سے اشرف کے ساتھ اس کے روابط کا پتا چلتا ہے۔ اشرف نے اشعارِ ذیل میں رضی کے تین مصرعوں کو تضمین کیا ہے ؎

اس مصرعِ رضی سوں ہے اشرف مجھے لگن
جیوں عشق پیچہ عشق میں دَل وَل گیا ہوں میں

اس مصرعِ رضیؔ کا اشرفؔ ہے دل سوں بھو کا
بے غم ہمارے غم کوں کھاتا نہیں سبب کیا
یاد کر اشرفؔ یو مصراعِ رضیؔ
مصحفِ گل کا سبق بلبل پڑھے

۲۔ سیّد معالیؔ۔ یہ وہی احمد آبادی سیدزادے ہیں جن کو بعض تذکرہ نویسوں نے ولیؔ کا محبوب بتایا ہے۔ ولیؔ کی طرح اشرفؔ نے بھی سید معالیؔ کی تعریف میں اشعار کہے ہیں ؎

معالی حُسن میں سب سوں بڑا ہے اسے دیکھن کوں کئی عالم کھڑا ہے

؎ جگت کے خوب رُوسارے نہ ہوئیں کیوں حکم میں اس کے
دیارِ حسن میں فرخ سیرِ سیّد معالی ہے

۳۔ ظفر خاں۔ ممکن ہے کہ یہ عہدِ فرخ سیر کا منصب دار ہو جو محمد شاہ کے عہد میں صوبۂ گجرات کا ناظم مقرر ہوا تھا جس کا ذکر صاحبِ مآثر الامرا[1] نے کیا ہے ؎

بُلبُل دِل اُس اُپر ہے مُبتلا ہے ظفر خاں گلشنِ ناز و ادا

۴۔ شمشیر خاں ؎
آتا ہے جب مقابل تیغِ ادا کوں لے کر
کرتا ہے قتل مجکو شمشیر خانِ ابرو

۵۔ نور العین ؎
جب سوں دیکھا جمالِ نور العین
دل ہے محوِ خیالِ نور العین

پوری غزل اسی کی تعریف میں ہے۔

---

[1] خواجہ مظفر نقش بندی فرخ سیر کے عہد میں پنج ہزاری منصب پر فائز اور ظفر خان کے خطاب سے مخاطب تھے۔ پہلے پٹنہ کے صوبے دار تھے پھر صوبۂ گجرات کے ناظم مقرر ہوئے تھے۔ انہوں نے دوحد میں ۱۱۴۹ھ میں وفات پائی (مآثر الامرا، ج ۲ ص ۳۲۳، ص ۳۲۶)

۶۔ عظمت اللہ ؎ عظمت اللہ بس کہ ہے پیارا
جیو اپس کا میں اُس اُپر وارا

۷۔ محمّد یادگار ؎ ناؤں ہے جس کا محمّد یادگار
مجکوں اسکی یاد سے نت کار ہے

۸۔ امیرالدین ؎ شمعِ ہر انجمن امیر الدّین
لالۂ ہر چمن امیر الدین

دو غزلیں اسی کی تعریف میں لکھی ہیں۔

۹۔ جان میاں ؎ یک دم نہیں آرام میرے دل کوں اے اشرفؔ
یو بات کہو جاکے میری جان میاں کوں

۱۰۔ حسن فقیر ؎ تجھ ہجر کی اگن سوں جلیا ہے حسن فقیر
خاکسترِ بھبھوت ملیا ہے حسن فقیر

غالباً یہ کوئی صوفی مشرب درویش تھے جن سے اشرفؔ کو عقیدت ہو گی۔

۱۱۔ حبیب اللہ ؎ یا حبیب اللہؔ توں میری جان ہے
جان و دل تیرے اُپر قربان ہے
ملک گجرات میں حبیب اللہؔ
تیری فرقت نے ہم کوں مارے ہیں۔

اسی غزل میں وہ معین الدین سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎
شکرِ حق کر توں اے معین الدّینؔ
مہرباں تجھ پہ پیر پیارے ہیں

غالباً یہ اشرفؔ کے کوئی بزرگ یا پیرِ طریقت ہوں گے۔

ان کے علاوہ بعض ہندو دوستوں کے نام بھی اشعار اور غزلیں ملتی ہیں

۱۲۔ موتی چند ؎ بس کہ ہے مجکوں یادِ موتی چند
ہے میرا اشک رشکِ دردانہ

۱۳۔ میٹھا لعل سے — جگ منیں مجکوں ہیں حلاوت بخش
اے میٹھا لعل تیرے میٹھے بین

۱۴۔ ابنائی داس سے — مکھ اپس کا دکھا ابنائی داس
دل کوں میرے لے جا ابنائی داس

اسی زمین میں دو غزلیں کہی ہیں ۔

تصانیف اشرف کی تصنیف سے اس کی غزلیات کا دیوان ہے جن کی تعداد ہمارے ناقص نسخے میں صرف ۲۱۱ ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تین سو سے کم نہ ہوں گی ۔ اس کے صرف دو نسخے اب تک دریافت ہوئے ہیں، جن میں سے ایک ۱۱۲۵ھ میں محمد بدیع الزماں نامی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو انجمن ترقی اردو کو سورت سے دستیاب ہوا ہے، دوسرا نسخہ پروفیسر نجیب اشرف کا ہے جو غالباً ان کو احمد آباد سے ملا ہے ۔ یہ اول آخر اور بیچ میں سے ناقص ہے جو شکستہ خط میں لکھا ہوا ہے اور خاصہ قدیم معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس میں سنہ کتابت درج نہیں ہے ۔ یہ دیوان حسبِ دستور حروفِ تہجی پر مرتب ہوا ہے ۔ غزلوں کے اشعار کی تعداد ۵، ۷، ۹، ۱۱، ۱۳، سے لگا کر ۲۰ تک ہے ۔

دیوان کے علاوہ اشرف کے تیرہ مرثیے اڈنبرا یونیورسٹی کے مجموعۂ مراثی میں موجود ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۱۴۰ ہے ۔ ان میں سے بعض مرثیوں کے اقتباسات "یورپ میں دکنی مخطوطات" (ص ۳۷۹) میں نقل کئے گئے ہیں ۔ ایک مرثیہ "دوازدہ شہ پارے" (ج ۱ ص ۳۱۰) میں نقل ہوا ہے ۔

۱۱۲۵ھ میں اشرف نے "جنگ نامۂ حیدر" کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی جو کسی فارسی مثنوی سے ترجمہ کی گئی ہے ۔ اس کا ایک

مخطوطہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں (اڈیشنل ۱۰۵۹) محفوظ ہے گرہم بیلی نے اس کا نام "جنگ نامۂ حیدری" لکھا ہے۔ اس مثنوی کا ذِکر "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں کیا گیا ہے، جہاں اس کی تاریخ تصنیف، تعداد اشعار، سبب تالیف اور زمانۂ تصنیف سے متعلق اس کے بعض اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کی زبان سادہ اور سلیس ہے تاہم قدیم گجراتی اُردو کے اثرات اس میں نمایاں ہیں۔ ایک شعر میں اشرفؔ نے انکسار کے طور پر خود کو عاجز اور غریب لکھا ہے ؎

سو اد قدم ہے (؟) سب جگت کا طبیب
سو اس جگ میں اشرفؔ ہے عاجز غریب

کیا شعر غریب (غربت) گری طور میں ؎
سو فرخ سیر کے کیا دور میں

اس بنا پر مؤلف "دکنی مخطوطات" نے لکھا ہے کہ "غربت میں بسر ہوتی تھی"۔ (ص ۳۴۸) اسی طرح اشرف کے دہلی جلنے کا ذِکر نہ معلوم کس شعر کی بنا پر کیا گیا ہے؟

اس مثنوی میں بہ قول مصنّف ۸۰۶ ابیات ہیں ؎

کیا جنگ یوں مختصر بات میں   کیا آٹھ سو پر چھ ابیات میں

لیکن "اردو شہ پارے" (ص ۱۴۷) میں لکھا ہے کہ "اس مخطوطے میں ۸۶۳ اشعار ہیں"!

کلام پر تبصرہ اشرفؔ دلبستانِ ولیؔ کا نمائندہ ہے اور اگرچہ اس کی زبان ولیؔ کے مقابلے میں زیادہ قدامت

؎ (سو اقدم ا ہے)

اور مقامی رنگ لیے ہوئے ہے، بااین ہمہ اس کا اسلوبِ بیان موثر اور دلنشین ہے۔ زورِ کلام اور حسنِ بیان کے کئی نمونے اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس کی غزلیں تمام تر عشقیہ مضامین سے بھری ہوئی ہیں اور ان میں گل و بلبل، شیشہ و مل، خال و گیسو اور چشم و ابرو کی تعریف مختلف انداز سے کی گئی ہے، لیکن ان پیش پا افتادہ اور فرسودہ مضامین کی تکرار کے باوجود اس کی غزلوں میں بعض پُر معنی اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اس کی فکرِ رسا اور بلند تخیّل کے آئینہ دار ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گرچہ ظاہر میں میرے نزدیک نئیں وہ نورِ چشم
دیکھتا ہوں دیدۂ دل سے تماشا دور کا

؎ گلی سوں یار جانی کے کہیں میں جا نہیں سکتا
سدا مرہونِ احساں ہوں اپس کی ناتوانی کا

؎ بہ رنگِ مے کہنہ ہے نشہ بخش اگرچہ تر حسن جونا[1] ہوا

؎ اگر تھی خوبیٔ دارین کی خواہش اے سنگیں دِل
کسی غمگیں دکھی کا تجکوں دِل بھاری نہ کرنا تھا

؎ غیر کی جانب نظر کرتا نہیں یک نظر جو اس کا نظارا کیا

بھریا ہے سوزِ غم تجھ باج جس کے دِل منیں اس کوں
گگن میں جیوں دِسیں اختر دھگیں[2] مجمر میں جیوں اخگر

؎ بے تامل بولتے نئیں اہلِ ہوش
سب ستی آپس کوں ناداں بوجھ کر

؎ غبارِ زنگِ[3] کلفت ہے نصیبِ صاحبِ جوہر
نہیں ہے کاٹ سوں کچھ باک ہرگز تیغِ چوبیں کوں

---

[1] پُرانا [2] جلیں [3] زنگ، اس لفظ میں تلوار کی کاٹ اور کاٹ بمعنی لکڑی کی بھی رعایت رکھی ہے۔

ے سینہ صافوں کے نزدیک ہے بیقراردل کو قرار
صحبتِ مرآت سوں جمعیّتِ سیماب ہے

استعارات و تشبیہات اور امثلہ و تلمیحات اشرفؔ کے کلام میں وہی ہیں جو عموماً فارسی اور اُردو کے شاعروں کے ہاں رائج اور مستعمل ہیں۔ رعایتِ لفظی، تلازمہ اور ایہام کی بھرمار ہے، لیکن یہ اس عہد کی خصوصیاتِ کلام تھیں۔ اس کے باوجود جہاں تک عاشقانہ مضامین کا تعلق ہے اس کے کلام میں لطافت اور رنگینی پائی جاتی ہے اور تکرارِ مضامین کے ہوتے ہوئے، اس میں ایک طرح کی شگفتگی، روانی اور دلکشی نظر آتی ہے، جو کلامِ ولیؔ کا امتیازی وصف ہے۔ اس کا رنگِ تغزل وہی ہے جو ولیؔ کا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے استاد کے تتبع میں کئی غزلیں لکھی ہیں، لیکن حتی الامکان ولیؔ کے قافیوں سے احتراز کیا ہے اور وہی قوافی استعمال کئے ہیں تو اُن میں مضمون کو بدلنے اور ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں اس کو بہت کم کامیابی ہوئی ہے۔ آخر اُستاد استاد ہے اور شاگرد شاگرد!

اشرفؔ نے مختلف بحروں میں غزلیں لکھی ہیں، اور ہر بحر کو خوب نباہا ہے۔ اسی طرح قافیہ اور ردیف کا بھی بڑا خیال رکھا ہے کئی غزلیں بغیر ردیف کے صرف قافیوں میں کہی ہیں۔ بعض غزلیں ایسی بحروں میں لکھی ہیں جو عموماً اُردو بلکہ فارسی شعرا کے ہاں بھی کم مستعمل ہیں۔ اس سے فنِ عروض میں اس کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً:

۱۔ بحرِ ہزج مثمن اشتر (فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن)

زیبِ مصحفِ رُد کا خطِ خوش نما بس ہے
اس اُپر شعاعِ حُسن جدولِ طلا بس ہے

۲۔ بحرِ رمل مثمن مخبون مسکن (فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن)

دارِ عقبیٰ کا تجھے توشہ اگر بھرناں ہے
ہات کوں راہِ خدا بیچ بلند کرناں ہے

۳۔ بحرِ منسرح مثمن مطوی موقوف (مفتعلن فاعلات مفتعلن فاعلات)

جبکہ شب تارِ زلف رخ سے کھسایا نگار
مطلع خورشید سوں صبح ہوئی آشکار

اس آخری بحر میں ولی کے ہاں صرف ایک آدھ غزل ملتی ہے۔

اشرف کے کلام میں ولی کی بہ نسبت مذہبیت زیادہ ہے۔ موخر الذکر کے ہاں اس کا اظہار زیادہ تر قصائد میں ہوا ہے لیکن اشرف کے ہاں غزلیات بھی مذہبی عنصر سے خالی نہیں ہیں۔ ولی کی طرح اس نے بھی ایک شریف النسب اسلامی خاندان اور مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی اور مذہبی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، اس لیئے مذہبی رجحانات اس کی طبیعتِ ثانیہ بن گئے تھے جن کی جھلک اس کے اشعار میں جا بجا نظر آتی ہے۔ اس نے معاصرانہ رنگِ تغزل کی روش سے ہٹ کر رفعتِ تخیل اور بلند پردازی نہیں دکھائی اس لیئے ان چیزوں کو اس کے کلام میں ڈھونڈنا بے کار ہے۔ زیادہ تر اس نے اپنے احباب اور بزرگوں کی مدح سرائی کی ہے اور اکثر اشعار بلکہ متعدد غزلیں سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی نعت شریف میں لکھی ہیں اور اس پر اس طرح فخر کیا ہے

ہر سخن اشرف میرا کیوں نہ ہوئے مقبولِ حق
نعت محمدؐ ہے زینت شعر میرے کا شعار
صد شکر پس از حمد خداوندِ دو عالم
زیور میرے دیوان کا سدا نعتِ نبیؐ ہے

اگرچہ اشرف کو نعت گوئی کا دعویٰ ہے، لیکن اس کی نعتیں تنوعِ مضامین اور ندرتِ تخیل سے خالی ہیں، البتہ ان میں مذہبی عقیدت اور جوش کافی طور پر پایا جاتا ہے۔ ایک نعتیہ غزل میں اشرف نے عرفی کے مشہور فارسی قصیدۂ نعتیہ کا تتبع کیا ہے جس کا مطلع ہے

؎ اے مہر تو جانِ آفرینش　　نعتِ تو زمانِ آفرینش

مومن دہلوی نے اس کے جواب میں فارسی میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع ہے ؎

اے جسم تو جانِ آفرینش　　جانِ تو جہانِ آفرینش

اشرف نے اُردو میں عرفی کا تتبع کیا ہے اور اس لئے وہ متقدم ہے۔ اس کی غزل کا مطلع ہے ؎

اے راحت جانِ آفرینش　　وے جانِ جہان آفرینش

لیکن اس کے قوافی عرفی کے قوافی سے مختلف ہیں۔

اشرف کے کلام میں ولی کی طرح تصوف و اخلاق کی چاشنی بھی موجود ہے۔ خود سادات اور مشائخ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور پھر حضرات شاہیہ جیسے صوفیائے کرام سے بیعت وارادت تھی، اس لئے تصوف و معرفت سے اس کو لگاؤ ہونا لازمی تھا۔ خود بھی فخریہ لہجے میں کہتا ہے ؎

ہر سخن میرا ہے لبریز معانی سر بہ سر
بس کہ میری طبع اشرف مخزنِ اسرار ہے

اس نے متصوفانہ مضامین کو جا بجا باندھا ہے، لیکن ان میں کوئی گہری حقیقت یا "مسائلِ تصوف" کا بیان نہیں ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:

گوہرِ مقصود کوں وو پایا ہے اسے دریائے فیض
جو کیا ہے تجھ ستی اظہار اپنا مدعا

چشمۂ آبِ بقا کے فیض کوں پہنچا ہے وو
جگ میں اے اشرف جو کوئی ہے سالکِ راہِ فنا

ے بوالہوس نئیں بوجھتے ہیں رمزِ عشق — رازِ دل اُن کوں سنانا ں خوب نئیں
دِل لگا اپنا اسی دل دار سوں — ہر کسی سوں دل لگا ناں خوب نئیں

ے نظر اس کی تجلّی کیوں کے آوے — انکھیاں میں جب تلک نورِ بصر نئیں
منوّر کیوں ہیں یو ذرّاتِ عالم — اگر وو مہرِ انور جلوہ گر نئیں
تصوّر ہے اسی کا مجھ انکھیاں میں — بحمد اللہ غیر اوپر نظر نئیں

ے ہر دور میں ہے وو غمِ دوراں سو بے خبر
اس یارِ غم گسار کی جس دِل میں یاد ہے
آشنا وحدت کے رشتے سوں ہوا نئیں دِل ترا
ورنہ یک رُتبے میں تارِ سبحہ و زنّار ہے
یک گُلِ گلزارِ وحدت ہے تمام اشیائے کوں
عندلیبِ قلب عارف واقفِ اسرار ہے
عین دوزخ ہے طمع جنّت کی اس کے حق منیں
مسکنِ مالوف جس کا کوچۂ دلدار ہے
منوّر کیوں نہ ہووے دِل شب و روز
فروغِ مہر یادِ مہ جبیں ہے

ان متفرق اشعار کے علاوہ بعض پوری غزلیں انھی متصوفانہ اور اخلاقی مضامین پر مشتمل ہیں جن میں سے بعض حلقۂ تغزّل سے نکل کر واعظانہ اور ناصحانہ کلام کی حدود میں داخل ہو گئی ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ عام فارسی و اُردو شعرا کے برعکس بعض غزلوں میں اشرف نے "معشوق" کو صیغۂ مؤنث سے خطاب کیا ہے۔ ولی کے ہاں بھی ایک غزل اس قسم کی پائی جاتی ہے جس کا مطلع ہے ے

مت غصّے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا

اشرف نے بھی غالباً اس غزل میں اپنے استاد کی پیروی کی ہے ؎

اے ہوش ربا سُندر مجھ پاس ٹک آتی جا
رشتے کوں محبّت کے بازو پہ بندھاتی جا

اس طرز میں اس کی ایک اور غزل بھی ہے جس کا مطلع ہے ؎

نہ جانوں کیا سبب سندر محبّت توڑ بیٹھی ہے
اپس کے ہات کی بنگڑیاں غصّے سوں پھوڑ بیٹھی ہے

بعض غزلوں میں ہندی شعرا کی طرح عورت کی طرف سے مرد کی جانب اظہار کیا گیا ہے اور اس میں ہندی الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے ہیں ؎

تجھ باج تج سُکھ سیج کوں میں خاک میں سوئی رے پیا
دردِ جدائی سوں ترے جھُر جھُر کے موئی رے پیا

؎ پیا کی یاد میں جیوں ابر نس دِن بس کہ روتی ہوں
اپس کے صفحۂ دل سوں سیہ نامے کو دھوتی ہوں

؎ تمہیں مجھ سی دُکھیا کے حال کی خواری نکو پوچھو
فراق اس سنگ دِل کا دل پہ ہے بھاری نکو پوچھو

ولیؔ نے بھی اسی طرح کی دو غزلیں لکھی ہیں، مثلاً

ترے بن مجکوں اے ساجن یو گھر اور بار کرنا کیا
اگر تو نا اچھے مجکوں تو یو سنسار کرنا کیا

زبان کے لحاظ سے ولیؔ کی بہ نسبت اشرفؔ کے کلام میں قدیم الفاظ و محاورات زیادہ پائے جاتے ہیں اور قدیم زبان میں لکھنے کے باوجود اس کے دیوان میں بعض اشعار ایسے ہیں جو جدید محاورے

اور روزمرّہ کے مطابق ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

نور نگاہ مردم بیمار چشم ہوں ۔۔۔ رنگ بہار گلشن اسرار چشم ہوں
ہے چار موج بحر خطر بس کہ جوش میں ۔۔۔ گرداب دار خانہ نگہ دار چشم ہوں

بہار نشۂ شوخی جو کچھ ہے اس پری رو میں ۔۔۔ اثر اس کا نہیں موجِ نگاہِ چشم آہو میں
بہ رنگِ شیشۂ مے شمع بزمِ دل نہیں ہوتا ۔۔۔ زلبس ہے سرکسی اس شعلہ قدِ آتشیں خو میں

؎ عجب گل زار حسنِ نازنیں ہے ۔۔۔ کہ جس کے رشک میں خلدِ بریں ہے
خیال نقش یا قوت لب یار ۔۔۔ ہمارے خاتمِ دل کا نگیں ہے
دماغ اس کا پریشاں کیوں نہ ہووے ۔۔۔ جسے سودائے زلفِ عنبریں ہے

اپنے اشعار میں اشرؔف نے جا بجا عجز و انکسار دِکھایا ہے لیکن بعض غزلوں کے مقطعوں میں اس نے دیگر شعرا کی طرح اپنی شاعری کے متعلق تعلّی کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً ؎

سخن اشرؔف کا کیوں نہ ہو کے دِل چسپ
آج وو شاعروں میں ہے ممتاز
شعر ہندی بیچ اشرؔف کا سخن ہے بے نظیر
آج وو استاد ہر ایک اوستاد سند ہے

اس میں شک نہیں کہ اشرؔف کو شعر گوئی میں مہارت تھی اور فنّی حیثیت سے وہ اس میں خاصی دست گاہ رکھتا تھا۔ اس نے زورِ طبیعت دکھانے کے لیے ۵ شعر کی ایک بے نقط غزل بھی لکھی ہے جو حسبِ ذیل ہے ؎

وو دل آرام آکے رام ہوا ۔۔۔ اللہ اللہ ہمارا کام ہوا
طرۂ مہر ماہ رو ہر دم ۔۔۔ دِل ہر اہلِ دِل کا رام ہوا
گوہر مدّعا ہوا حاصل ۔۔۔ ہر گہ آکہ وہ ہم کلام ہوا
دل ہمارا ہو محو دردِ امام ۔۔۔ عالم درد کا امام ہوا
اسم اللہ و احمدِ مرسل ۔۔۔ درد اشرؔف علی الدوام ہوا

معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے سوا اشرف نے دیگر اصنافِ سخن کے کوچے میں قدم نہیں رکھا۔ اس کی بعض غزلوں میں قصیدے کی شان ہے۔ مثلاً وہ غزل جس میں اس نے ائمہ اثنا عشر کی مدح لکھی ہے۔ الفاظ کی بندش، ترکیبوں کی چستی اور شاندار الفاظ کا استعمال اس کو قصیدے کی حدود میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس نے ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ بھی کیا ہے اور چند مرثیے بھی لکھے ہیں، ان کی حیثیت مذہبی نظموں سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں فارسیت کا رنگ اس قدر غالب نہیں ہے جو اس کی غزلیات کا امتیازی وصف ہے، تاہم ان میں خاصی ادبیت پائی جاتی ہے۔

اشرف کی زبان

اشرف کے زمانے میں ولی کی بدولت اردو زبان بہت بڑی حد تک صاف ہو چکی تھی اور اکثر قدیم الفاظ و محاورات متروک ہو چکے تھے، اس لئے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ولی کا شاگرد ہونے اور اس کے کلام سے اس قدر استفادہ کرنے کے باوجود اس نے قدیم گجراتی الفاظ و محاورات کا استعمال کیا ہے۔ اگرچہ عام طور سے جو قدیم الفاظ اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں وہ بہت کچھ ولی کے ہاں بھی مشترک ہیں۔ لیکن ان میں بعض الفاظ ایسے ہیں، جو گجراتی، اردو میں خاص طور پر مستعمل تھے، مثلاً:

تمہیں (تم)، تیں (تو) انگے (آگے) انو (انھوں نے) آنے (اور) منیں (میں)، توں (تو) وو (وہ) ہوئے (ہووے، ہو) جیوں (جوں) تجھ (تیرا) مجھ (میرا) اپتا اپتی (اتنا، اتنی) کبھوں (کبھی) کدھیں (کبھی) تیونچہ (ویسا ہی) آجھ (آج) کال (کل) کرناں (کرنا) کھیلا (کھلا) وغیرہ۔

ان الفاظ کے علاوہ اشرف کے کلام میں ٹھیٹھ گجراتی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اگرچہ ولی نے بھی کئی الفاظ گجراتی اردو کے استعمال

کیے ہیں، لیکن اشرف کے ہاں وہ الفاظ و محاورات ملتے ہیں جو ولی کے زمانے میں متروک ہو چکے تھے۔ مثلاً:

لونا (کاٹنا، فصل) چانا (چاہنا) ڈھپنا (ڈھکنا، سرپوش) کوا ٹپنا (کنواں پھلانگنا یعنی مشکل کام کو انجام دینا) پَرونا (مہمان) جونا (پُرانا) پھٹ (تُف) جُھرجُھر کر (گھُل گھُل کر) ہیل (قطار) کھسانا (ہٹانا) بھٹ (برہمن) ٹھک (وقت، ساعت) دَھگنا (جلنا) دھیرا رہنا (صبر کرنا) ادھیر (بے صبری) بھچڑنا (جھیپنا) بھولا پڑنا (راستہ بھول جانا) ریل (سیلاب) جنتر (ساز) سَواد (مزہ) کاٹ (زنگ) روندھانا (گھٹنا سینے کا) کسالی (کسیلی بدمزہ) وغیرہ۔

اشرف نے بھی ولی کی طرح بعض الفاظ مذکّر کو مونّث اور مونّث کو مذکّر، مخفّف کو مشدّد اور مشدّد کو مخفّف متحرّک کو ساکن اور ساکن کو متحرّک باندھا ہے، لیکن اکثر ضرورتِ شعری سے ایسا کیا ہے اور کچھ طرزِ املا کی وجہ سے بھی غلط فہمی ہوتی ہے، مثلاً اس کے دیوان میں اکثر یائے معروف کو یائے مجہول لکھا گیا ہے۔ بہر حال اس معاملے میں وہ ولی کا ہم آہنگ ہے، البتہ ہندی الفاظ ولی کی بہ نسبت اس نے کم استعمال کیے ہیں۔ فارسی الفاظ کی کثرت کے ساتھ فارسی کی ترکیبیں اضافت در اضافت باندھتا چلا گیا ہے جو شعر کے لئے غیر فصیح بلکہ مذموم مانی جاتی ہیں۔

نثر اُردو کا مُجدّد

غالبؔ

اردو کے نامور شاعر مرزا غالبؔ کی زندگی، شاعری اور تصانیف پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن غالبؔ کو بحیثیت مُجدّدِ نثر اُردو روشناس کرانے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ ان کی "مشکل پسندی" کا غلط تصوّر کر کے ان کے فارسی آمیز اُردو اشعار کو ان کی اُردو کا نمونہ سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ ان کو نثرِ اُردو کا مُجدّد کہنا چاہیئے جس نے زبان اُردو کی کایا پلٹ دی اور جس کی تجدید کا سہرا مرزا غالبؔ کے سر ہے چنانچہ یہ وہی زبان ہے جسے آج ہم "اردو" کہتے ہیں اور جس میں تقریر و تحریر کر رہے ہیں۔ آیئے تاریخی حیثیت سے نثرِ اُردو کے ارتقا کا ایک سرسری جائزہ لیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس سلسلہ میں غالبؔ نے اپنا کس قدر حصّہ پیش کیا ہے۔

زبان اُردو کے مورخین نے اُردو نثر کی پہلی کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب "معراج العاشقین" قرار دی ہے جو آٹھویں صدی کی قدیم دکنی زبان کا نمونہ ہے۔ اس کے بعد سے کئی کتابیں نثر کی گجرات اور دکن میں لکھی گئیں، لیکن جو زبان ان کتابوں کی ہے ہم اسے اُردو نہیں کہہ سکتے۔ اس کو دکنی گجراتی یا پھر ہندی اور ہندی کہہ سکتے ہیں جیسا کہ ہمارے دکنی اور گجراتی مصنّفین خود اسے سمجھتے رہے ہیں۔ ابتدا میں اُردو کی نظم و

نثر ہندی یا ہندوی میں لکھی جاتی تھی ۔ ولی کے زمانے سے اس زبان کی اصلاح ہوئی اور اسے ریختہ کہا گیا ۔ لفظ " ریختہ " کی تعریف اور معنی میں بہت کچھ اختلاف ہے ۔ بعض نے اس کو لفظی معنوں میں لیا ہے اور بعض نے اصطلاحی میں ۔ بعض نے اس کو شاعری کے لئے مخصوص قرار دیا ہے ۔ دراصل " ریختہ " سے مراد وہ فصیح اُردو زبان ہے جو ابتدائی زبان " ہندوی " کے بعد وجود میں آئی اردو اس کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے ۔ اس پر فارسی عربی کا کافی اثر پڑا اور ان دونوں زبانوں کے طرزِ ادا اور اندازِ بیان نے اس کو ایک مخصوص اور مستقل زبان بنا دیا ۔ اس ریختہ کی ایجاد کا سہرا ایک گجراتی شاعر ولی احمد آبادی کے سر ہے اور سب سے پہلے انہی نے اپنی نظم میں اس کو رائج کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو " اُردو زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر " کہتے ہیں ۔ بقول آزاد " جب ولی کا دیوان دلّی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا ، قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا ، لذّت نے زبان سے پڑھا ، گیت موقوف ہو گئے قوال معرفت کی محفلوں میں انہی کی غزلیں گانے بجانے لگے ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا " (آبحیات صہ ۹۲)

اس " والیٔ ملکِ سخن[1] " کی ولایت کی توجیہہ بھی لگے ہاتھوں اُردو کے اس رنگین بیان داستان سرا کی زبانِ قلم سے سن لیجئے ۔ فرماتے ہیں :

" شاعرِ قدرت کے دیوان میں ایک سے ایک مضمون نیا ہے مگر یہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں کہ شاعری کا چراغ تو دکن میں روشن ہو اور ستارے اس کے دلّی کے اُفق سے طلوع ہوا کریں ۔ اس عہد کی حالت اور بھاشا کی

---

[1] ہوا جو خادمِ شاہِ ولایت   ولی ہے والیٔ ملکِ سخن ہے

زبان کو خیال کرتا ہوں تو سوچتا رہ جاتا ہوں کہ یہ صاحب کمال زبان اُردو اور انشار ہندی میں کیونکر ایک نئی صنعت کا نمونہ دے گیا اور اپنے پیچھے آنے والوں کے واسطے ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالتا گیا۔ کیا اسے معلوم تھا کہ اس طرح یہ سڑک ہموار ہو گی۔ اس پر دکانیں تعمیر ہوں گی۔ لالٹینوں کی روشنی ہو گی۔ اہلِ سلیقہ دوکان دار جواہر فروشی کریں گے اور اُردوئے معلیٰ اس کا خطاب ہو گا،، ۱

آج ہم آپ اس ولی کی ولایت کے قائل نہ ہوں لیکن خود اس کے معاصرین اور اس کے بعد کے آنے والے سخنداروں نے اس کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے جن میں "خدائے سخن،، کا یہ اعتراف بہت معنی خیز ہے:

یوںہی نہیں ہم عاشق اس ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس کے ساتھ ہی "ریختہ" یا خالص اُردو میں شعر کہنے پر مرزا غالب کا یہ انکسار بھی کچھ کم بلیغ نہیں ہے:

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

یہی "خدائے سخن" میر تھا جو "والیٔ ملک سخن" اور "استادِ ریختہ،، کے درمیان واسطہ العقد بن گیا!

نظم میں "ریختہ،، کی ایجاد خود اردو زبان کی ایک ارتقائی صورت تھی کہ اس پر میر اور ان کے بعد غالب کا اس کو سلیس اور سہل ممتنع کی حد تک پہنچا دینا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ یہ تو زبان کی حد تک تھا، لیکن ان کا یہ قول "کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور،، نظم کے علاوہ نثر میں بھی

---

۱ آبحیات صہ ۹۱،

اپنا جواب نہیں رکھتا۔

اس آخری "استادِ ریختہ" نے نظم و نثر کی درسگاہ میں "ریختہ" کی نوشت خواند" کا جو سبق پڑھایا تھا، اس کو تقریباً عہدِ حاضر کے تمام ادیب اور شاعر رٹتے جا رہے ہیں اور اس کا اثر ہماری زبان اور ادب پر اس قدر غالب ہے کہ کسی طرح مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

قصرِ سخن کی تزئین و تحسین میں غالب کی استادی اور بے مثل صنعت گری ایک وسیع موضوع ہے جو تفصیلی اظہارِ خیال چاہتا ہے، لیکن سب سے بڑھ کر غالب کا عظیم الشان کارنامہ زبان اُردو کی وہ اصلاح و تجدید ہے جس نے نہ صرف نثر اُردو، بلکہ شعر کی زبان میں بھی انقلاب پیدا کر دیا ہمارے مورخین ادب کی یہ سہل انگاری کس قدر افسوسناک ہے کہ جدید اُردو کی تعمیر میں غالب کی اولیت کو نظر انداز کر گئے ہیں اور اس کی اہمیت سے اس قدر غافل ہیں کہ اردو نثر کی تاریخ لکھتے وقت جدید نثر اُردو کی ابتدا سر سید سے کرتے ہیں۔ یا اگر میر امن سے شروع کرتے ہیں تو بیچ میں غالب کو چھوڑ جاتے ہیں۔ آزاد کا تو ذکر ہی کیا کہ انہوں نے زبان اُردو کی تاریخ کے سلسلہ میں غالب کے اس تجدد کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے، لیکن بعد کے مورخین ادب نے حتیٰ کہ خود غالب کے شاگردِ رشید مولانا حالی نے بھی غالب کی خصوصیت کو نمایاں کر کے نہیں دکھایا، بلکہ اس کو صرف مکتوبات کی حد تک محدود سمجھا، حالی تو صرف اسی قدر کہہ کر رہ گئے ہیں کہ "مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی سے نہیں ہوئی"[1] البتہ شبلی کی نکتہ شناس نگاہ نے اس اولیت کی ایک

---

[1] یادگارِ غالب صفحہ ۱۵۶۔

جھلک دیکھی اور ہمیں بھی دکھلائی ہے۔" سرسیّد مرحوم اور اُردو لٹریچر"، پر اپنے ایک مقالہ میں فرماتے ہیں:

"آثار الصنادید" جس زمانے میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ئہ میں دلّی کے مشہور شاعر غالبؔ نے اُردو کی طرف توجّہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اُردو میں لکھنے شروع کئے اور چونکہ وہ جس طرف متوجّہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے تمام ہمعصروں کے خلاف مکاتبہ کا مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثل رنج وغم، مسّرت و خوشی، حسرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔" اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدّد سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگِ بنیاد مرزا غالبؔ نے رکھا۔"

تاریخ ادب میں واقعیّت اور دیانت کا تقاضا ہے کہ اُردو شاعری کے اس مجدّد اور موجودہ نثر کے اس معمارِ اعظم کی دماغی کاوشوں اور ادبی کوششوں کا اعتراف کیا جائے جن سے موجودہ انشا پردازی اور سخن طرازی اس بام عروج پر پہنچی ہیں۔ مولانا شبلی نے غالبؔ کو" اُردوئے جدید" کا سنگ بنیاد رکھنے والا مانا ہے، لیکن تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے تو میر امّن تھے جن کی باغ و بہار اُردو کے چمن میں" سدا بہار" رہے گی، البتہ غالبؔ کے حصّہ میں" مجدّدیت" آئی اور یہ بجائے خود بہت بڑا کارنامہ ہے جس نے اردو ادب و انشا کے مجدّدین میں ان کو شہرتِ دوام عطا کی ہے۔

غالب سے پہلے نثر اردو ترقی کی دو بڑی منزلیں طے کرچکی تھی خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین سے فضلی کی دہ مجلس تک ایک دور ختم ہوگیا۔ دوسرا دور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اربابِ نثر کا تھا، یہ دونوں دور غالب کے پیشِ نظر تھے۔ پہلے دور کی نثر تمام تر دکنی یا ہندوی زبان تھی اور دوسرے دور کی اردو باوجود سلیس اور سادہ ہونے کے قدامت کا رنگ لئے ہوئے تھی، جس میں قدیم فارسی نثر کے تتبع اور طرزِ ادا کے ساتھ ایک قسم کا تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے، اگرچہ میر امن کی نثر بہت صاف اور سلیس ہے، لیکن میر امن سے لیکر غالب کے دور تک جتنی نثری کوششیں ہوئیں، جن میں فسانہ عجائب، بوستانِ خیال اور اسی قسم کے افسانے اور دیگر تصانیف شامل ہیں، سب کی سب طرزِ قدیم کی حامل ہیں اور اس لحاظ سے دورِ ثانی میں رکھی جانے کے قابل ہیں۔ غالب سے نثر اردو کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے نثر اردو میں ایسی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کردیں کہ نثر کا انداز بالکل بدل گیا۔ انہوں نے اس کی ابتدا خطوط سے کی جن میں بول چال، روزمرہ اور آمنے سامنے کی گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا ابہام یا الجھاؤ نہیں ہے چونکہ مرزا نے نثر کا جو ڈھنگ ایجاد کیا وہ مکتوبات کی صنفِ خاص میں تھا اس لئے اس کو صرف مکتوبات کی حد تک محدود سمجھ لیا گیا اور ان کو صرف خطوط نویسی میں طرزِ جدید کا موجد مانا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا طرزِ ادا اور اسلوبِ نگارش محض خطوط تک محدود ہے؟ کیا عام نثر اردو پر اس کا اثر نہیں پڑا؟ کیا اس نثر سے کوئی کام نہیں لیا گیا؟ یقیناً اُن کی نثر نے عام رواج پایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موجودہ اُردو اس طرزِ جدید کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس کا سنگِ بنیاد میر امن نے رکھا اور غالب نے اس کی تجدید و اصلاح کرکے اس کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا!

بیرنگِ من است

بعض اوقات معمولی واقعات سے بڑے اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو ہم جس بات کو غیر اہم سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں وہی بڑی اہم بلکہ آئندہ چل کر دوسروں کے لئے حیرت کا موجب بن جاتی ہے۔ شاعری میں جس چیز کو مرزا نے معمولی اور غیر اہم سمجھا وہی چیز خود ان کے زمانے میں سر آنکھوں پر رکھی گئی، اور ہمارے زمانے میں تو وہ "الہام" سمجھی گئی! ان کا "بیرنگ" مجموعۂ اشعار "نقش ہائے رنگ رنگ" کی بہار دکھانے لگا، بقول آزاد "وہی دیوان ہے کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔" اسی طرح غالب جو معاشرہ کے عام دستور کے مطابق فارسی ہی میں خطوط لکھا کرتے تھے، اس میں قافیہ سنجی اور عبارت آرائی سے تنگ آکر سلیس اور سادہ اردو میں اظہار خیال پر آمادہ ہو گئے، چنانچہ مولوی عبدالرزّاق شاکر کو لکھتے ہیں:

"بندہ نواز، زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی وجگر کاوی کی قوّت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ\
اب عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں میں نے فارسی میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے ان میں سے جو صاحب الی الآن ذی حیات موجود ہیں ان سے بھی عندالضرورۃ اسی زبان مروّج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے اور اب میں انتہائے عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور بہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی

سے زندہ درگور رہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیئے۔ نظم ونثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی اعانت وعنایت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی و قائم رہے گا۔ پس امیدوار ہوں کہ انہیں نذور محقرہ یعنی تحریرات روزمرہ اُردوئے سادہ وسرسری کو تاامکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں۔" (عود ہندی ص ۱۵۶)

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے پچھلی زندگی میں اردو میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے تمام خطوط دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو میں خطوط لکھنے شروع کئے تھے۔ یہ رقعات اگرچہ اُردو نثر کی ارتقائی صورت پیش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مرزا صاحب نے ان کی زبان کو اردوئے سادہ وسرسری سے تعبیر کیا ہے اور اس کی شہرت کو اپنی سخنوری کے شکوہ کے منافی سمجھا ہے اور جب ان کے ایک شاگرد منشی شیو نرائن نے ان خطوط کو چھاپنا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے کہ کوئی رقعہ ایسا ہو گا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو گا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضروری ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات دوسروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپنا میرے خلافِ طبع ہے۔" (اُردوئے معلّٰے ص ۳۶۱ ۱۸۶۹ء)

اس انکار کے باوجود ان کے ایک شاگرد منشی جواہر سنگھ جواہر نے ان کے خطوط کا مجموعہ "اُردوئے معلّٰی" کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع کیا اور اس پر مرزا کے شاگرد رشید میر مہدی مجروح نے دیباچہ لکھا۔ میر صاحب نے اس میں مرزا کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"معنی میرے قول کی یہ اُردو کی تحریر ہے کہ سہل الممتنع کیا بلکہ ممتنع النظیر ہے۔ اس اُردو کا نیا انداز ہے کہ جس کے دیکھنے سے رُوح کو اہتزاز ہے مدّت سے حضرت کو اس طرزِ نو ایجادِ اُردو سے لگاؤ ہے اور خط کتابت میں اسی کا برتاؤ ہے" (اُردوئے معلّیٰ ص۲)

اگرچہ مرزا صاحب کو "اُردو کی سرسری" میں لکھے ہوئے اپنے خطوط کا چھپوانا اس وجہ سے گوارا نہ تھا کہ ان میں وہ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی نہ تھی، جو اس زمانے کی طرزِ انشا اور اس عہد کا مذاقِ طبیعت تھا اور اس کے علاوہ زورِ قلم اور قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ علمی و فنی واقفیّت کا اظہار بھی مقصود تھا۔ بایں ہمہ آگے چل کر ان کو اس طرزِ مکتوب نویسی پر ناز و افتخار ہونے لگا تھا اور اس اندازِ تحریر کو وہ اپنی ایجاد سمجھتے تھے۔ چنانچہ مرزا حاتم علی مہرؔ کو لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔" (اُردوئے معلّیٰ ص۲۵۸)

اگرچہ بعض خطوط میں غالبؔ کی نثر کچھ قدامت کا رنگ لئے ہوئے ہے کہ ان میں تھوڑی سی قافیہ بندی پائی جاتی ہے، لیکن ان کے مکاتیب کے مجموعوں میں بے شمار خطوط ایسے ہیں جو بہت سادہ و سلیس اور سہلِ ممتنع کے بہترین نمونے ہیں۔ مکتوبِ ذیل بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے منشی ہرگوپال تفتہؔ کو لکھتے ہیں:

"صاحب! کیوں مجھے یاد کیا، کیوں لکھنے کی تکلیف اُٹھائی، پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمر الدین خاں کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی وہ تو پنشن کی فکر میں تھے ظاہرا یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش

کی، حق تعالٰے ان کی جو مُراد ہو بر لادے۔ ان کو میرا سلام کہنا۔ تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو۔ بیس جزو ہیں تو بے تکلف بھیجدو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گون ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا۔ شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیجدو۔ غالب یکشنبہ ۱۲ راپریل ۱۸۵۸ء"

اس میں شک نہیں ہے کہ غالب کے اس طرزِ انشا کی عام طور پر تقلید کی گئی اور یہ ان کی سادہ نثر نگاری کا اثر تھا کہ سرسید، آزاد، نذیر احمد حالی اور شبلی جیسے اردو کے زبردست انشا پرداز ہوئے جنہوں نے غالب کے تجدد اور اصلاح سے متاثر ہو کر اس طرزِ انشا کو بہت ترقی دی خصوصاً مؤخر الذکر نے تو غالب کے طرزِ مکتوب نویسی کو اپنانے کی کوشش بھی کی ہے[۱] سرسید اور حالی کا غالب سے براہ راست استفادہ کرنا اور ان کی علمی صحبتوں سے مستفید ہونا امرِ واقعی ہے[۲] اور ان دونوں بزرگوں کی سادہ و سلیس نثر میں غالب کی "اردوئی سادہ و سرسری" کی جھلک پائی جاتی ہے۔

غرض یہ کہ غالب کے طرزِ انشا نے بعد کے نثر نگاروں کی کافی رہنمائی کی ہے اور اس لحاظ سے انہوں نے اردو زبان کی وہ گرانقدر خدمت انجام دی ہے جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی سادہ و سرسری اردو آج بھی ہمارا قابلِ فخر سرمایہ ہے اور ان کے یہ "ناچیز تحفے" (نذور محقرہ) ہمارے لئے بیش بہا ارمغاں سے کم نہیں ہیں جن کی بدولت ہماری زبان نے وہ

۱؎ ملاحظہ ہو مکاتیب شبلی، ص۲؎ دیکھو آثار الصنادید طبع اول باب چہارم، ذکر غالب اور یادگارِ غالب۔

ارتقائی منازل طے کئے ہیں کہ آج وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہمدوش ہے اور ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ اُردو شاعری میں زبان اور اندازِ بیان دونوں کی تجدید و تکمیل غالبؔ کے حصّہ میں آئی، یہی شرف کیا کم تھا کہ قصرِ شاعری کا یہ آخری نقاش، ایوانِ نثر کا معمارِ اعظم قرار پایا!

؎ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا!

غالب کا ایک شعر

بعض مدعیانِ شعر و سخن نے مرزا غالب کے فارسی اور اردو کلام میں سے توارد کی مثالیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ ان کا فلاں شعر فلاں فارسی شاعر کا ہم مضمون یا اُس سے ماخوذ ہے۔ بعض نے تو یہاں تک جرأت کی ہے کہ مرزا کے بعض اشعار کو فارسی شعراء کے کلام سے سرقہ ثابت کیا ہے، لیکن اس قسم کے توارد کی مثالیں متقدمین اور متاخرین شعراء کے کلام میں بکثرت ملتی ہیں اور یہ کسی طرح معیوب بھی نہیں بلکہ اس سے شاعر کی وسعتِ نظر اور کثرتِ مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے اور اس طرح ایک شاعر کے مضمونِ شعر کا دوسرے کے شعر سے لڑ جانا ایک اتفاقی امر ہوتا ہے جو کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسی بنا پر ابوطالب کلیم کو کہنا پڑا۔

ولے علاجِ توارد تواں نکرد کہ من
مگر زباں بسخن گفتن آشنا نکنم

اثنائے مطالعہ میں مشہور عربی ادیب و شاعر صلاح الدین الصفدی (م ۷۶۴ھ) کا یہ شعر نظر سے گزرا۔

لا تحسبوا ان حبیبی بکنی
لی رقۃً یا بُعد ما تحسبون

(یہ نہ سمجھنا کہ میرا محبوب جو رو رہا ہے تو میرے حال پر ترس کھا کر۔ یہ گمان کس قدر بعید ہے!)

فما بکیٰ من رقۃٍ انّما
أرا د ان یسقی سیف العیون

[(ہاں تو) تو وہ کسی رقّت کی وجہ سے نہیں رویا، بلکہ (اس رونے سے) اس کا مقصد شمشیرِ چشم کو آب دینا تھا]

اس کے بعد ہی فارسی شاعر شریف تبریزی (م ۹۴۱ھ) کا یہ شعر سامنے آیا۔

نہ از رحم است اگر تر ساخت جاناں چشمِ فتاں را
برائے کشتنِ من داد آبے تیغِ مژگاں را

(اگر محبوب نے اپنی فتنہ پرداز آنکھوں کو (رو کر) تر کیا تو یہ مجھ پر ترس کھا کر نہیں بلکہ میرے قتل کرنے کے لئے اس نے اپنی تیغ مژگاں کو پانی چڑھایا)

فوراً غالب کے اس شعر کی طرف ذہن منتقل ہوا۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

عربی اور فارسی شاعر دونوں محبوب کے روتے کا ذکر بصیغۂ غائب کرتے ہوئے صرف یہ کہتے ہیں کہ محبوب کے رونے کا مقصد عاشق کا ترس کھانا نہ تھا بلکہ اپنی پلکوں کی باڑھ کو پانی چڑھانا تھا، لیکن مرزا صاحب اس کو معاملہ بندی کی حد تک لے گئے ہیں اور خود محبوب سے مزے لے لے کر کہہ رہے ہیں کہ "اس طرح حالت" لگاوٹ (معاشقہ FLIRTATION) میں تیرے یک بیک رو دینے کی کیفیت مجھے مارے ڈالتی ہے۔ اس طرح انہوں نے خاص "لگاوٹ" کی حالت میں محبوب کے رو دینے کا منظر دکھایا ہے اور ساتھ ہی اس تیغ آبدار چشم کے چلنے سے پہلے اپنے قتل بلا شمشیر ہو جانے کی کیفیت ظاہر کی ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے محبوب کے اس حالتِ لگاوٹ میں "تیغ نگہ کو آب دینے" کو دوسرے کے لئے ناممکن العمل بتایا ہے یہ ایسے پہلو ہیں جو شعرائے ماقبل کے کلام میں

نہیں پائے جاتے ہیں۔ وللہ درہ:

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اسی لئے غالب کی قوتِ اختراعی کی داد دینی پڑتی ہے۔ رہی مضمون کی مشابہت اور مماثلت تو بڑے بڑے شعرار کے ہاں اس قسم کے توارد کی مثالیں پائی جاتی ہیں جو کسی طرح معیوب نہیں اور بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ غالب نے اپنے پیش رو شعرار کے کلام کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا ہے۔ تب بھی ان کے کمال سخن کی داد دینی پڑے گی کہ انہوں نے اس مضمون کو بہت بلند کر دیا ہے اور اس میں ایک خاص جدت پیدا کی ہے جو ان کے کلام کو ہمیشہ دیگر شعرار کے کلام سے ممتاز کرتی ہے۔

مرزا غالب اور امیر مینائی

(۱۷۹۶ء - ۱۸۶۹ء) (۱۸۲۸ء - ۱۹۰۰ء)

مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی اور منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی اردو کے نامور شاعر گزرے ہیں اور دونوں کا شمار اردو کے اساتذہ میں ہوتا ہے غالب نہ صرف فارسی اور اردو کے ایک مسلم الثبوت اور بلند رتبہ شاعر تھے، بلکہ زبان دانی اور لغت کی تحقیق میں بھی منفرد اور یگانۂ روزگار تھے۔ لغوی اور لسانی تحقیق میں ان کے کارنامے تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں ۔امیر مینائی فنِ شعر اور لغت کے علاوہ عربی و فارسی کے عالم اور رسمی علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے ۔اردو شاعری میں وہ استادِ فن مانے گئے ہیں ۔اس کے علاوہ فارسی میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور لغوی و لسانی مباحث میں ان کو جو دسترس تھی وہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے خصوصاً امیر اللغات ان کی لغوی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے ۔ اگرچہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے ۔ ان دونوں بزرگوں میں جو دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے ۔ان سے بہت کم لوگ واقف ہیں، مرزا صاحب کے بعض خطوط سے ان تعلقات کا پتہ چلتا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ امیر کی وجاہت اور فنِ شعر گوئی میں ان کی قابلیت کے معترف تھے اسی طرح امیر غالب کو سخن دانی، فارسی شعر و ادب اور لغت میں استاد مانتے تھے۔

غالباً ان دونوں کے تعلقات کا آغاز ۱۸۵۸ء سے ہوتا ہے، جبکہ

ان کا تعلق دربار رامپور سے تھا اور قیام رامپور کے زمانے میں ان دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی کسی تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ خود امیر نے اپنے تذکرہ "انتخاب یادگار" میں اس پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔ امیر ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور گئے۔ اس سے پہلے ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں ناظم مرزا غالب کے شاگرد ہو چکے تھے اور خط و کتابت کے ذریعہ مرزا صاحب ان کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ خود مرزا صاحب ۱۸۶۰ء میں پہلی بار رامپور تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے امیر سے ان کی ملاقات نہ ہوئی ہوگی، لیکن دونوں ایک دوسرے سے آشنا ہو چکے تھے۔ مرزا کے تمام مکاتیب میں کوئی مکتوب امیر کے نام نہیں پایا جاتا۔ البتہ مرزا نے اپنے ایک خط میں جو انہوں نے ۱۲ رجون ۱۸۵۹ء کو اپنے ایک شاگرد منشی شیو نرائن کے نام لکھا تھا، امیر کا ذکر کیا ہے اور اس میں ان کو اپنا دوست بتایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ اب کے تمہارے معیار الشعرا میں مَیں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد اُن کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا۔ نام اور حال جو میں اوپر میں لکھ دیا اس کو اب کے معیار الشعرا میں چھاپ کر دو ورقہ یا چہار ورقہ رامپور اُن کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پہ یہ

لکھو کہ در رامپور بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد امیر تخلص برسد ۔ مجھ کو اس کی اطلاع دو اور اس امر کی بھی اطلاع دو کہ رامپور کو تمہارا اخبار جاتا ہے یا نہیں ۔"

در رسالۂ یکشنبہ ۱۲ جون ۱۸۵۹ء[1]

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے رامپور جانے سے قبل ہی امیر سے ان کی خط و کتابت نواب صاحب کے کلام کی اصلاح کے سلسلے میں رہی ہوگی اور اسی ضمن میں امیر نے رسالۂ معیار الشعرا میں اپنے کلام کی اشاعت کے بارے میں مرزا صاحب کو لکھا ہوگا اور غزلیں بھیجیں ہوں گی جس کی بنا پر غالب نے اپنے شاگرد کو یہ ہدایت کی ہے لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ ان دونوں کے مکاتیب میں جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں ایک دوسرے کے نام کوئی مراسلت نہیں پائی جاتی ۔ "دوست" کا لقب غالباً یہاں رسمی طور پر استعمال ہوا ہے کیونکہ ایک ہی دربار سے دونوں متوسل تھے اور اسی بنا پر ان دونوں میں گونہ تعلق قائم ہو گیا تھا ۔ ورنہ غالب امیر سے عمر میں دوچند تھے ۔ ۱۸۵۹ء میں امیر کی عمر صرف ۳۱ برس کی تھی جبکہ غالب ۶۳ برس کی پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے ۔ اس لئے امیر کو انہوں نے رسماً اور اخلاقاً اپنا دوست بتایا ہے ۔ اس خط میں غالب نے امیر کی ذاتی وجاہت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور نہ کوئی تعریفی کلمہ استعمال کیا ہے ، لیکن یہی کیا کم ہے کہ مرزا نے ان کی غزلوں کو اس قابل سمجھا کہ ان کے چھاپنے کی سفارش کی اور اپنے توسط سے اپنے نام کے ساتھ ان کی اشاعت گوارا فرمائی ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب نے امیر کا کلام پسند کیا اور اپنے ایک ہمعصر نوجوان شاعر کی ہمت افزائی کی ۔

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۲۷۳ طبع ۱۸۶۹ء دہلی ۔

اس واقعہ کے کوئی تین برس بعد امیر کا ایک قطعہ غالب کی حمایت میں شائع ہوا۔ ۱۸۶۳ء میں جب غالب نے برہان قاطع کے رد میں قاطع برہان لکھی اور اس کی تردید میں غالب کے مخالفین نے بھی کئی رسالے اور نظمیں تصنیف کر کے چھپوائیں تو غالب کے شاگردوں اور طرفداروں نے ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا اور یہ بحث اس وقت کے اخباروں میں ایک مدت تک چلتی رہی، چنانچہ آغا احمد علی کے بعض شاگردوں کے رد میں غالب کے دو شاگردوں فلاں اور سخن نے ایک رسالہ "ہنگامۂ دل آشوب" کے نام سے لکھا جو ۱۸۶۷ء ۱۲۸۴ھ میں آرہ سے منشی سنت پرشاد کے مطبع میں چھپ کر شائع ہوا۔[1] اس رسالہ میں انہوں نے میر آغا علی صاحب شمس لکھنوی کے ایک مضمون کا ذکر کیا ہے جو غالب کے رد میں اودھ اخبار میں چھپا تھا اس مضمون کا جواب امیر نے لکھا جو اسی اخبار میں شائع ہوا اور ایک قطعہ اردو میں غالب کی حمایت میں لکھا تھا جو اس رسالے میں موجود ہے، چنانچہ امیر کا یہ قطعہ رسالۂ مذکور سے نقل کیا جاتا ہے۔[2]

قطعۂ من نتائج طبع دبیر بے نظیر منشی محمد امیر صاحب متخلص بہ امیر۔ رئیس لکھنؤ سلمہ اللہ تعالٰی وارتقاہ علی مدارج الاعلیٰ کہ از اودھ اخبار نقل نمودہ شد۔

بلا تعلی مضمون لکھے ہیں چند اشعار　　یہاں مبالغۂ شاعری نہیں درکار

---

[1] یہ رسالہ نایاب تھا اس لیے منشی عطا حسین صاحب نے اس کو ایک مختصر دیباچے کے ساتھ رسالۂ اردو (انجمن ترقی اردو) بابت ۱۹۳۷ء میں شائع کر دیا۔ اس طرح یہ رسالہ محفوظ ہو گیا ہے۔

[2] رسالۂ اردو جنوری ۱۹۳۷ء صفحہ ۸۱ — ۸۰۔

عجب وقائع حیرت فزائے عالم ہے
سنیں پسند کریں مالکِ اودھ اخبار ؎۱
ہوا ہے مستعدِ جنگ نظمِ بنگالی
ہوئی ہے غالب و مغلوب میں عجب پیکار
جواب ان کا لکھا پارسی قیامت کی
کہاں یہ سنگِ رخام و کہاں دُرِّ شہوار
یہ کھانے والے ہیں دن رات سکٹی مچھلی کے
عفونت ان کی زبان سے نہیں گئی زنہار
خرابی ان سے ہوئی اُردوئے معلی کی
چلم کو کہتے ہیں یہ کولکی خدا کی مار
سیاہ قلب کا مضموں سپر ہے سلہٹ کی
پناہ دے نہ اسے تیغِ حیدرِ کرّار
سپاہی زادہ کا اس نے جواب خوب لکھا
کہ میرا دادا تھا نادر کی فوج کا سالار
کسی کے جد کو بنائے جو کوئی اپنا جد
کبھی دروغ کو ہوتا نہیں فروغ اے یار
وہ اپنے جد کا بتائیں خطابِ سرداری
میانِ گنجفہ تھے کون نادری اسوار
بغیر نام و نشان کس طرح یقیں آوے
خلافِ محض یہ جدِّ جدید کا اظہار
بر ان کے اب جدِ فاسد کی بگڑی ہے ابجد
بنائیں وہ کوئی نام اس مقام پہ زردار

؎۱ منشی نولکشور۔

اسی طرح سے کلام ان کا سب ہے مصنوعی
دروغِ نظم سے کیوں کہ نہ ہو جہاں بیزار
رقم کیا ہے جو ہر جا کی جا پہ اب جا جا
یہ جا جا کون مرض کی دوا ہے اسے بیمار
صحیح فارسی میں ہم نے مانا ہے جا جا
فصاحت اس کی تکلم میں ہے بہت دشوار
زباں بریدہ بکنجے نشستہ ام صم و بکم
خموش رہنا ہے اون کے لئے بہ از گفتار
خدا گواہ کہ اب عافیت اسی میں ہے
ادیکھیں یہ چاہیئے اس بات کے ہوں شکر گزار
سنو بیان اسد اللہ خاں غالبؔ کا
زمانہ آن کے حسب اور نسب سے واقف کار
خطاب یافتہ ہیں وہ رئیس دہلی کے
زمیں سے تا بفلک حسنِ خانداں اظہار
وہ اپنے عصر کے خاقانی و نظیری ہیں
نظیر اون کا جہاں میں کہیں نہیں زنہار
سخن کی داد ملے زندہ ہو جو فردوسی
کلام اون کا وہ نامِ خدا ہے باغ و بہار
وہ نظم حضرت غالبؔ جہاں میں غالب ہے
انہیں کے قول پر آفاق کا ہے دار و مدار
اساتذہ میں یہاں ناسخِ جہاں منسوخ
انہیں سے طالبِ اصلاح شاعرانِ دیار

زمانہ ہم کو بھی کہتا ہے منصف الدولہ
فہیم شہر ہیں البتہ شاعری دشوار
لکھا ہے ہم نے بھی اک مختصر جہاں آشوب
کیئے ہیں اس میں قلمبند ہفت صد اشعار
جو سرگذشت کہیں کی نئی سنی لکھی
لکھا امیر نے یہ واقعہ بھی آخر کار

اس قطعہ کے عنوان میں امیر احمد کی بجائے "محمد امیر" لکھا ہے جو غالباً دبیر بے نظیر کے قافیہ کی رعایت درج ہوا ہے کیونکہ امیر تخلص کا کوئی دوسرا شاعر لکھنؤ میں مشہور نہیں ہوا۔ آخری شعر سے ایک خاص بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ امیر نے "جہاں آشوب" کے نام سے ایک نظم بھی لکھی تھی جو سات سو اشعار پر مشتمل تھی، لیکن امیر کی مطبوعہ تصانیف میں کہیں اس کا نام نہیں ملتا، نہ ان کے کسی سوانح نگار نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نظم کی اشاعت ہی نہ ہوئی ہو اور وہ ان کے مسودات میں رہ گئی ہو۔

اُردو ادب کے معمار

شبلی نعمانی

اُردو ادب کے معماروں میں مولانا شبلی ایک اہم درجہ رکھتے ہیں قصرِ اُردو کی تزئین و آرائش میں ان سے بڑھ کر کسی نے حصہ نہیں لیا۔ حُسنِ اتفاق سے ان میں کئی خوبیاں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں۔ وہ عربی علوم کے فاضل، ایک بالغ نظر مورخ، ایک بلند پایہ ادیب اور ایک نازک خیال شاعر تھے اور ان سب سے بڑھ کر وہ اُردو کے ایک زبردست اور صاحبِ طرز انشار پرداز تھے۔ ان کے قلم کی گل کاریوں نے اُردو ادب کو سراپا گلزار بنا دیا ہے۔ اور ان کی بہار آفریں سخن طرازیوں نے چمن اُردو میں رنگ برنگ کے پھول کھلائے ہیں جن کی خوشبو اُردو دانوں کے مشامِ جاں کو ہر وقت تازہ کرتی رہے گی۔

ہر قابل شخص کو احساسِ خودی کے باوجود دوسروں کی قابلیت کا معترف ہونا پڑتا ہے اور اپنی استعداد اور صلاحیتوں کو جانتے ہوئے بھی وہ دوسروں کا ثنا خواں رہتا ہے، اس کو چاہے نفسیاتی عیب سمجھا جائے یا اخلاقی خوبی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ مولوی شبلی اردو ادب کے معماروں میں سے، جہاں تک جدید اُردو ادب کا تعلق ہے، سرسید، آزاد، نذیر احمد اور حالی کے قائل تھے اور ان کو "عناصرِ اربعہ" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اور سب سے پہلے انہی نے یہ لقب ان کو بخشا تھا۔ لیکن ایک مدت کے

بعد دوسروں نے انہیں بھی اس زمرے میں شامل کر کے اس لقب کو عناصر خمسہ کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ شبلی سے پہلے اردو کے عناصر اربعہ سرسید، نذیر احمد، آزاد اور حالی اپنی اپنی طرزِ خاص کے موجد ہوئے جنہوں نے قصرِ اردو کی بنیادوں کو اٹھانے اور اس کو بلند کرنے میں بے انتہا کوششیں کیں اور اردو ادب کے معماروں میں بہت بلند مقام حاصل کیا۔ شبلی نے اپنے پیشروؤں کی طرح اپنی خاص طرز ایجاد کرنے کی بجائے سرسید اور حالی کی سادگی نذیر احمد کے روزمرہ اور آزاد کی شوخی کے امتزاج سے اور ہر عنصر کو اعتدال کے ساتھ کام میں لے کر ایک ایسی طرز انشار کو رواج دیا جو بیک وقت ادبی خیالات کے اظہار کے لئے موزوں تھی تو ساتھ ہی سنجیدہ اور علمی مضامین کو ادا کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی تھی۔ اپنے عزیز دوست کی انشاپردازی کی تعریف کرتے ہوئے شبلی نے جو فقرہ لکھا تھا کہ "آزاد اور نذیر احمد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کر لیا ہے" وہ بالکل ان پر صادق آتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انہوں نے اس زبان کو جو اُن کے پیش رو اور معصر انشار پرداز استعمال کرتے تھے اور جس کا تعلق دہلی یا لکھنؤ کے روزمرہ اور محاورات سے تھا جمع کر دیا اور دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کو ملا کر ایسا اسلوب رائج کیا کہ جو آج تک علمی و ادبی تحریروں کے لئے نہایت موزوں اور کارآمد ہے اور یہ بجائے خود ایک ایسا کارنامہ ہے جو اردو ادب پر شبلی کو ممتاز کرتا ہے۔

اگر بہترین موضوعات پر بلند پایہ علمی و ادبی تصانیف کسی کی فضیلت علمی اور کمال ادبی کا معیار ہو سکتی ہیں تو اس میں شبلی سے بڑھ کر اور کون خوش نصیب ہو سکتا ہے جس کے زورِ قلم سے ادب، شاعری، تنقید، فلسفہ و کلام سیر و تاریخ جیسے اہم مگر دشوار گزار موضوعات پر متعدد ضخیم مجلدات نکل چکے ہیں جن کو اردو کے ذخیرۂ ادبیات میں ایک گراں بہا اضافہ سمجھنا

چاہیئے دایسے دقیق اور تحقیقی موضوعات پر ان کی شگفتہ ادبی قلمکاریاں اور سُلجھا ہوا طرزِ بیان ادب اُردو کا ایک ایسا دلکش اعجاز ہے جو ایک مخالف سے بھی خراجِ ستائش حاصل کر کے رہتا ہے،

ہر مصنف کا ایک خاص موضوع بحث ہوتا ہے اور اس کو ایک خاص اسلوب نگارش اختیار کرنا پڑتا ہے. جو پیرایۂ بیان ادب اور شاعری کے لئے مخصوص ہوتا ہے وہ فلسفہ یا تاریخ میں کارآمد نہیں ہوتا، شاعرانہ اور ادیبانہ طرزِ انشا مذہبی یا کلامی مباحث کے لئے موزوں نہیں ہوتا، لیکن شبلی کے قلم کا یہ امتیازی وصف ہے کہ وہ اپنی جامعیت اور ہمہ گیری سے مناسبت کے ساتھ اپنی فصاحت و بلاغت کو برقرار رکھتا ہے، اور ہر جگہ اپنی موزونیت کی شان دکھاتا ہے جس قلم نے المامون اور الفاروق میں رموز مملکت داری کا انکشاف کیا اور آئینِ جہاں بانی کی تشریح کی، اسی نے سیرۃ النعمان اور سیرۃ النبیؐ میں تشریعی احکام اور فقہی مسائل کی بحث و تمحیص کے ساتھ ساتھ احادیث و روایات کی جرح و تعدیل کے فرائض بھی انجام دیئے جس قلم نے موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم میں ارتقائے شعری اور تنقید ادبی کی وضاحت اور موشگافیوں میں اپنا زورِ بیان صرف کیا۔ اسی نے الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم میں فلسفۂ تصوف اور علم الکلام کے ادق مسائل کو دلچسپ اور قابلِ فہم انداز میں پیش کیا۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو شبلی سے پہلے اور بعد میں بھی کسی کے ہاں نہیں پائی جاتیں،

شبلی کے مسلم الثبوت انشاپرداز ہونے کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور ان کا شدید سے شدید مخالف بھی یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ انہیں ان عناصرِ خمسہ یا معمارانِ ادب اُردو کی صف میں سے خارج کر سکے۔ ان کی شگفتہ تحریریں، سنجیدہ اور متین، مگر پُر زور اور پرکار اسلوب، عالمانہ طرزِ بیان اور نقادانہ شان اُردو ادب کی جان ہیں جنہوں نے اُردو نثر نگاری کو اپنے

اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔ ادب ہو یا تنقید، سیرۃ ہو یا تاریخ جس فن پر انہوں نے قلم اٹھایا، اس میں ایک مجتہدانہ شان پیدا کر دی۔ حتیٰ کہ اردو نظم میں بھی انہوں نے اپنے لئے ایک انوکھی راہ نکال لی۔ غالب کی گہرائی، سرسید کی ژرف نگاہی، نذیر احمد کی عربیت اور روزمرہ، اور آزاد کی رنگین بیانی کا اجتماع اگر دیکھنا چاہیں تو وہ شبلی کی تحریروں میں نظر آئے گا۔ اس مجتہد ادب کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ یقیناً اپنے پیش رؤں سے زیادہ وسیع ہمہ گیر اور مختلف موضوعات کا جامع ہے۔ ان کی یہی جامعیت جہاں ان کی علمی گہرائیوں کا پتہ دیتی ہے، وہاں ان کی خالص ادبیت کو بھی بخوبی اجاگر کرتی ہے۔ اور اسی "ادبیت" نے شبلی کو ادب اردو میں وہ بلند ترین مقام بخشا ہے جہاں تک پہنچنا ادبی کمال یا کمالِ ادب کی آخری معراج ہے۔

شبلی نے اپنی تصانیف کے لئے مختلف اور متعدد موضوع اختیار کئے۔ سیرت اور سوانح، فلسفہ و کلام، تاریخ، سفرنامہ، ادبیات، تنقید، مقالات مکاتیب، نظم، ہر ایک موضوع سے ایک خاص مضمون انتخاب کیا۔ انہوں نے ان موضوعات پر مجتہدانہ قلم اٹھایا اور جو کچھ لکھا اس میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ ساتھ زبان کی ادبیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی علمی و ادبی نکتہ سنجیوں کے پہلو بہ پہلو اُن کا زورِ کلام اور انداز بیان دلچسپ ہونے کے علاوہ ہر علمی مسئلہ کے نازک اور نادر پہلوؤں کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی تحریروں کا مدلل اور عقلی پیرایہ نہایت درجہ دلنشیں اور اطمینان بخش ہے اور وہ سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

مولانا شبلی کی زندگی میں اور بعد کو بھی ان کی تصانیف اور خیالات پر بہت کچھ لے دے ہوئی، اعتراضات کئے گئے اور تردید میں مضامین بھی لکھے گئے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کی تصنیفی قابلیت اور رتبۂ انشار پردازی سے کسی نے انکار نہیں کیا۔

علامہ شبلی کا طرزِ تحریر اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اعلیٰ علمی قابلیت کے ساتھ وہ صحیح مذاق اور لطیف طبیعت رکھتے تھے۔ وہ اپنی لطافتِ خیال، دقّتِ نظر، اور قوتِ استدلال سے اپنی تحریر میں ایک شان دلفریبی پیدا کر دیتے ہیں، جملوں کا دروبست، الفاظ کا انتخاب اور عبارت کا حسنِ تناسب ان کے طرزِ انشا میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں، ان کی ہر تحریر میں ان کا حُسنِ نظر اور ذوقِ سلیم نمایاں ہے۔ زبان کی پاکیزگی اور شگفتگی اس پر مستزاد ہے۔ اس کے متعلق سرسید جیسے اُردو ادب کے معمارِ اعظم نے المامون کے دیباچے میں لکھا ہے: "ایسی صاف شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلّی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔"

علامہ شبلی کو زبان اور محاورات کے امتیازات وخصوصیات کا اتنا پاس تھا کہ انھوں نے اپنی کسی تحریر میں کوئی عامیانہ اور سوقیانہ لفظ یا محاورہ نہیں استعمال کیا۔ وہ خود بھی اس پر شدت سے عمل پیرا تھے اور دوسروں کو بھی اس پر ٹوکتے رہتے تھے۔ مولوی ظفر علی خان صاحب کی کتاب "معرکۂ مذہب وسائنس" شائع ہوئی تو شبلی نے اس پر تبصرہ لکھا جو اس زمانہ میں پنجاب ریویو میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا نے زبان کی تعریف کرتے ہوئے دو سوقیانہ محاوروں "انگوٹھا دکھا کر" اور "اڑنگے پر چڑھا کر" کے متعلق لکھا تھا کہ یہ آئندہ ایڈیشن میں نکال دیئے جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُردو زبان میں علمی وقار اور برجستگی، صفائی اور شستگی قائم کرنے میں شبلی سے بڑھ کر کسی نے کوشش نہیں کی۔

شبلی کے زمانے تک یوں تو علم وادب کا معتد بہ ذخیرہ اُردو میں منتقل ہو چکا تھا، لیکن وہ یا تو ترجموں کی صورت میں تھا، یا پھر خشک علمی مباحث پر چند کتابوں، دینیات اور مناظرہ، سیر وسوانح پر بعض تصانیف

اور زیادہ تر شعر و نظم اور افسانوں پر مشتمل تھا۔ سنجیدہ ادب، تاریخ، تنقید فلسفہ و کلام وغیرہ موضوعات پر کتابیں موجود نہ تھیں۔ اردو ادب پر شبلی کا یہ زبردست احسان ہے کہ انہوں نے ان میں سے تقریباً ہر موضوع پر کتابیں لکھیں اور اس مجتہدانہ شان اور عالمانہ و محققانہ انداز میں لکھیں کہ اردو ادب کے ذخیرے میں ان سے بہتر کتابیں نہیں مل سکتیں اور یہ امر واقعہ ہے کہ شبلی جو کچھ لکھ گئے ہیں ان پر اب تک کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں ہو سکا اور باوجودیکہ ان کی بعض تصانیف کی اشاعت کو ۵۰ سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے لیکن اب تک اس پائے کی کوئی تصنیف نظر نہیں آتی۔ خصوصاً ان کی تصانیف میں الکلام، موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم اپنا جواب نہیں رکھتیں بلکہ اپنی بلند ادبیت اور اعلیٰ تنقید کے اعتبار سے دنیا کی بہترین علمی و ادبی تصانیف میں شمار ہونے کے لائق ہیں ان کے علاوہ مختلف علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی، سوانحی، موضوعات پر شبلی کے محققانہ مضامین اور مقالات کی آٹھ جلدیں اردو ادب کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہیں۔

شبلی کے طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کے سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ وہ غالب کے اندازِ تحریر سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ خصوصاً یہ طرزِ تحریر ان کے مکاتیب میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ مکاتیب شبلی کی دو ضخیم جلدیں اور خطوط شبلی اس امر کے شاہدِ عادل ہیں۔ اسی بنا پر اردو کے ایک بلند پایہ انشاپرداز مہدی حسن اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شبلی کی "اردوئے خاصہ" کو اپنے خاص انداز بیان میں اس طرح خراج تحسین پیش کرتے ہیں:۔

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوئے خاصہ" کی داد ملتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج

اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے"۔

نثر کی طرح نظم میں بھی مولانا نے اپنی امتیازی شان قائم رکھی ہے اور اس میں نئی طرزِ نکالی ہے۔ ابتدا میں اگرچہ انہوں نے پامال کوچۂ غزل اختیار کیا تھا لیکن بہت جلد اس کو ترک کر دیا۔ نظموں میں مولانا حالی کا رنگ جم چکا تھا۔ اور ان کے مسدس نے تمام دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ اس لئے مولانا صرف ایک "قومی مسدس" اور ایک مثنوی "صبح اُمید" لکھ کر رہ گئے اگرچہ اس کے بعد بھی انہوں نے بعض قومی نظمیں اور اشعار کہے ہیں لیکن ان کی شاعری کا دور صحیح معنوں میں اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ انہوں نے "کشافیات" کے نام سے سیاسی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ یہ نظمیں اکثر رسائل و اخبارات خصوصاً "الہلال" میں شائع ہوتی اور ملک سے خراج تحسین وصول کرتی رہیں۔ اس رنگ میں لکھنے والے شبلی پہلے شخص ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ اسلام کے بعض واقعات پر نظمیں لکھیں جو نہایت دلچسپی سے پڑھی گئیں۔ سیاسی رنگ میں ان کے مطائباتِ نظم خاص چیز ہیں۔ بعض سیاسی نظموں کا لہجہ اس قدر تیز و تند تھا کہ وہ قابلِ ضبطی سمجھی گئیں۔ "عدل جہانگیری" کے عنوان سے انہوں نے جو نظم لکھی ہے وہ بہت مقبول ہوئی۔ اور ہندوستان کی کئی زبانوں میں اس کا نظم و نثر میں ترجمہ کیا گیا۔ غرضیکہ اُردو شاعری میں بھی انہوں نے اپنے لئے ایک نئی شاہراہ نکالی اور اس خاص صنفِ سخن میں ان کے کمال کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اُردو اشعار کو ترنم سے پڑھنے کا طریقہ سب سے پہلے مولانا شبلی نے نکالا جس کی آج تک تقلید ہو رہی ہے۔

آخری کارنامہ آخر میں ہم مولانا شبلی کی اس قابل یادگار دینی، علمی و ادبی خدمت کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے جس پر ان کا خاتمہ بالخیر ہو گیا، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبرؐ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سیرۃ پاک پر یوں تو اردو میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سر سید کی خطبات احمدیہ اور مولوی سلیمان صاحب منصور پوری کی رحمۃ اللعالمین خاص اہمیت رکھتی ہیں لیکن شبلی اس کام کو بہت وسیع پیمانے پر انجام دینا چاہتے تھے جس کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے۔ تاہم سیرۃ کی یہ دو نامکمل جلدیں بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے نیز زبان اور طرز انشا کے اعتبار سے اردو ادب کے ذخیرہ میں نہایت گرانقدر تحقیق و تنقید سے قطع نظر جس والہانہ عقیدت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کا اندازہ اس عبارت سے ہوتا ہے جو ”ظہور قدسی“ کے عنوان سے ولادت باسعادت کے بیان میں پائی جاتی ہے اور جو شبلی کی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔

”چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجز طرازیِ موسیٰ جاں نوازیِ مسیح سب اسی لئے تھے کہ یہ متاعہائے گراں ارزِ شہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے۔ آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں

وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسرےٰ نہیں، بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے آتش فارس نہیں، بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذرکدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آ گئی آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔ یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ شاہِ حرم، حکمرانِ عرب فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحَابِہٖ وَسَلِّمْ ؕ

علّامہ شبلی کا سفرنامہ

عہدِ اسلام میں تیسری صدی ہی سے آٹھویں صدی تک جو علوم و فنون کی نشو و نما اور ترقی کا بہترین زمانہ تھا۔ کئی مسلمان سیّاح گزرے ہیں جنہوں نے اپنے سفرنامے مرتّب کر کے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان میں سلیمان تاجر، بزرگ ابنِ شہریار مسعودی، مقدّسی، ابن حوقل اصطخری، ابن جبیر، ادریسی اور ابنِ بطوطہ کے سفرنامے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان سیّاحوں کے سفرناموں نے نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ تاریخِ عالم میں نہایت دلچسپ اور بیش بہا معلومات کا اضافہ کیا ہے اور اس اعتبار سے وہ محققین اور ماہرین آثارِ قدیمہ کے لئے ایک "خرمنِ زرّیں" کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسے زمانے میں جبکہ آمد و رفت اور حمل و نقل کے ذرائع نہایت محدود تھے، حیرت ہوتی ہے کہ مسلمان سیّاح بلادِ مغرب اور افریقہ، ہندوستان اور چین جیسے دُور اُفتادہ ملکوں تک پہنچ گئے تھے، چنانچہ انہوں نے وہاں کے تاریخی، جغرافیائی، معاشرتی مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور علمی و ادبی حالات کا مطالعہ کر کے اپنی بیش قیمت معلومات کو اپنے سفرناموں میں درج کیا ہے اور آج ان ممالک کے حالات کی تحقیق کرتے وقت محققین ان سیّاحوں کے بیانات سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ مسلمانوں کے جذبۂ سیر و سیاحت نے تاریخی، اثری اور علمی معلومات کو جمع اور آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر کے نہایت مفید خدمت انجام دی ہے، لیکن اسلامی حکومت کے انحطاط اور مسلمانوں کے قومی زوال کے

بعد مسلمانوں میں سے یہ جذبہ سیر و سیاحت تقریباً مفقود ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں بکثرت مسلمان علماء اور صوفیاء بحیثیت سیّاح وارد ہوئے اور اکثر ان میں سے یہیں رہ پڑے، ان کا مقصد اس سیر و سیاحت سے اگر ایک طرف ارشادِ قرآنی پر عمل پیرا ہونا تھا تو دوسری طرف تبلیغ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا مقدس فرض ادا کرنا بھی تھا لیکن سالہا سال سے مسلمانوں میں سے سیر و سیاحت کا شوق ناپید ہو گیا ہے اور اگر ہے تو اس موجودہ زمانے میں صرف انگلستان، فرانس اور امریکہ کی تفریحی سیاحتوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جس نے ان کے قومی و مذہبی خصائص کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

ہمارے زمانے میں بعض اہل علم نے اپنی سیاحتوں کے حالات قلم بند کئے ہیں چنانچہ اردو زبان میں بھی چند سفرنامے لکھے گئے ہیں جن میں زیادہ تر سفرِ حجاز و حرمین شریفین اور بعض ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں وہ سفرنامے خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو علمی یا اسلامی نقطۂ خیال سے لکھے گئے ہیں، لیکن ایسے سفرنامے دو تین سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان سفرناموں میں علّامہ شبلی مرحوم کا "سفرنامۂ روم و مصر و شام" بہت مشہور اور اہم ہے۔ (جس پر ہم یہاں تبصرہ کرنا چاہتے ہیں)

علّامہ شبلی نے اسلامی ممالک خصوصاً قسطنطنیہ، مصر اور بیروت کا ایک مختصر سفر ۱۸۹۲ء میں کیا تھا۔ اور وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے اپنی سیاحت کے حالات قلم بند کئے تھے جو مدت ہوئی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سفرنامہ اردو کی ادبیات میں علمی و ادبی حیثیت سے بہت مقبول اور مشہور رہے، اور اگرچہ ان کی اس سیاحت کو آج تقریباً ساٹھ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اس مدت میں بکثرت انقلابات رونما ہو چکے ہیں اور حالات واقعات میں بھی بہت بڑا تغیر و تبدل ہو گیا ہے، پھر بھی وہ آج

اتنا ہی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے جتنا کہ اب سے ساٹھ سال پہلے تھا۔

علامہ مرحوم نے یہ سفر خالص علمی مقصد سے اختیار کیا تھا۔ یہ ان کا دوسرا طویل سفر تھا۔ پہلا سفر حج کعبۃ اللہ کے لئے ۱۸۷۶ء میں کیا تھا۔ جبکہ ان کی عمر صرف ۱۹ برس کی تھی۔ یہ دوسرا علمی سفر ۱۸۹۲ء میں پیش آیا۔ چنانچہ اپنے ایک قصیدہ میں، جو انہوں نے اثنائے سفر میں جہاز پر لکھنا شروع کیا تھا، فرماتے ہیں کہ :-

بہر تکمیل فن و ہم پئے تحصیل عبر
روزگاریست کہ میداشتم آہنگ سفر
فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدا
خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر

مولانا کا یہ سفر بقول ان کے "طالب علمانہ" تھا۔ ایک مدت سے انہیں علمی تصانیف کے سلسلہ میں بعض ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے استنبول اور مصر کے سفر کا خیال تھا اور آخر ان کا یہ عزم مستقل ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں جبکہ وہ الفاروق لکھ رہے تھے۔ اس ارادے نے عملی صورت اختیار کر لی جس اتفاق سے اسی سال مسٹر آرنلڈ جو مدرستہ العلوم علیگڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر اور جن کو فرنچ زبان سکھانے کی وجہ سے شبلی اپنا اُستاد کہتے تھے، ولایت جانے کی تیاری کر رہے تھے شبلی نے ان کی صحبت اور رفاقت کو غنیمت جانا، ادھر کالج میں گرمیوں کی تعطیل ہو رہی تھی جو معمولاً تین مہینے کی ہوا کرتی تھی۔ ان پر انہیں تین مہینے کی مزید رخصت مل گئی، چنانچہ ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کو وہ علی گڑھ سے چل کھڑے ہوئے جیسا کہ اپنے اسی قصیدہ میں فرماتے ہیں :-

آرنلڈ آنکہ رفیق است وہم اُستاد مرا
ہم دریں عرصہ بانگلینڈ ہمی خواست سفر

گفتم این صحبت وایں واقعہ نادر افتد
پس بعزم سفر از جائے بجستم مضطر

اس طویل سفر سے مولانا کے اعزّہ اور احباب سب ناخوش تھے اور انہیں سمجھا رہے تھے، لیکن انہوں نے اپنے عزم مصمّم کو قوت سے فعل میں لاکر چھوڑا اور سے

ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم

کہہ کر وہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ چھ مہینے کے بعد جب سفر سے واپسی ہوئی تو ان کا ارادہ اپنے حالات سفر مرتّب کرنے کا نہیں تھا، اور نہ وہ اس سفر کی کوئی اہمیت سمجھتے تھے۔ لیکن دوستوں اور بزرگوں کے تقاضے سے انہوں نے اپنا سفرنامہ قلم بند کیا۔ ان کے نزدیک "اس عاجلانہ اور معمولی سفر کے حالات قلمبند کرنے اور ان کو سفرنامہ یا کتاب الرحلۃ کا لقب دینا ننگ ظرفی سے خالی نہ تھا" لیکن اس خیال سے کہ "ایک مدّت سے ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اِطّلاع حاصل نہیں ہوتی" انہوں نے اپنے دوستوں اور بزرگوں کے اس تقاضے کو پورا کیا، اگرچہ وہ اس پر "سفرنامہ" کا اطلاق صحیح نہیں سمجھتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

"جو شخص سفرنامہ کو سفرنامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اُٹھا سکتا، البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات سے بھی مزہ آتا ہے، ان کی دعوت میں یہ ماحضر پیش کیا جا سکتا ہے کہ مالا یدرک کلّہ لا یُترک کلّہ"

بہرحال شبلی کا یہ سفرنامہ ان جزئی دلچسپ واقعات کے لحاظ سے جو سلسلۂ بیان میں آ گئے ہیں، نیز قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس، قاہرہ

وغیرہ کے عام اجمالی حالات، قابل دید مقامات، مدارس اور دارالعلوم تعلیم نسواں، مصنّفین اور ان کی تصانیف، کتب خانے، مطابع، اخبارات و رسائل، مشاہیر اہل علم و فضل اور ارباب کمال کی ملاقاتیں، ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات اور ان کی مہمان نوازی وغیرہ وغیرہ کی تفصیل کے علاوہ بہت سی علمی، ادبی اور تاریخی معلومات کی بنا پر قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

شبلی نے اپنے سفر کا اجمالی حال اپنے ۷۲ شعر کے ایک قصیدے میں بیان کیا ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ یہ قصیدہ جس کو منظوم سفرنامہ کہنا چاہیئے اپنی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ حالات سفر کے جامع اور مختصر بیان کے اعتبار سے بھی نہایت دلچسپ اور پرلطف ہے۔

عموماً یورپین سیّاحوں کے سفرناموں میں جو غلط سلط اور مبالغہ آمیز بیانات پائے جاتے ہیں ان سے یہ سفرنامہ بالکل مختلف ہے، چنانچہ اس قسم کے سیّاحوں کے بیانات سے اپنے سفرنامہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بقول ان کے "سفرنامہ" اگرچہ تاریخی سلسلہ کا ایک دلچسپ حصّہ ہے اسی قدر غلطیوں کے احتمالات سے مملو ہے۔ شبلی لکھتے ہیں:

> "یورپ کا ایک عام سیّاح اتفاق سے ہندوستان میں آنکلتا ہے تو صرف ہفتہ دو ہفتہ کے تجربہ کی بنا پر یورپ کے اخباروں اور میگزینوں میں اس دعوے کے ساتھ بڑے بڑے آرٹیکل شائع کرتا ہے کہ گویا ہندوستان کی معاشرت و تمدّن کے تمام راز اس پر کھل گئے ہیں"

اس لحاظ سے شبلی کا یہ دعویٰ کہ "یورپ کی تحریروں اور سفرناموں سے میرے سفرنامہ کا مختلف ہونا لازمی بات تھی" کسی طرح مبالغہ آمیز نہیں کہا جا سکتا۔

شبلی ایک بلند پایہ عالم، مورخ اور ادیب تھے، چنانچہ وہ جہاں جہاں

گئے ہیں انہوں نے واقعات و حالات کو اپنے معیار تحقیق سے جانچا ہے اور ان کی تفصیل میں دقّت نظر سے کام لیا ہے۔ اسلامی ممالک کی علمی و ادبی تحریکات، تعلیم و تعلم کے طریقوں، کتب خانوں اور اخبارات و مطابع پر خصوصیت کے ساتھ غائر اور تفصیلی نظر ڈالی ہے، اسلامی آثار اور رسوم کا نہایت ذوق و شوق سے ذکر کیا ہے اور حال کو ماضی کے لباس میں پیش کیا ہے۔

ہر شہر کی آب و ہوا، پیداوار، میوہ جات، رسم و رواج معاشرت لباس اور پوشاک اور عادات و اطوار کا تذکرہ کیا ہے۔ ہوٹلوں، قہوہ خانوں، خانقاہوں اور عام مجمعوں حتیٰ کہ تھیٹروں تک کا ذکر نہیں چھوڑا قہوہ خانوں کے متعلق لکھتے ہیں "قہوہ خانے ان تمام ممالک میں ضروریات زندگی میں محسوب ہیں، میرے عرب احباب جب مجھ سے سنتے تھے کہ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں تو تعجب سے کہتے تھے۔ بایّش یتسلّون؟ یعنی وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں ۹ استنبول میں "مقر کوئی" کے قہوہ خانے میں جو سمندر کے کنارے ہے مولانا نے یہودی عورتوں کا گانا بھی سنا اور چونکہ انہوں نے اس سے پہلے عربی راگ نہیں سنا تھا، ان پر ایک خاص اثر ہوا۔

قسطنطنیہ میں مولانا کا قیام تقریباً تین مہینے رہا۔ اس اثنار میں مولانا کو وہاں کے حالات کا بغور اور تفصیل سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ چونکہ علامہ شبلی کو مسلمانوں کی تعلیم سے خاص شغف تھا تفصیل سے ذکر کیا ہے بلکہ ان مدارس کی ایک فہرست بھی دی ہے اور ان کے مختصر حالات بھی بیان کئے ہیں۔ قدیم تعلیم اور مدارس قدیمہ پر انہوں نے اپنے سفرنامے کے تیس صفحے وقف کئے ہیں اس کے علاوہ ترکوں کی علمی حالت اور ترکی زبان میں عربی کی تاریخی کتابوں کے تراجم اور تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ترکی زبان کی ایک

انسائیکلو پیڈیا کا ذکر کیا ہے جو قاموس الاعلام کے نام سے اس وقت زیر تصنیف تھی۔ ترکی زبان میں جو سرمایہ ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ:-

"اپنے مذاق کے موافق تاریخ و رجال کی کتابیں دیکھیں جس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ عربی کے بعد ایشیا کی کسی زبان میں اس قدر تاریخی سرمایہ موجود نہیں ہے۔

بلکہ اس میں وہ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ:

"ایک لحاظ سے اس کو عربی پر ترجیح حاصل ہے۔ عربی زبان میں جس قدر تاریخیں ہیں بخلاف اس کے ترکی تاریخیں ان اصول و قواعد کے موافق لکھی جاتی ہیں جو فلسفۂ تاریخی کے اصول ہیں اور جس کی بنا پر یورپ نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے۔"

ترکی ادب کے متعلق مولانا نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"وہ بہت سی خصوصیتوں میں ہماری اُردو کے مشابہ ہے ترکی کا قدیم لٹریچر قدیم اُردو کے انداز پر رنگین اور پُرتکلف استعارات سے مملو اور قوافی کا پابند تھا، لیکن اب نئی اُردو کی طرح سادگی، صفائی اور برجستگی کا لحاظ کیا جاتا ہے۔"

لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اُردو کا قدیم طرز تمام تر عربی طرز انشا سے متاثر تھا اور فارسی کی طرح ترکی زبان پر بھی عربی زبان و ادب کا کافی اثر پڑ چکا ہے بعد کو انگریزی اور یورپین اثرات نے یہ طرز پیدا کر دیا ہے جس کو "سادگی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ترکی اخبارات اور مطابع کی حالت پر شبلی کا تبصرہ پُر از معلومات اور دلچسپ ہے اس طرح قسطنطنیہ کے کتب خانوں پر شبلی نے گویا ایک عمدہ مقالہ لکھ دیا ہے۔ اس میں سے تیس کتب خانوں کے نام دیئے ہیں۔ ان کتب خانوں کے نظم و نسق پر نظر ڈالی ہے، ان کی خصوصیات دکھائی ہیں اور

ان میں تاریخ و ادب عربی کی نایاب اور غیر مطبوعہ کتابوں کے نام گنوائے ہیں، جن میں سے اکثر اس زمانے میں اور بعد کو یورپ اور ممالک اسلامیہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتب خانوں کے اکثر بند رہنے اور ان قلمی ذخیروں سے اہل علم کے مستفید نہ ہونے کا بھی افسوس کیا ہے اور اعلیٰ مذاق کی کمی کا رونا رویا ہے۔ ان کتب خانوں کی اجمالی کیفیت بیان کرتے ہوئے شبلی نے تاریخ اور ادب کی بعض نادر کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے عاشر آفندی کے کتب خانے میں فن ادب کی ایک ایسی کتاب دیکھی جس میں مضامین شعری کی تاریخ ہے۔ یعنی فلاں مضمون اوّل فلاں شاعر نے لکھا۔ پھر رفتہ رفتہ فلاں شاعر نے یہ یہ اضافہ کیا یا اس اس طرح اس کی صورتیں بدلیں۔ اس کتاب کے مصنّف نے دعویٰ کیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین عرب جاہلیت نے ایجاد کیے، پھر متاخرین نے ان کو ترقی دی اور نئے نئے پیرائے نکالے، تمام کتاب اسی دعوے کے ثبوت میں ہے۔ مصنّف ہر مضمون کے لئے عرب جاہلیت کا ایک شعر نقل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اسلامی شعرا میں فلاں شاعر نے اسی مضمون کو ذرا بدل کر اس طرح لکھا پھر دولت بنو امیہ اور عباسیہ کے شعرائے اسی سے اور صورتیں پیدا کیں۔" اس تعارف کے بعد لکھتے ہیں کہ " مصنّف کی وسعت نظر اور دقیقہ سنجی پر حیرت ہوتی ہے اور ساتھ ہی افسوس ہوتا ہے کہ متاخرین اس قسم کی نادر تصنیف کی پیروی نہ کرسکے کہ آج اس مضمون پر متعدد کتابیں ملتیں"

انہوں نے اس بات پر بھی افسوس ظاہر کیا ہے کہ ان کتب خانوں کے قلمی نوادر جو قابل اشاعت ہیں ان کو کوئی نہیں چھاپتا بلکہ ان کی نقلیں یورپ بھیجی جا رہی ہیں۔

شبلی نے قسطنطنیہ کی متعدد خانقاہوں زاویوں یا تکیوں کی سیر کی تھی چنانچہ ان کے حالات بھی لکھے ہیں اور ان سے قومی زندگی کو جو نقصان

پہنچا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میں نے اکثر خانقاہوں میں خود جا کر دیکھا کئی کئی برس کے آئے ہوئے مسافر پڑے ہیں، نہ کسی قسم کا شغل ہے نہ کچھ کام ہے۔ لکھنؤ کے احدیوں کا جو حال سنا کرتے تھے یہاں آنکھوں سے نظر آتا ہے" موجودہ ترکی حکومت نے ان خانقاہوں اور تکیوں کا خاتمہ کر دیا ہے جو بد دیانتی، مفت خوری اور مکاری کے اڈے بنے ہوئے تھے اور قوم کے لاکھوں روپے برباد کر رہے تھے۔

قسطنطنیہ کی مساجد اور معابد کے علاوہ مولانا نے وہاں کے عجائب خانوں کی بھی سیر کی چنانچہ ایک عیسائی سوداگر کے عجائب خانے میں بعض ایسے مجسمے دیکھے جن میں اسپین کی مسلمان عورتوں پر طرح طرح کے مظالم کا دردناک نقشہ دکھایا گیا ہے جن کو وہاں کے عیسائی تبدیل مذہب کی خاطر طرح طرح کے عذاب دے رہے تھے شبلی کو یہ "درد انگیز تماشا" پسند نہیں آیا چنانچہ فرماتے ہیں: "میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ دنیا کی مختلف قوموں میں جو ناگوار واقعات کسی زمانے میں پیش آئے وہ دوبارہ منظر عام پر لائے جائیں"

راستوں، سڑکوں، مکانات اور عمارات کے علاوہ شبلی نے قسطنطنیہ کے اسلامی تہواروں، عید الاضحیٰ اور محرم کا بھی ذکر کیا ہے۔ محرم میں عجمی اہل تشیع کی "دھوم دھام کی مجلسوں اور نوحہ و بکا کے ہنگامے اور مجالس عزا میں ترکوں کی ادب و خلوص سے شرکت خصوصاً اس حالت میں کہ ترک تمام سُنی العقیدہ ہیں۔ اور وہاں ترکوں کی حکومت ہے ان رسوم کا جاری رہنا ان کی مذہبی رواداری کا ثبوت ہے معلوم نہیں یہ سلسلہ ترکیہ جدید میں جاری ہے یا موقوف ہو گیا۔

قسطنطنیہ کی عید جس شان و شوکت سے منائی جاتی تھی اس کو دیکھ کر شبلی بہت متاثر ہوئے ہیں خصوصاً سلطان کی سواری اور سلامتی کی رسم کو

دیکھ کر جس میں سلطان پایۂ تخت کی افواج کا جائزہ لیتے تھے، شبلی پر بڑا اثر ہوا چنانچہ اپنی قیام گاہ پر آکر انہوں نے اپنے تاثرات کو ایک فارسی مثنوی کی صورت میں ظاہر کیا ہے جو ۶۳ اشعار پر مشتمل ہے۔

ترکوں کے اخلاق وعادات اور طرز معاشرت، ان کی مہمان نوازی طریقۂ ملاقات اور عورتوں کی آزادی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے بلکہ بعض خواتین سے اپنی ملاقات کا حال بھی بیان کیا ہے۔

شیر پلونہ غازی عثمان پاشا سے اپنی ملاقات، ان کی درخواست پر سلطان کی طرف سے تمغۂ مجیدی عطا ہونے اور اس کی مبارکباد میں احباب کا ایک مختصر جلسۂ دعوت ترتیب دینے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے ساتھ تمغہ مجیدی کی تصویر بھی دی ہے۔ اور سلطان کے فرمان بخط فارسی کی نقل اور اس کا ترجمہ بھی نقل کیا ہے۔ قسطنطنیہ میں پورے تین مہینے قیام کرنے کے بعد شبلی بیروت گئے ہیں جہاں صرف ہفتہ عشرہ قیام کیا ہے۔ سفر بیروت کے سلسلہ میں وہاں کے مدارس، کالج اور یونیورسٹی کے حالات لکھے ہیں۔ اہل علم سے ملاقات کی ہے ان کی علمی تصانیف اور اخبارات و رسائل کی تفصیل دی ہے۔ بیروت کے ایک عربی اخبار البشیر نے شبلی کی بیروت میں تشریف آوری پر ایک نوٹ لکھا تھا اس کو بھی نقل کر دیا ہے پھر وہاں سے بیت المقدس گئے ہیں جہاں انہوں نے مسجد اقصیٰ کی زیارت اور تمامہ کے تذکرہ کے علاوہ علماء و فضلا کی ملاقات اور ان کی علمی صحبتوں سے مستفید ہونا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد وہ قاہرہ پہنچے ہیں "مصر میں تعلیم کی حالت" کو خاص طور سے بیان کیا ہے اور قدیم تعلیم اور جامع ازہر کی کیفیت درج کی ہے۔ کتب خانہ خدیویہ میں عربی کے نادر مخطوطات کا ذکر بھی کیا ہے۔ مصر کی قدیم یادگاروں اور قابل دید مقامات کی سیر کی ہے۔ مطابع و اخبارات کا مختصر حال لکھا ہے۔ کتابوں کی ارزانی کا ذکر کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ "میں نے بہت سی کتابیں خریدیں جو نولکشوری مطبوعات سے بھی کم قیمت تھیں" مصر کے تھیٹر، کلب اور انجمنوں کا معائنہ کرتے ہوئے ایک عیسائی کمپنی کے تھیٹر کی سیر بھی کی اور تماشا بھی جس کا پلاٹ انہوں نے بیان کیا ہے لیکن آخر میں اس کے متعلق اپنی یہ رائے بھی لکھ دی ہے کہ "تھیٹر ہندوستان کا ہو خواہ عرب اور مصر کا میرے نزدیک اس کی شرکت وقار و شائستگی کے خلاف ہے لیکن اسلامی سلطنت کی ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مصر کے اہلِ کمال اور ان کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے جن میں علی پاشا، مبارک، ابراہیم، امین بک فکری، احمد ذکی پاشا، شیخ محمد عبدہ اور شیخ حمزہ فتح اللہ کا مختصر تعارف ان سے ملاقات اور ان کے تبحرِ علمی اور تصانیف کا حال بیان کیا ہے۔

سفر کے اختتام پر عربوں کے فیاضانہ اخلاق کا ذکر کیا ہے آخر میں حال کی عربی زبان پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے جس میں مصریوں کے لفظ اور زبان کے تغیر و تبدّل کا ذکر کر کے ان جدید عربی الفاظ کی فہرست بترتیب حروف تہجی دی ہے جن کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔

فی الجملہ یہ سفرنامہ جو ڈھائی سو صفحوں میں تمام ہوا ہے علمی، تاریخی، جغرافی تعلیمی اور معاشرتی حیثیت سے اردو کے دوسرے سفرناموں کے مقابلہ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ان کی ادبی حیثیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ شبلی کی تراوشِ قلم ہے جن کا طرزِ انشا اردو ادب میں ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے اور جب تک اردو زبان باقی ہے ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

علامہ شبلی، بحیثیت شاعر

تمہید علاّمہ شبلی مرحوم جہاں ایک بلند پایہ مورّخ ایک جیّد ماہر فلسفہ و کلام ایک فاضل انشا پرداز، ایک زبردست عالم دینیات تھے وہاں وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ ان کا مذاق سخن بہت اعلےٰ پاکیزہ اور بلند تھا۔ سخن فہمی اور سخن سنجی کی دولت ان کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ وہ فارسی اور اردو کے ایک ایسے زبردست شاعر تھے جن کی نظیر ہندوستان میں ملنی دشوار ہے۔ علاّمہ مرحوم کو وفات پائے بیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ اس اثنا میں ان کی تعزیت کے سلسلے میں چند مختصر مضامین قدرشناس مہدی مرحوم کے چند مقالات اور "عناصر خمسہ" کی انشا پردازی پر انعامی مقابلے کے مقالات میں ضمنی تنقیدات کے سوا ایسی جامع کمالات ہستی کے کم و بیش نصف صدی کے علمی کارناموں پر اب تک مفصل طور پر کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

ہم اس مضمون میں علامہ شبلی کو بحیثیت شاعر دکھانا چاہتے ہیں اور چونکہ وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے بے مثل شاعر تھے اس لئے ہم اس کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کی اُردو شاعری کے متعلق یہ پہلی قسط ہے، جس کو ہم قدرشناسانِ شبلی کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

شاعری کی ابتدا اور اسباب علامہ شبلی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور پرورش پائی وہ تمام تر علمی اور ادبی تھا۔ اس فضا میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور اسی میں ان کا ادبی شوق اور مذاقِ سخن پروان چڑھا، لائق اساتذہ کا فیض صحبت نصیب ہوا جسکی بدولت ان کی ادبی اور شعری استعداد کے جوہر کھلے اور رفتہ رفتہ مذاقِ سخن نے ان کی طبیعت میں گھر کر لیا۔ اگر استادی اور شاگردی کے متعارف اور مصطلح معنی نہ لئے جائیں تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مولانا نے کسی شاعر کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ اگرچہ اس فن میں انہوں نے اپنے بعض اساتذہ سے استفادہ ضرور کیا تھا مولانا فیض الحسن سہارنپوری ہندوستان میں عربی فن ادب کے امام اور اپنے زمانہ کے ابوتمام اور اصمعی سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے عربی گو شعراء میں قاضی عبدالمقتدر شریحی کے بعد یہ دوسرے بزرگ ہیں جو عربی ادب اور شاعری کے علاوہ فارسی شعر و ادب میں ید طولے رکھتے تھے چنانچہ خود مولانا ان کے مرثیہ میں فرماتے ہیں۔

"نگویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید
عرب را زندہ کردن و آنگہ از ہندوستاں بودن
بہ ہنجار دری بر جادۂ پیشینیاں رفتن
باہنگ حجازی یادگارِ پاستان بودن"

اسی طرح مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اپنے زمانہ کے مسلّم الثبوت علامہ تھے اور ان بزرگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے اسلامی عہد زوال کے بعد اسلامی علوم و فنون کو زندہ رکھا۔ ان دونوں جلیل القدر اور سلف کے نام لیوا بزرگوں کے فیض صحبت نے مولانا کے ذوق شعری کو جو بالکل فطری اور وہبی تھا اچھی طرح ابھار دیا۔ خود مولانا کا بیان ہے کہ فارسی کا مذاق بھی انہیں کا فیض ہے۔ اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے

ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے[1]۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا شاعری میں خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی[2] کے شاگرد تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اڈیٹر الناظر نے اپنے رسالہ میں اس کا ذکر کیا تھا۔ جس کی بنا پر مولانا نے اپنے ایک خط مکتوبہ ۳ اگست سنہ ۱۹۰۹ء میں ان کو تحریر فرماتے ہیں :

"آپ نے اپنے پرچہ میں لکھا ہے کہ میں خواجہ عزیزالدین صاحب کا شاگرد ہوں۔ خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں۔ میں نہ شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے۔ یہ جو کبھی کبھی موزوں کر لیتا ہوں یہ شاعری نہیں تفریح طبع ہے"۔[3]

غرضیکہ علامہ شبلی جب تک گھر پر رہے ہیں علمی مطالعہ کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کی مشق بھی کرتے رہے۔ ابتدا میں ملک کے عام رواج کے مطابق غزلیں لکھ کر مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطوط میں ان مشاعروں کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے جو غزلیں اردو میں لکھیں ان میں سے بعض نقل کی ہیں[4]۔ مولانا کے قیام اعظم گڑھ کے زمانہ میں لکھنؤ اور دیگر اطراف کے بعض معززین وہاں مقیم تھے۔ ان میں مشاعرے ہوتے تھے، طرحیں دی جاتی تھیں، مولانا میر مشاعرہ بنتے تھے[5]۔ اس زمانہ کی بعض غزلیں اور اشعار ان کے مکاتیب میں ملتے ہیں۔ اس زمانہ میں لکھنؤ پنچ اودھ پنچ اور پیام یار

---

[1] الندوہ بابت اکتوبر ۱۹۰۹ء، [2] مصنف قیصر نامہ سابق پروفیسر فارسی کننگ کالج لکھنؤ فارسی کے مشہور استاد تھے۔ مولانا کو ان کی خدمت میں عزیزانہ نیاز حاصل تھا، فارسی مذاق کی یک جہتی دونوں میں رشتہ اتحاد تھا۔ اکثر مولانا ان کے یہاں جایا کرتے تھے کبھی کبھی انہیں کے گھر پر قیام فرماتے (مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۱۴۱ ۳ کا نوٹ)، [3] مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۳۴۱۔

[4] مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۶ ـ ۶۱ ـ ۶۰،

[5] سیر المصنفین جلد ۲ ص ۴۰۸ ـ ۴۰۷۔

کا دور دورہ تھا، جن میں ملک کے نامی گرامی اُدبا اور شعراء کے مضامین اور کلام شائع ہوتے تھے۔ مولانا ان کے نمبر شوق سے پڑھتے تھے۔ بلکہ اودھ پنچ کی بعض طویل نظمیں آخر عمر تک یاد تھیں۔[1]

۱۸۸۲ء میں جبکہ مولانا اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم کے سلسلے میں علیگڑھ تشریف لے گئے اور سرسید سے ملاقات ہوئی تو ان کی مردم شناس نگاہ نے مولانا کو اپنے کالج کی فارسی اور عربی پروفیسری کے لئے انتخاب کیا۔ اور مولانا کالج کے پروفیسر بنائے گئے، لیکن کالج جانے کے بعد بھی ان کا مذاقِ شعر و سخن برابر قائم رہا علیگڑھ میں سرسید مولانا حالی، جسٹس محمود اور دیگر اہل علم کی صحبت میں مولانا کو کھل کر دادِ سخن دینے کا موقع مل گیا اور ملکۂ انشا پردازی اور شاعری کا جوہر جو ان کی طبیعت میں مضمر تھا بروئے کار آیا۔ چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے فرائض کے انجام دینے کے ساتھ ساتھ طبع آزمائی بھی کرتے تھے جیسا کہ ان کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے۔ اس مشق سخن کا حال اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کر لیتا ہوں۔ رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی دو تین شعر مزے کے ہیں تمہیں بھیجتا ہوں"[2]

علی گڑھ کی علمی فضا میں رہ کر مولانا کی شاعری نے تدریجاً ترقی کی۔ اس میں اس ہمت افزائی کو بھی دخل تھا جو کالج کے ارباب حل و عقد خاص خاص تقریبوں پر مولانا کی نظموں کو سن کر کیا کرتے۔ کبھی کسی جلیل القدر مہمان کی آمد پر اور کبھی ولایت میں کامیاب ہونے والے طلبہ کے خیر مقدم پر نظمیں لکھنے کی فرمائش کی جاتی تھی[3] علی گڑھ میں بیٹھے بیٹھے اردو شعراء کا کلام اور ان

---

[1] سیر المصنفین جلد ۲ ص ۴۰۸ ــ ۴۰۷، [2] مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۵۸۔

[3] مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۶۸ ـ ۶۹۔

کی معرکہ آرائیوں کا حال اخباروں میں مزے لے لے کر پڑھتے تنقید کرتے اور داد دیتے تھے۔ اور اس سے خود ان کی طبع رسا کو تحریک ہوتی تھی، چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ان دنوں اردو کی ایک غزل لکھی تھی اور حمید کو بھیجدی۔ آج کل داغ اور حالی کی دلّی میں خوب معرکہ آرائیاں ہیں۔ دو تین غزلیں اخباروں میں چھپی ہیں۔ داغ کا دوسرا دیوان چھپ کر آگیا اور تیسرا چھپ رہا ہے۔ مثنوی نہایت خراب لکھی ہے۔ میری مثنوی ساتھ آدے گی عموماً اہل سخن نے نہایت پسند کیا۔" [1]

اس تحریر سے جہاں مولانا کے ذوق شوق اور نقد سخن کا پتہ چلتا ہے۔ وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا اردو شاعری میں داغ کے کلام کو پسند کرتے تھے۔

شاعرانہ طبیعت اور شدّتِ احساس شاعری کا مقصد اوّلین جذبات کی نیرنگیوں کا اظہار کرنا ہے۔ انسانی محسوسات کا بعینہٖ چربہ اتارنا شاعری کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے شعر کہنے والے کی طبیعت کا شاعرانہ ہونا لازمی ہے۔ یعنی جذبات سے متاثر ہونے کا قوی احساس، جب تک شاعری میں قوت اور شدّتِ احساس نہ ہو وہ انسانی جذبات کو علےٰ وجہ الکمال اشعار میں دکھا نہیں سکتا۔ اس لحاظ سے جب ہم مولانا کی طبیعت پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہم کو بے حد حساس اور اثر پذیر نظر آتی ہے۔ رنج و غم اور شادی و مسرت دنیا میں ہر شخص کو پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن شاعر کی دنیا الگ ہوتی ہے جہاں ایک معمولی سا واقعہ ایک بلائے عظیم اور ایک چھوٹا سا حادثہ آفت ناگہانی بن جاتا ہے۔ یہ شدّتِ احساس ہی کا نتیجہ تھا کہ فارسی کے مشہور شاعر انوری کو کہنا پڑا۔

---

[1] مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۹۶۔

"ہر بلائے کز آسمان آید   گرچہ بر دیگراں قضا باشد
بر زمین نارسیدہ می پرسد   خانۂ انوری کجا باشد"

شاعر کی زندگی کا ہر پہلو شاعرانہ دلچسپی کا سامان بن جاتا ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مولانا کی زندگی میں جو جو واقعات اور حوادث پیش آتے رہے ان میں سے ہر اک کسی نہ کسی شاعرانہ اظہار خیال کا ذریعہ بن گیا۔ گرمیاں بسر کرنے کے لئے کشمیر تشریف لے جاتے ہیں لیکن وہاں بخار شروع ہو جاتا ہے اور آخر "قصیدہ کشمیریہ" کا باعث بنتا ہے شعرالعجم کی تالیف ہو رہی ہے۔ شاہنامہ کے ان اشعار پر تنقید کرتے ہوئے لکھ رہے ہیں:

بروز نبرد آں یل ارجمند   بہ تیغ و بہ تیر و بگرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست   یلاں را سر و سینہ و پا و دست

اسی اثناء میں زنانہ میں تخت پر آکر بیٹھتے ہیں اتفاقیہ بہو کے ہاتھ سے بندوق سر ہو جاتی ہے۔ مولانا کا پاؤں نشانہ بنتا ہے یہ حادثہ بھی بہت سے ادبی نکات و لطائف کا باعث بن گیا۔ اردو فارسی کی متعدد نظمیں اس کے متعلق لکھی گئیں۔ پہلے چھوٹے بھائی مہدی نے سفر آخرت اختیار کیا۔ مولانا کے دل پر چوٹ لگی اس کا نتیجہ ایک اردو مرثیہ کی صورت میں رونما ہوا۔ آخر عمر میں ایک اور ہونہار چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق (وکیل ہائیکورٹ) داغ مفارقت دے گئے۔ اس جان لیوا حادثہ پر ایک دردناک مرثیہ لکھا گیا جس کا ایک ایک بند دل ہلا دینے والا ہے۔

مولانا کے شدت احساس کے متعلق ان کے ایک دیرینہ رفیق مولانا شیروانی کا بھی بیان سننے کے قابل ہے:

"احساس بہت شدید تھا اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز نیم مردہ بھڑنے ان کے

پاؤں پر ڈنگ مار دیا۔ اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہوئی اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔ ذوق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک کھانے میں تیز ہنو دستر خوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے۔ شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے۔ باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ قند کے دلے منہ میں ڈلتے جاتے ہیں۔ وہ قند سے اور سامع کو ان کے کلام سے شیرینی کام ہے۔ سخن ہائے شیریں بہ از قند ہست۔ ایک مرتبہ جلسہ ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں بریلی میں میرا ان کا ساتھ ہوا۔ اس زمانہ میں تندرست تھے۔ قریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی بلکہ کھائی۔ محض شیرینی ہونا کافی تھا اس کے حسن و قبح سے بحث نہیں تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے۔ جاڑوں میں بھی یہی ہوتا۔ اس کے ساتھ سردی گرمی بہت محسوس کرتے، ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی دوسرے خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں بمبئی کے سفر فارسی شعر و سخن کے لئے یادگار رہیں گے۔ چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے[۱]"

اردو شاعری ابتدا میں مولانا فارسی میں مشق سخن کیا کرتے تھے؛ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اردو شاعری نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہ مشاعروں میں شریک ہونے اور اپنی اردو غزلیں پڑھنے لگے تھے۔ ان کے ابتدائی زمانہ کا اردو کلام چند غزلیات کے سوا ہمارے پاس موجود نہیں یا وہ چند اشعار جو ان کے مکاتیب میں خود انہوں نے نقل کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کے سوا اور بھی کلام ہو مگر

---

[۱] رسالہ تذکرۃ الشعراء مرتبہ حسرت موہانی بابت اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۱۵ء

وہ ہم تک نہیں پہنچا۔ مولانا کی غزلیات میں کوئی خاص بات ہم کو نہیں نظر آئی۔ خصوصاً ان کے معاصر شعرا کے کلام کے مقابلہ میں ان کی یہ غزلیں کچھ زیادہ قابلِ وقعت نہیں سمجھی جاسکتیں اگرچہ خود انکا دعوٰے ہے کہ

"یہ نظم آئیں یہ طرز بندش سخنوری ہے فسونگری ہے۔
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا"

یہ دعوٰے فارسی میں تو ہر اک کو مسلّم ہے لیکن اردو میں قابل تسلیم نہیں ہوسکتا۔ ہاں بقول ان کے صرف اسقدر کہا جاسکتا ہے کہ

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں آکے شبلی بھی غزلخواں رہ گیا

لیکن انہوں نے شاعری کو بطور پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے جذبات سے مجبور ہوکر وہ شعر کہتے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے غزل کے کوچہ میں قدم رکھا۔ مگر اس زمانہ میں امیر و داغ اس فن کے ماہر اور اقلیم سخن کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے اس لئے اس سرزمین میں پھلنا پھولنا معلوم، علاوہ ازیں شعرائے قدیم کا طرز سخن اس قدر فرسودہ اور پامال ہوچکا تھا کہ اب اس پر اضافہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ بلکہ نام نہاد سخن سراؤں کی تکرار و اعادہ مضامین سے قدما کی زمین میں قصائد و غزلیات کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہوچکا تھا۔ پھر اسی زمانہ میں مولانا کا تعلق علی گڑھ کالج سے ہوگیا جہاں تعلیمی اور قومی اصلاح کا صور پھونکا جارہا تھا۔ چنانچہ حالی مرحوم نے مسدّس لکھکر اس سمت میں پہل کی تھی اردو شاعری کی اصلاح کے لئے قدم بڑھایا تھا۔ مولانا بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے بھی ایک مثنوی "صبح امید" کے نام سے تصنیف کی جو ان کی پختہ مشقی اور شاعرانہ قابلیت کا نمونہ ہے۔ اس کے بعد ایک مسدس "تماشائے عبرت" کے نام سے لکھا جو علی گڑھ کے قومی تھیٹر میں انہوں نے اپنے خاص انداز میں پڑھا بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایک خاص انداز ترنم سے نظمیں پڑھنے کا طریقہ مولانا ہی نے ایجاد کیا۔ لیکن اس

طرح کی قومی شاعری کو وہ دوسرے کی ملک سمجھتے تھے۔ مولانا شبلی کی اعلیٰ ظرفی اور بلند حوصلگی کا یہ اقتضا تھا کہ انہوں نے اپنے لئے کبھی دوم درجہ کی چیز پسند نہیں کی۔ یہ اہتمام ان کا قریب قریب ہر علمی شعبہ میں رہا۔ سرسید کی وفات کے بعد ان کی انشا پردازی پر ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کالج کی طرف سے کی گئی چنانچہ مولانا نے علی گڑھ کالج میگزین کے لئے ایک مضمون لکھا اس کے اخیر میں فرماتے ہیں۔

"یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے۔ وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ لکھ چکے ہیں اور خوب لکھا ہوگا۔ میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا اس وقت جبکہ تمام ملک میں سرسیّد کا آوازہ ماتم گونج رہا ہے اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے کا شائق ہے کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہیئے۔ میں نے اسی کی تعمیل کی ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا۔

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو [1]"

چنانچہ اردو شاعری میں بھی انہوں نے پامال راستوں کو اختیار نہیں کیا۔ جن پر دوسرے گامزن ہو کر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مولانا نے اپنی ابتدائی اردو کلام کو کبھی وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا اس کا دراصل یہی سبب ہے۔ مولانا کو علمی دنیا میں جو شہرت عام حاصل تھی اس لحاظ سے وہ اپنی اس کم رتبہ اردو شاعری کی بدولت اپنے درجے سے نیچے اترنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں سے

---

[1] مقالات شبلی جلد ۲ ص ۶۶۔

مثنوی "صبح امید" اور چند قومی نظموں کے سوا کچھ شائع نہیں ہونے پایا بلکہ اپنے قدیم اُردو کلام کو وہ زمانہ جاہلیت کے کلام سے تعبیر کرتے تھے[1] مولانا کے علم وفضل اور طبقہ علما میں ان کی عظمت و وقار کے لحاظ سے اردو شاعری سے ان کی دستکش رہنے میں وہی مصلحت ہو سکتی ہے جس کا اظہار امام شافعیؒ فرما چکے ہیں۔

ولولا الشعر بالعلماء یزری   لکنت الیوم اشعر من لبید

یعنی اگر شعر کہنا علمار کی شان کے منافی نہ ہوتا تو میں مشہور حضرمی شاعر لبید بن ربیعہ سے بڑھ کر شاعر ہوتا۔

اس کے ساتھ مولانا کے قومی اور تعلیمی اشغال اور تصنیف وتالیف کی اہم مصروفیات بھی کم شعر کہنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ندوہ کی جھنجھٹ اور شاعری ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں ہیں لیکن بہرحال چارہ بھی نہیں ندوہ فرضِ منصبی مذہبی اور شاعری فرض طبعی کس کو چھوڑوں پھر انہیں پر موقوف نہیں یک دل وہزار سودا"[2]

بایں ہمہ یہ فریضۂ طبعی برابر اپنا کام لیتا رہا اور آخر کار مولانا کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت نے اس "فریضۂ طبعی" کی ادائیگی کے لئے ایک میدان نیا تلاش کر لیا اور انہوں نے ایک نئی صنف سخن میں طبع آزمائی شروع کر دی اس طرح ان کی شاعری کے وہ جوہر کھلے جو ایک فطری اور حقیقی شاعر کی طبیعت میں مضمر ہوا کرتے ہیں۔ قصیدہ و غزل کی قدیم اور پامال روش و فف اغیا رکھی قومی شاعری میں حالی اپنا سکہ جما چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے واقعاتی شاعری کو انتخاب کیا اور قومی اور سیاسی معاملات پر قطعات لکھنے شروع کئے۔

---

[1] مکاتیب جلد ا ص ۱۴۱ ، [2] خطوط شبلی ص ۱۰۲ ۔

قطعات نویسی میں مولانا نے جس طرح اپنا زورِ سخن دکھایا ہے۔ جس آن بان سے اس کوچہ میں قدم رکھا ہے اور حسن لطیف اور دلکش پیرایہ میں سخن سرائی کی ہے وہ بہت مستحق ستائش اور اردو کی جدید شاعری کے لئے سرمایہ نازش ہے۔ لیکن چونکہ آخر عمر میں اس جدید شاعری کی ابتدا ہوئی اس لئے مولانا اس کو "بڑھاپے کا زور" سے تعبیر کرتے ہیں[1] سنہ ۱۹۱۰ء میں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"عمر ۵۵ تک پہنچ گئی قویٰ میں انحطاط آگیا غذا صرف ایک چپاتی رہ گئی۔

مگر خامۂ شبلی کی آتش افشانی — یہ مان لیجیے کہ ہے بھی پر اسمیں دم کیا ہے"[2]

جیسا کہ علامہ شبلی نے خود تصریح فرمائی ہے کہ "جو چیز مدرکات انسانی میں ہمارے جذبات واحساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے اور ایک خاص طرح کی موزونیت کے ساتھ مصوری اور موسیقی کی جامع ہے آج اس پر شاعری کا اطلاق ہوسکتا ہے[3]"۔ اس نقطہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں ہوسکتا کہ مولانا کی جدید اردو شاعری اس کا صحیح مصداق ہے اور ہم اس میں "ایک خاص طرح کی موزونیت کے ساتھ مصوری اور موسیقی" بھی پاتے ہیں جو جذبات احساسات کو برانگیختہ کرتی ہے علامہ کی جدید نظموں کے موضوعات کا دائرہ صرف قومیات، تاریخیات، یا سیاسیات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی واقعاتی شاعری ہر واقعہ کو شاعرانہ رنگینیوں اور لطافتوں کے ساتھ صحیح با محاورہ اور شگفتہ زبان میں بیان کرنے کی اہمیت رکھتی ہے اور جس کی ان کے معاصر شعراء میں بہت بڑی کمی نظر آتی ہے۔ واقعاتی شاعری چیزوں کو ضرور بیان کرتی ہے مگر محض اس لحاظ سے کہ وہ ظاہری حواس کے ذریعہ کس طرح محسوس ہوتی ہیں۔ نہ اس اعتبار سے کہ وہ حقیقتاً کیا ہیں۔ کس چیز کی تصویر اس کے اصلی اور فطری

---

[1] مکاتیب ج ۱ ص ۱۱۰ — ۱۰۹، [2] مکاتیب ج ۱ ص ۳۳۳، [3] شعر العجم۔

خط و خال کے ساتھ نہیں کھینچ سکتی بلکہ اس میں تخیّل کے ذریعہ رنگ آمیزی کرنی ضروری ہے۔ ان اصولوں پر شبلی کی جدید شاعری کو پرکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعرانہ تخیّل کی تصویریں تمام تر انہیں اصول کے ماتحت تیار ہوئی ہیں۔

مولانا کی جدید شاعری مجموعہ ہے ان نظموں کا جو مختلف اوقات میں مختلف عنوانات پر لکھی گئی ہیں۔ یہ نظمیں عنوانات ذیل کے ماتحت تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

(۱) مذہبی (۲) قومی

(۳) سیاسی (۴) وقتیہ

تاریخی و مذہبی نظمیں اس قسم میں وہ تمام نظمیں ہیں جو اسلامی تاریخ کے "خیر القرون" کی "مقدس روایات" سے ماخوذ ہیں۔ اسلامی روایات کو صرف تاریخی حیثیت سے بیان کرنا شاعر کا مقصد نہیں ہے بلکہ ان نتائج سے بھی متاثر کرنا ہے جو ان روایات سے مرتّب ہوئے ہیں اور جن کو وہ خود شدت کے ساتھ محسوس کر چکا ہے۔ تعمیرِ مسجد نبوی، ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی، اہل بیت کی زندگی، ایثار کی اعلےٰ ترین نظیر، مساواتِ اسلام، خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ عدلِ فاروقی، اظہارِ قبولِ حق، جرأت و صداقت، ایسی نظمیں ہیں جو ایک سچے مسلمان کے دل میں اسلامی غیرت و حمیّت اسلامی خود داری اسلامی انصاف پسندی، جرأت و صداقت اور حرّیت ضمیر و فکر کے لطیف جذبات کو اُٹھا کر اس کو ان انسانی فرائض کی طرف متوجہ کر دیتی ہیں جن کو وہ اپنی غفلت کی وجہ سے بھلا بیٹھا ہے۔ بلا شبہ یہ اسلام کی مذہبی تاریخ "اسباق الاشیاء" ہیں اور جہاں وہ ایک مسلمان کو شرافت انسانی کے اصلی نکات سکھلانے اور انسانی آفرینش کی مقصد کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں وہاں وہ ایک غیر مسلم کو اسلامی اخلاق اور اسلامی رواداری، حق گوئی اور معدلت پسندی سے آگاہ کرتے ہیں ان میں بعض نظمیں اس قدر رقت انگیز ہیں کہ ممکن نہیں جو ایک مخلص اور سچے اسلامی جذبات رکھنے والے کو اشکبار نہ کر دیں۔

قومی نظمیں

سرسید مرحوم کی تعلیمی اور اصلاحی کوششوں میں ان کے جو سرگرم اور پرجوش معاون پیدا ہو گئے تھے ان میں وہ جلیل القدر اور سربرآوردہ افراد تھے جو اپنی علمی اور مذہبی تحریروں سے اپنی درماندہ قوم کی مذہبی تعلیمی تمدنی اور اخلاقی حالت کو اٹھانے میں کوشاں تھے۔ مثلاً نواب محسن الملک، جسٹس محمود، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی وغیرہ سرسید کے انہیں رفقا میں حالی اور شبلی ایسی زبردست ہستیاں بھی شامل تھیں۔ جو اپنی سحر بیانیوں سے قوم کے مردہ جسم میں روح پھونک رہی تھیں۔ اصلاح قوم کی جو آواز اس درد مند دل سے بلند ہوئی تھی وہ سرسید کے ان دو نقیبوں کے زبان قلم سے صور اسرافیل بن کر نیند کے ماتے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے میں کارگر ثابت ہوئیں۔ حالی مرحوم نے جو علوم مشرقیہ کے عالم اور اردو کے اچھے انشاپرداز و شاعر بھی تھے۔ سرسید کے ایما پر مسدس لکھا۔ علامہ شبلی ایسے جامع العلوم اور شاعری کا صحیح مذاق رکھنے والے بزرگ کب خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ حالی نے مسلمانوں کا جو مرثیہ پڑھا تھا شبلی بھی اس سوز خوانی میں ان کے شریک و دمساز رہے گو ان دونوں کے نزدیک مسلمانوں کی پستی کے اسباب جداگانہ تھے۔ مگر دونوں کا مطمح نظر ایک تھا چنانچہ مولانا نے بھی ایک مثنوی (صبح امید) کے نام سے تصنیف کی جو بہت مقبول ہوئی۔ مولانا کا یہ پہلا کارنامہ ہے اس کے بعد ایک مسدس قومی "تماشائے عبرت" کے نام سے انہوں نے تصنیف کیا جو علی گڑھ کے قومی تھیٹر میں پڑھا گیا اس میں شک نہیں مسدس حالی کا سا قبول عام مثنوی صبح امید کو نصیب نہیں ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نفس شاعری اور فن کے لحاظ سے مثنوی کا درجہ بلند ہے اس میں جو آمد زور سخن اور جوش بیان پایا جاتا ہے وہ مسدس میں نہیں ہے۔ خصوصاً مسدس میں جو یاس انگیز حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے وہ جادۂ عمل پر گامزن ہونے کی تحریک نہیں پیدا کرتا۔ برخلاف اس کے مثنوی کا ایک

ایک شعر قوم کے شاندار ماضی سے ایک امید افزا مستقبل کی طرف رہنمائی کرتا اور مردہ دلوں میں تازہ روح پھونکتا ہے ملاحظہ ہوں اشعارِ ذیل۔

امید کی بڑھ گئی تگ و تاز — اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو پا بگل تھے — آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا — مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے — اخبار کہیں کہیں رسالے
تعلیم کے جا بجا وہ جلسے — گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بلتیا ب ہراک جز دکل تھا — ہر بار "بڑھے چلو" کا غل تھا

خاص کر اشعار ذیل میں شاعر نے جو رجز خوانی کی ہے وہ بہت ہمت افزا ہے۔

اے مدعیانِ حُبِّ اسلام — حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ — ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
دیکھو رہِ جستجو یہی ہے — میدان یہی ہے گو یہی ہے
انداز عرب اگر ہے خُو میں — باقی ہے وہ جوش اگر لہو میں
موقع ہے یہی ہُنر دکھاؤ — جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ
کر دو جو گزشتہ کی تلافی — ثابت ہو زمانہ پر کہ اب بھی
گو دورِ فلک ہوا دگر گوں — پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی — اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے — دل ڈھل بھی گیا طپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی — اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں طرز و خُو وہی ہے — مرجھا گئے پھول بُو وہی ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس کے بعد سے مولانا نے قومیات کے سلسلہ میں کوئی نظم نہیں لکھی سوائے اس قصیدہ اُردو کے جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۱۸۹۳ء میں پڑھا گیا بلکہ اس طویل عرصہ میں مولانا اپنے جذباتِ لطیفہ کا اظہار فارسی کے ذریعہ کرتے رہے۔ لیکن آخر میں چند محرکاتِ قومی نے ان کو دوبارہ قومی نظمیں لکھنے پر آمادہ کیا چنانچہ ۱۹۱۰ء سے انہوں نے پھر اس کوچہ میں قدم رکھا لیکن اب کی مرتبہ وہ بالکل انوکھی وضع اور ایک خاص طرز کلام کے ساتھ اس میدان میں آئے اور اس شان سے آئے کہ "اپنی شاعری کے لباس اور اس کے ساتھ اپنی مولویت کی وضع قدیم کو اس آستانہ پر نذر کر دیا۔

۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ شاعر جو جذبات کا ایک مخزن ہے انسانی ظلم تعدی کے اس خونخوار منظر کی تاب نہ لا کر اس پر اس طرح خون کے آنسو بہاتا ہے۔

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمہ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خون
کہ کانپور کے زخمیوں کا بھی کچھ حق ہے

شہدا کانپور کی نسبت یوں نوحہ خوانی کرتا ہے۔

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسولِ عرب کی قوم
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سن لو وہ گنجہائے گرانمایہ دفن ہیں
کچھ بیلقاں کی خاک میں کچھ کانپور میں

پابہ زنجیران کانپور کے متعلق ایک خاص پیرایہ میں اپنے پاؤں کے نہ ہونے پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے مولانا نے جو درد انگیز انداز بیان اختیار

کیا ہے۔ وہ ان نازک اور لطیف حسیات کا ترجمان ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہمقدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار
ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ
یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل بھی نہیں

کانپور کے واقعہ نے مولانا کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ انہوں نے پے درپے مختلف عنوانات سے اس پر متعدد نظمیں لکھی ہیں جو اس وقت مختلف اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

قومیات کے سلسلہ میں مولانا کی اور بھی نظمیں ہیں جو زیادہ تر ندوۃ العلماء کے ذاتی جھگڑوں مسلم یونیورسٹی کا وفد اور اس کے الحاق سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ ان میں جس جرأت اور آزادی کے ساتھ نکتہ چینیاں کی گئی ہیں وہ مولانا کے جذبہ اظہار صداقت اور بلند معیار ترقی کو ظاہر کرتی ہیں۔

سیاسی نظمیں

سنہ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی منسوخی کے اعلان نے جب مسلمانوں میں ایک غیر معمولی ہلچل پیدا کر دی تو مولانا جیسے ایک حجرہ نشین عالم بھی اپنے گوشہ امن و عافیت سے باہر نکل آئے اور اس عالم اضطراب میں شریک ہو گئے۔ اسی دوران میں جنگ بلقان چھڑ گئی اور شاعر کے دل میں "مادرار الوطنی حُب قومی" کی آگ بھڑک اٹھی چنانچہ "شہر آشوب اسلام" نام کی ایک نظم لکھی یونان نے ترکی پر حملہ کیا تھا اور اس سے ترکی کو جو نقصان عظیم اٹھانا پڑا اس پر تمام دنیائے اسلام نے خون کے آنسو بہائے تھے انہیں اشک افشانیوں میں شاعر نے بھی اشکہائے خونین کے چند قطرے شامل کر دیئے۔ اسلامی سلطنتوں کے زوال کی جو حسرتناک مرثیہ خوانی شاعر نے کی ہے اور "مسلمانوں کی مظلومیت" کی جو دردناک تصویر دکھائی ہے وہ نہایت پُرسوز اور دلگداز ہے۔ فرماتے ہیں۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھیگا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردئیے پرزے
فضائے آسمانی کی اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھلائے گا شہیدِ نیم جاں کب تک

شاعر کی مایوسی کا کیا ٹھکانا ہے جب وہ مجبور ہو کر کہتا ہے۔

جو ہجرت کرکے جائیں بھی تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

جنگ بلقان کے سلسلے میں وزرائے برطانیہ کے دعوے اسلام کی دوستی کی تردید فرماتے ہوئے کس رقت انگیز انداز میں التجا کرتے ہیں۔

بڑا اسو تا ہے کوئی گنبد خضرائے یثرب میں
کہ جس کا بندۂ فرماں زمین سے آسمان تک ہے
کوئی جا کر یہ کہدے ہم گنہگاروں کی جانب سے
کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطافِ نہاں تک ہے

مولانا کی دنیائے سیاسیات میں یہ اہم بات ہے کہ وہ احرار اور وطن پرستوں سے بھی دو قدم آگے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً ایسے زمانہ میں کہ ہنوز سیاسی ترقیات کا ظہور نہیں ہوا تھا۔ ان خیالات کا اظہار ان کی نظموں کے ذریعہ ہوتا رہا جو انہوں نے مسلم لیگ کے متعلق لکھی ہیں۔ نظمیں تعداد میں بارہ

ہیں اس موقع پر مولانا نے چند سیاسی مضامین بھی لکھے تھے جو اخبارات میں شائع ہوئے اس روش پران کے بعض قدیم دوستوں نے اعتراض کیا تھا چنانچہ "کفران نعمت" کے عنوان کے تحت میں اس کا جواب یوں ارشاد ہوتا ہے۔

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانِ قدیم
جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے
کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن
کانگریس سے مجھ کو اظہارِ برآت کیوں نہیں
کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

خیر میں تو شامتِ اعمال سے جو ہوں سو ہوں
آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن
آپ نے شملہ میں جاکر کی تھی جو کچھ گفتگو
ماحصل اسکا فقط یہ تھا پس از تمہیدِ فن
سعیٔ بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق
اس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی "بہرِ پنجتن"
یعنی جاکر شیر جب کر لائے جنگل سے شکار
لومڑی جا پہنچے کہ کچھ مجھ کو بھی اسے سرکارِ من

لیگ کانگریس کے "سیلف گورنمنٹ" مقابلے میں "سوٹ ایبل گورنمنٹ" کا جو افسون حریت پھونکا تھا اس پر مولانا نے خوب خوب لطیف طنزیں کی ہیں خصوصاً احرار قوم کی بے اعتدالی اور خیرہ سری پر جس لطیف انداز میں طنزیہ نظمیں لکھی ہیں وہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں لیگ اور کانگریس کے گلے

مل جانے کی جو پیشین گوئی مولانا نے کی تھی کہ

کامیابی میں اک آدھ برس باقی ہے
لیگ سے ملنے کو کانگریس باقی ہے

وہ آخر کو صحیح ثابت ہوئی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ سنہ ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں اس اتحاد کا جلوہ بصدارت مولانا مظہر الحق نظر آیا تھا۔

فی الحقیقت سیاسیات ایسے خشک موضوع پر مولانا کی نظموں میں جو لطیف جذبات و اشارات پائے جاتے ہیں اور دوسروں کے خیالات کے جو دلکش نقوش کھینچے گئے ہیں وہ اردو ادبیات میں اپنی نظیر آپ ہیں اور بقول مولانا حسرت "اس قابل ہیں کہ قومی ترانوں کی حیثیت سے خاص و عام کی زبان زد ہوں"۔[1]

اُردو میں اس قسم کی طنزیہ نظموں کو رواج دینے کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے ان نظموں سے اکثر "کشاف" اور "وساف" کے فرضی ناموں سے اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ سیاسی "شذراتِ نظم" بھی بہت قابل قدر ہیں جو انھوں نے لیگ اور دیگر موضوعاتِ سیاسی پر تحریر فرمائے ہیں۔

تاریخی نظمیں

اگرچہ خالص تاریخی موضوع پر مولانا نے کوئی نظم نہیں لکھی لیکن بعض نظموں میں شاعر نے ابنائے ملک کی تاریخی غلط فہمیوں کا احساس کرتے ہوئے ان کو دور کرنے کے لئے اپنی شاعرانہ قوتوں سے کام لیا ہے۔ "نظام حکومت اسلام" "ہمارا طرز حکومت" اور "عدلِ جہانگیری" اس کا بہترین نمونہ ہیں۔ خصوصاً آخر الذکر نظم میں افسانویت اور شعریت کا جو رنگ بھرا گیا ہے اور جس موزونئے الفاظ حسب بیان بے تکلفی اور روانی کے ساتھ یہ نظم لکھی گئی ہے وہ مولانا کے شاعرانہ کمال کی دلیل ہے

---

[1] تذکرۃ الشعراء جولائی، اگست سنہ ۱۹۱۵ء

اور ان کو فطری شاعر مان لینے پر مجبور کرتی ہے۔ "ہمارا طرزِ حکومت" والی نظم میں اس امر کے ثبوت میں کہ

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

مولانا نے جو واقعہ بیان کیا ہے اور اس سے جو اہم نتیجہ نکالا ہے اس کو ایک شاعر ہی کا قلم ادا کر سکتا ہے۔ اس کے آخر میں اپنائے ملک سے شاعر مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

یہی ہیں وہ شمیم انگیز یاں عطرِ محبت کی
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

وقتیہ نظمیں یہ وہ متفرق نظمیں اور قطعات ہیں جن میں مولانا نے کوئی نہ کوئی واقعہ اپنے خاص شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں ایک مرثیہ بھی ہے جس میں مولانا نے اپنے برادرِ عزیز مولوی محمد اسحاق مرحوم کی جواں مرگی کا ماتم کیا ہے۔ جو بڑھاپے میں ان کو داغ مفارقت دے گئے، یہ مرثیہ گو بالکل سادہ اور شاعرانہ صنعتوں سے معریٰ ہے لیکن جذباتِ صادقہ اسلوب بیان اور اظہارِ درد وغم کے لحاظ سے ایک غیر معمولی چیز ہے۔ چند رقت انگیز بند ملاحظہ ہوں۔

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہے طور
اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور
کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز
تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں۔

اس کے علاوہ مختلف واقعات پر مولانا کے چھوٹے چھوٹے قطعات نہایت پُر لطف اور دلچسپ ہیں ان قطعات میں اگرچہ صرف ایک واقعہ کا اظہار ہوتا ہے لیکن وہ اس قدر موزوں الفاظ اور شاعرانہ انداز میں لکھا ہوا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے۔ ذیل کے قطعات میں اگرچہ کسی طرح کی شاعرانہ نمود و نمائش منظور نہیں ہے صرف امر واقعہ کا بیان مقصود ہے لیکن ان میں بھی ایک خاص دلکشی ہے اور ان سے وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو کسی اچھے شعر کو سُن کر ہوا کرتا ہے۔

آخر عمر میں جب سیرۃ النبی لکھنے بیٹھے تو اس کو "عمر بھر کا حاصل اور وسیلۂ نجات" سمجھ کر اپنے پچھلے علمی کارناموں کا مقابلہ کرتے ہوتے اپنے خاتمہ بالخیر ہونے کی نسبت یوں فخر کرتے ہیں

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستان لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سرکار عالیہ بھوپال کی طرف سے سیرت پاک کی کتابت و طباعت کے مصارف عطا ہونے پر اپنا اور فرمانروائے موصوفہ کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقیدِ روایتہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض اس کام کی تکمیل میں دو ہاتھ شامل ہیں
کہ جن میں اک گدائے بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

اس قطعہ میں لفظ "سلطان" کا استعمال خاص طور پر داد طلب ہے کہ اس میں بیگم صاحبہ مرحومہ کے اسم گرامی "سلطان جہان" کی طرف اشارہ ہے۔

سیرت پاک کو کماحقہ لکھنے کی اہمیت اور اس کے عدم امکان کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ حال سرورِ عالم
دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدوس سے آئی
کہ یہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

سنہ ۱۹۱۱ء جزیرہ کا سفر کرتے ہیں وہاں پہنچکر آب و ہوا کی لطافت سے متاثر ہوتے ہیں اور ارتجالاً ایک غزل لکھتے ہیں جس کے دو شعر یہ ہیں

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکرِ مے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف یہ سبزہ یہ منظر یہ بہارستاں
عطیہ تم کو یادِ لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی۔

ان دلچسپ قطعات میں بعض وہ قطعے بھی ہیں جن پر "مطائبات" کا اطلاق ہوتا ہے۔ مولانا کی شاعری کا ایک نہایت دلچسپ جزدان کے لطیف اشارات و طنزیات ہوتے ہیں جن کو سمجھنے والے سمجھکر لطف اٹھاتے ہیں۔

اُردو کے ایک نکتہ شناس ادیب کی رائے ہے کہ

"اُردو میں ان (شبلی) کے مطائبات نظم کو جو جدید پیدا وار ہیں ان کے سلسلہ کمالات سے علیحدہ کر کے دیکھئے۔ جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے۔ شوخی کے ساتھ سنجیدگی یہ معلوم ہوتا ہے دور سے زبان کی بلائیں لے رہی ہے[1]" "مطائبات" کی چند مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

(۱) نواب محسن الملک کی وفات کے بعد علیگڑھ کالج کی نظامت کے لئے جبکہ نواب وقار الملک کا نام پیش کیا جا رہا تھا۔ اس وقت ٹرسٹیوں میں سے ایک صاحب بھی کوشاں تھے جو قوم فروشی میں مشہور ہو چکے تھے اس پر مولانا نے قطعہ ذیل لکھا۔

وقار الملک اگر ہوں جانشین مہدیِ اعظم
تو اس تجویز کا منکر تو کوئی ہو نہیں سکتا
تعجب ہے کہ اک دجّال بھی ہے اسکی کوشش میں
مگر ظاہر ہے یہ دجال مہدی ہو نہیں سکتا

(۲) مولانا کے قیام الہ آباد کے اثنا رمیں حضرت اکبرالہ آبادی مرحوم ان کو اپنے یہاں مدعو کرتے ہوئے اشعار ذیل بطور رقعہ دعوت بھیجتے ہیں۔

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی — بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

اس کے جواب میں مولانا دعوت میں شریک نہ ہو سکنے کا عذر پیش کرتے ہوئے قطعہ ذیل لکھ بھیجتے ہیں۔

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور رہوں میں

---

[1] افادات مہدی ص ۲۱۳۔

آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں

حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں

لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا

اب اللہ کے افضال سے "تیموز" ہوں میں

ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ " امید ہے میرا یہ عذر عذر لنگ نہ سمجھا جائیگا"

(۲) بمبئی کے مشہور مسلمان ذی علم خاتون عطیہ بیگم ایک نومسلم یہودی مصوّر سے شادی کرتی ہیں اس تقریب میں "تحفہ شادی" کے طور پر مولانا ان کو اشعار ذیل بھیجتے ہیں۔

بتان ہند کافر کرلیا کرتے تھے مسلم کو

عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

عطیہ کی زبانی فرماتے ہیں :-

کھینچ سکتا جو نہ مجھ کو کوئی اپنی طرف

اس لئے ننگِ قرابت سے مجھے دوری تھی

آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں

آپ نے مجھ کو جو کھینچا تو یہ مجبوری تھی

اس میں شک نہیں ہے کہ جدید اردو شاعری میں اس قسم کی نظمیں لکھ کر مولانا نے اظہار خیال کے لئے ایک نیا باب کھول دیا اور اسی کا اثر تھا کہ دوسرے شعرائے بھی اس طرف توجہ کی۔ چنانچہ سیاسیات پر اس قسم کے مطائبات لکھنے والوں میں اس وقت اکبر، اقبال اور ظفر علی خاں کامیاب متبع کہے جا سکتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خود مولانا اپنی نظموں کی نسبت کوئی زیادہ بلند رائے نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ "چمن زار بمبئی" سے مسٹر ایم مہدی حسن کو لکھتے ہیں " کشاف کی ہزلیات جو کچھ ہوں اس طرح رکھیئے حسن ظن کو اتنا کیوں بڑھاتے ہیں۔ اور بڑھانا بھی تو " مطائبات " کا لقب زیادہ موزوں تھا۔

الہلال میں میری خاص نظمیں اب چھپیں گی جن میں اخلاق و ادب کے واقعات ہیں۔ ان کو دیکھئے گا محض تاریخی واقعات ہیں۔ "انشا طرازی نہیں"۔ لہ"

قطعاتِ شبلی کے متعلق ایک بات عجیب ہے کہ ان کی ظاہری اتباع غالباً اخبار الہلال کے ساتھ ہوئی اور خاتمہ بھی اسی کے ساتھ ہو گیا۔ آپ کا آخری قطعہ زیر عنوان "مسجد نبوی"، ۱۳ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۲ ہجری کو الہلال میں شائع ہوا جس کے بعد صرف ایک پرچہ اور نکلا جس میں علامہ مرحوم کے انتقال کی خبر درج تھی۔

بقول مولانا حسرت پختگی کلام برجستگی مضمون آزادی خیال ندرت بیان اور نوی طرز غرض یہ کہ ہر حیثیت سے یہ قطعے اپنا آپ جواب ہیں۔ اور کچھ عجب نہیں کہ غالب کے اردو کلام کے مانند رفتہ رفتہ شبلی کی اردو شاعری ان کی فارسی شاعری پر غالب آجائے۔" ۲ے

اردو تصانیف شعری

مولانا کی اردو تصانیف شعری میں مثنوی صبح امید مسدس موسوم بہ تماشائے عبرت اور ان کے مختلف مجموعے نالۂ شبلی، کلام شبلی وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جو بہت غلط سلط چھپے ہیں۔ خود مولانا کو اس کا علم تھا اور اس لئے وہ خود چاہتے تھے کہ ان کی مرضی کے مطابق ان کا کلام شائع ہو۔ چنانچہ مولوی محمد امین زبیری کو اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نالۂ شبلی دیکھا اشعار غلط چھپے ہیں میں نے ان کو لکھا کہ پروف بھیج دیجئے میں تصحیح کروں گا۔ لیکن انہوں نے جواب تک نہ دیا بہر حال آپ اگر سیاسی نظمیں بھی چھاپنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ میرے تینوں آرٹیکل، پولٹیکل کروٹ والے بھی شامل کیجئے اس نظم کی وہ نثر شرح ہے، کچھ دیباچہ بھی ہونا چاہیئے

لہ مکاتیب جلد اص ۲۳۳، ۲ے تذکرۃ الشعرا جولائی و اگست سنہ ۱۹۱۵ء ص ۲۲-۲۴

وہ میں لکھ دوں گا''۔ ؎۱

لیکن شاید اس مجموعہ کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اپنی نظموں کو با ترتیب چھپوانے کا بھی مولانا کو خیال تھا چنانچہ انہیں زبیری صاحب کو لکھتے ہیں۔

"نظموں کے دو حصے ہونے چاہئیں اخلاقیات و سیاسیات کشاف صاف کے نام کی نظمیں سیاسیات کے عنوان میں رہیں دونوں حصے اس طرح چھاپے جائیں کہ مجموعہ بھی اور الگ الگ بھی فروخت ہو سکیں بہت سے موقعے ہوں گے جہاں صرف اخلاقیات کی اشاعت ہو سکے گی۔ سیاسیات اگر غیر منفک ہوں گے تو مجموعہ رک جائے گا۔ اردو نظمیں جس قدر الہلال میں ہیں سب لکھوا کر میرے پاس بھجوا دیجئے تو یاد آئے کہ اور کیا کیا باقی ہے۔ میرے پاس کچھ موجود نہیں لیکن دماغ پر زور ڈال کر پتہ لگالوں گا ؎۲"

غالباً یہ مجموعہ بھی" روشنِ طبع"سے محروم رہا۔

آخر میں مولانا کی وفات کے بعد دارالمصنفین نے "کلیات اردو" کا ایک صحیح اور جامع ایڈیشن شائع کیا لیکن اس میں سے مولانا کے زمانہ جاہلیت کا کلام نکال دیا گیا ہے بلکہ بعض قطعات اس میں بھی نہیں ملتے مثلاً نواب وقارالملک والا قطعہ تاہم یہ مجموعہ صحت اور کتابت و طباعت کے اعتبار سے بسا غنیمت ہے۔

حالی اور شبلی

بعض ادبی حلقوں میں حالی اور شبلی کا مقابلہ کیا جاتا ہے میرے خیال میں دو شاعروں کا مقابلہ کرنا ایک ایسا دشوار گزار مرحلہ ہے جس سے عہدہ برآ ہونا ہر اک کے بس کی بات نہیں ہے۔ شاعری اور ادب کی دنیا میں ذوقیات کا سوال نہایت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس میں تمام تر اصول فن پر دارومدار نہیں رکھا جاسکتا اور اس بنا پر ایک شاعر کو دوسرے پر فضیلت

؎۱ مکاتیب جلد ا ص ۲۴۳، ؎۲ مکاتیب جلد ا ص ۲۴۸۔

اور ترجیح دینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر حالی اور شبلی ہیں گو امرِ مشترک صرف "قومیات" کا موضوع ہے لیکن نفس شاعری اس کے علاوہ ایک "چیزے دیگر" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے مقابلے کا سرے سے سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اگر یہ مقابلہ ہو تو اسی قسم کا ہوگا جیسا کہ فردوسی اور نظامی کا جس میں اوّل الذکر کو "پیغمبر سخن" ماننے کے بعد بھی آخر الذکر کو "خدائے سخن" تسلیم کیا گیا ہے۔ یہاں ہم شبلی کے ساتھ حالی اور دیگر معاصرین کا موازنہ کر کے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ بلحاظ فنِ شعر شبلی کا مرتبہ کس قدر اپنے معاصرین سے بڑھا ہوا ہے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اردو کے اساطین ادب میں جن کو خود مولانا شبلی نے "عناصر اربعہ" کا لقب دیا اور جس میں بعد کو وہ بھی بحیثیت "عنصر خامس" شامل کر دیئے گئے باستثنائے سرسید مرحوم سب کے سب سخن سنج اور سخن فہم تھے لیکن ان میں صحیح معنوں میں "شاعر" کون تھا یہ ایک مشکل سوال ہے جس کے مختلف جوابات ملیں گے۔ میری ناقص رائے میں تو شبلی، آزاد اور نذیر احمد سے بہتر اور حالی سے کسی طرح کم رتبہ نہیں تھے۔ بلکہ اپنی آخری دور کی اردو شاعری کے اعتبار سے وہ ان سے بڑھ کر تھے۔ سب سے پہلے آزاد کو لیجیے ان کی شاعری برائے نام اور زبردستی کی شاعری ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی شاعرانہ قوت کو نثر میں کھپا چکے تھے۔ تاریخ ادب اردو کے مورّخ کا بیان ہے کہ

"آزاد مثل حالی شاعری کے دلدادہ نہ تھے۔ ان کا کلام بھی عیوب شاعری سے پاک و صاف نہیں۔ ان کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار جس قدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہو سکا"[1]۔

ذوق دہلوی کے شاگرد ہونے اور محکمہ سر رشتہ تعلیم کے ایمائے سے جدید طرز کی نظمیں

---

[1] تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ ترجمہ اردو ص ۴۹۶ — ۴۹۷۔

لکھنے کے باوجود وہ اُردو شاعری میں کوئی خاص درجہ نہیں پیدا کر سکے خصوصاً مولانا حالی کے ہوتے ہوئے ان کی جدید شاعری کسی خاص وقعت کی مستحق نہ تھی۔ اسی طرح نذیر احمدؒ آقائے اُردو تسلیم کئے جائیں لیکن ان کو شاعر کہنا گویا شاعری کا منہ چڑھانا ہے انہوں نے نہ خود کو کبھی شاعر مانا نہ دوسروں نے ان کو، گو ان کے خلف الرشید مولوی بشیرالدین صاحب کہا کریں کہ۔

"زمانہ حال کی نئی روشنی کے شعرا میں حالی و شبلی اور میرے والد لے دے کے یہ تین شخص ایسے تھے کہ جو "ترپل الاینس" (اتحاد ثلثہ) کہلائے جا سکتے ہیں۔" [1]

لیکن ان کی قومی نظمیں محض آورد اور وقتی اپیج سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، جن میں حسن شعر کی بجائے "حسن ادا" کو زیادہ دخل ہوتا تھا۔ لیکن پڑھنے والوں کے مذاق سخن یا بزرگانہ ادب کی داد دیجئے کہ ان کو "ان نظموں میں بھی وہی مزہ ملتا ہے جو حالی اور شبلی کی نظموں میں"۔ [2]

جدید اُردو شاعری کی ایجاد کا سہرا اگرچہ آزاد کے سر ہے لیکن صحیح طور پر یہ شرف حالی کو پہنچتا ہے جنہوں نے ایک سچے پیغام کو شاعر کی طرح اپنی شاعری کی بدولت اپنی منزل اور گری ہوئی قوم کی تمدن و معاشرت اور اخلاق حتیٰ کہ ادبیات تک کی اصلاح کا زبردست کام انجام دیا۔ لیکن ان کی دور قدیم کی شاعری کے مقابلے میں ان کی جدید شاعری پر نقادانِ سخن "شاعری" کا اطلاق صحیح نہیں سمجھتے۔ مسدس حالی کی احمقانہ تردیدوں اور ان کے خلاف اوباشانہ پھبتیوں اور رندانہ آوازوں سے قطع نظر کر کے نیز زبان دمحاورات اور روزمرہ و متروکات کی بحث کو چھوڑ کر اہل علم کے طبقہ میں سخن فہمی کا صحیح مذاق رکھنے والوں میں جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے مولانا حالی کا جدید طرز سخن مقبولیت کی نظر سے نہیں گیا۔ میری ناقص رائے میں تو جس

---

[1] مجموعہ نظم بینظیر دیباچہ ص ۴، [2] مجموعہ نظم بینظیر دیباچہ ص ۳۔

طرح مولانا حالی کی نثر موزونیت الفاظ ندرت وقوت بیان اعلےٰ سلیقۂ اظہار خیال کے لحاظ سے مولانا شبلی کی نثر کے مقابلے میں بلند نہیں ہے اس طرح ان کی جدید شاعری بھی زور بیان غلو جذبات اور کیفیات شاعری کے لحاظ سے مولانا شبلی کی شاعری کے مقابلہ مین پھیکی اور کم رتبہ ہے اس لئے یہ کہنا بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی کی شاعری میں جس بات کی کمی رہ گئی تھی شبلی نے اس کی تلافی کر دی۔ اس معاملہ میں ایک کہنہ مشق ادیب اور سخن فہم بزرگ کی رائے ہے کہ حالی کی شاعری سوائے ان کے محدود حلقۂ احباب کے عام طور پر قبول نہیں ہوئی۔ ادیب شہیری مہدی حسن جو حالی اور شبلی دونوں کے مرتبہ داں تھے اپنے ایک مضمون کے دوران میں فرماتے ہیں۔

"اگر اشعار کی لطافت اور خوبی ایک وجدانی چیز ہے اور اس کا سمجھنا ذوق صحیح پر منحصر ہے اور ان خوبیوں کو دکھانا بڑے اہل کمال کا کام ہے تو میں خوش ہوں کہ شبلی حضرت حالی کے حریف مقابل نہ سہی تاہم وہی شاعری کے ملکہ راسخہ اور ادنےٰ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے اتنی اونچی سطح پر ہیں کہ بڑے بڑے مستشرقین یورپ بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔" [۱]

یہ خیال بہت بڑی حد تک صحیح ہے کہ اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اُردو شاعری اور صرف شاعری کے لئے وقف ہو جاتے تو وہ حالی سے بہت آگے نکل جاتے۔ ان میں ایک شاعر کی تمام قابلیتیں قدرت کی طرف سے ودیعت تھیں۔ اگر یہ دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے۔[۲] یہاں ہم کو ان لوگوں کے خیالات سے بحث نہیں ہے جو ان بچوں کی طرح جو ہر خوبصورت کھلونے پر مچل جایا کرتے ہیں۔ ہر پسندیدہ مجموعۂ اشعار کو "الہامی کتاب" کہہ دینے میں تامل نہیں کرتے۔ بلکہ جن لوگوں نے سنجیدگی سے

---

[۱] افادات مہدی ص ۱۶۳ — ۱۶۴ [۲] مجموعہ کلام شبلی کا دیباچہ از مولوی ظفر الملک۔

ادب اور شعر کے مفہوم کو سمجھ کر اس کا بغور و تفحص مطالعہ کیا ہے ان کی رائے اس معاملہ میں بہت کچھ قابل وقعت و الا اعتنا ہو سکتی ہے "جدید اردو شاعری" کے مصنّف نے بالکل صحیح کہا ہے۔ بعض نقاد حالی کی شاعری کو محض "منظوم خیال" سمجھتے ہیں[1] حالی کی جدید شاعری کو صحیح معنوں میں "شاعری" تسلیم نہ کرنے اور شبلی کی شاعری کو اس کے مقابلے میں ترجیح دینے کے وجوہات پر اردو کے ایک جدید مگر کم مشہور نقادِ ادب کی رائے خاص طور سے قابل ذکر ہے لکھتے ہیں۔

"صحیح شاعری تو وہ ہے جو حقائق کو رنگینیوں سے اس طرح لبریز کر دے کہ ہر شعر اپنے علم کی لطافت میں قرآن کی ایک آیت اور اپنے عمل کی وسعتوں میں حدیث کا ایک ٹکڑا بن جائے حقیقتیں مذہب و ملت کی پابند نہیں رہتیں ایک حقیقی شاعر کا یہ فرض نہیں کہ کسی مذہب یا کسی نظام اخلاق کے ایک ایک جزو کو صراحتاً بیان کرے اس کے لئے "راہ نجات" اور "بہشتی زیور" کافی ہیں۔ صحیح مذہب وہ ہے جو ناقابل برداشت نہ ہو اور صحیح اخلاق وہ جو حقائق کی مشکلات کو تخیل کی رنگینیوں اور تصور کی لطافتوں سے آسان کر دے۔ اس کا یہ منصب نہیں کہ یتیم خانوں اور حاجیوں کی آمد پر اپنی صلاحیتوں کو قربان کر دے۔ ایسی شاعری سے خاموشی بہتر ہے۔ اگر اس مسئلہ کو آپ مثال سے واضح کرنا چاہتے ہیں تو مولانا شبلی پر نظر کیجئے ان کی اردو شاعری زیادہ تر روزمرہ کے واقعات سے متعلق ہے لیکن ان کا شعر حقیقتاً شعر ہوتا ہے۔ ناقابل برداشت نظم نہیں ہو جاتا۔ اگر وہ کبھی اخلاق کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو اس لطیف انداز سے کہتے ہیں کہ وہ ناصح کی بے مزہ اور تکلیف دہ مصیبت نہیں بن جاتی جو بجائے اصلاح کرنے کے انسان کو اور مشتعل کر دے۔ حالی اپنی سعیٔ اصلاح میں خشک ہو کر رہ گئے ورنہ حالی وہ بھی تھے جنہوں نے یہ شعر کہا تھا۔

تعزیز جرم عشق ہے بے صرف محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

---

[1] جدید اردو شاعری از مسٹر عبدالقادر ص ۱۳۸۔

حقیقت یوں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔"

مجھے حالی کی شخصیت سے کوئی کاوش نہیں اردو شاعری میں ان کا مرتبہ بلند ہے لیکن اس اعتراف کا یہ تقاضا نہیں کہ میں ان کی شاعری کے ہر دور کو تسلیم کر لوں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ وعظ و تلقین کے سلسلے میں انہوں نے جس قدر شاعری کی وہ سعیٔ لاحاصل سے زیادہ نہیں۔ انہیں مسائل کو وہ نثر میں ادا کر سکتے تھے اور کامیابی کے ساتھ۔ نظم کی زحمت انہوں نے ناحق گوارا کی؛ لیکن استخواں پرستی کا قائل نہیں کہ ہر اس پیغمبر سخن کو شاعر سمجھوں جس کے ہر لفظ کو جہلا وحی والہام سمجھتے ہیں۔ میں تو اس حالی کا قائل ہوں جس نے "مقدمہ" کے قبل شاعری کی اور شاعری کے بعد مقدمہ لکھا۔ وہ شاعری جو اصلاح کرنا چاہتی ہے اخلاقی حیثیت سے ممکن ہے خوب ہو مگر شاعری نہیں"

اسی خیال کا جو سطور بالا میں بیان ہوا اعادہ کرتے ہوئے ہمارا شعلہ بیان انشا پرداز مہدی لکھتا ہے۔[1]

"حالی کو میں ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا جو ان کو اچھا شاعر سمجھتے ہیں۔ مگر اس استثنا کے ساتھ کہ غزل داغ کا حصہ ہے بے شک ان کی نیچرل شاعری مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ خاص کر مسدس کی بنیاد جن امور پر رکھی گئی اور میٹیریل استعمال کیا گیا ہے صرف حالی کا حصہ ہے۔ لیکن اپنا اپنا خیال ہے میرے ذہن میں حالی کی عظمت "دیوان حالی" کے اس حصہ سے ہے جو مقدمہ شاعری کی حیثیت سے لکھا گیا"

تذکرہ نویسوں کی بے اعتنائی

آخر میں اس امر کی شکایت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے زمانہ کے بعض تذکرہ نویسوں اور مؤرخین ادب نے علامہ شبلی کی شاعری کو قابل اعتنا نہ سمجھ کر ان کا

---

[1] محشر خیال از سجاد علی انصاری مرحوم صفحات ۷۳ ـ ۷۲،

ذکر ہی نہیں کیا۔ یا اگر کیا ہے تو نہایت معمولی حیثیت سے اگر اُردو میں مولانا کو ایک بلند پایہ نامور شاعر کا درجہ نہ دیا جائے محض اس وجہ سے کہ وہ "صاحبِ دیوان" نہیں ہیں یا انہوں نے اعلےٰ درجہ کی غزلیات نہیں لکھیں تو ان گمنام اور غیر معروف شعرا کو ان تذکروں میں کس لئے جگہ دی گئی ہے جنہوں نے تُک بندیوں کا ایک دفترِ بے پایاں تیار کر دیا ہے اور جو "غرقِ مئے ناب اولےٰ" کا صحیح طور پر مصداق ہے۔ شاید یہ خیال بھی ہو کہ مولانا کے دیگر کمالات علمیہ ان کے شاعرانہ کمال پر غالب آ گئے ہیں اس لئے شاعری ان کے چہرے پر نہیں کھلتی پھر یہ بھی ہو کہ ایک عالم دین ہونے اور جماعت علمار سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کو مصلحتاً شعرار کی صف میں بٹھانا پسند نہ کیا گیا ہو۔ لیکن ایک باکمال ہستی کے تمام اوصاف جب معرضِ بیان میں آئیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ہر وصف اور کمال پر نظر ڈالی جائے اور اس کے ایک ایک وصف کو نمایاں کر کے دکھایا جائے مولانا کے لائق شاگرد نے اُردو شاعری کے قدیم دَور سے لے کر عہد حاضر تک از ولی تا جوش ملیح آبادی تمام شعرار کا مستقل حیثیت سے ذکر کیا ہے[۱] مگر یہ دیکھ کر تعجب اور اس کے ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے مولانا کو مستقل شعرار کی صف میں کوئی درجہ و امتیاز نہیں بخشا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے اپنے بزرگ استاد مرحوم کو جو ایک بلند پایہ مذہبی عالم ایک مستند مؤرخ اور نامور ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے اپنے تمام معاصرین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ شعرا کی صف اوّل میں بٹھانا پسند نہ کیا ہو۔ لیکن شبلی کی شاعرانہ حیثیت مستقل اور تنہا اظہار خیال چاہتی تھی اور میرے خیال میں شعر و سخن کی دنیا میں مولانا کی یہ حق تلفی ہے جو ان کے ایک شاگرد رشید سے ہو سکتی تھی اُردو شاعری پر مولانا کا جو حق اور احسان ہے اور اس میں انہوں نے

---

[۱] شعرالہند از مولوی عبدالسلام ندوی۔

جو غیر فانی حصّہ پیش کیا ہے وہ اس سے کہیں زائد قدر و ستائش کا مستحق ہے کہ محض سرسری طور پر ان کا ذکر کیا جائے۔

اس طرح گل رعنا کے مصنّف نے بھی جن سے بڑھ کر مولانا کی اُردو شاعری کے قدر شناس اور کیا ہو سکتے ہیں۔ اپنے تذکرہ میں مولانا کا نام تک نہیں لیا۔ مزید تعجب تو اس بات پر ہے کہ تاریخ ادب اُردو میں شاعری کے ضمن میں نہایت معمولی طور سے مولانا کی شاعری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (جو اگرچہ اصل انگریزی متن میں موجود ہے مگر نہ معلوم کیوں ترجمہ ہونے سے رہ گیا) چنانچہ کتاب مذکور پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا احسان احمد صاحب احسان بالکل صحیح طور پر رقم طراز ہیں۔

"تعجب ہے کہ اس سلسلہ میں فاضل مصنّف نے علامہ شبلی کی جدید تاریخی سیاسی اور اخلاقی نظموں کو نظر انداز کر دیا۔ اگرچہ لائق مصنّف نے علامہ مرحوم کے حالات میں اسکی طرف معمولی طور پر اشارہ کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نظمیں خاص اہمیت کی مستحق ہیں۔ حالی، آزاد وغیرہ نے اُردو شاعری کے دائرہ خیال کو جس حد تک وسیع رکھا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن سیاسی اور تاریخی نظموں کو غالباً سب سے پہلے مولانا ہی نے رواج دیا علاوہ اس کے "طنز لطیف" کی آمیزش بھی مولانا ہی کا کارنامہ فخر ہے۔ یہ نظمیں دراصل اُردو شاعری کے سرمایہ سخن میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔ جس کو اُردو لٹریچر کا کوئی مورّخ آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کر سکتا۔"[1]

خمخانۂ جاوید میں بھی مولانا کی نسبت صرف چند سطروں میں اکتفا کیا گیا ہے گو مؤلف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "واقعات نویسی میں جو کمال اور سحر بیان آپکو حاصل تھا اس کی مثال پیش کرنی آسان نہیں"[2] اس طرح مولف نے صرف

---

[1] رسالہ ہندوستانی جلد ا حصّہ ۲ ص ۲۸۳ - ۲۸۲ [2] خمخانہ جاوید جلد ۴ ص ۷۵ھ - ۷۳ھ۔

چند سطروں پر ٹالا ہے۔

صاحب سیر المصنفین جو خود بھی ایک سخن فہم اور سخن سنج ادیب ہیں مولانا کو "فطری شاعر" اور "فارسی اُردو کا ایک مقبول عام اور دقیقہ رس شاعر" مان لینے کے باوجود ان کو "شاعر" نہیں تسلیم کرتے تھے فرماتے ہیں۔

"مگر پھر بھی میں کہوں گا کہ وہ شاعر نہ تھے۔ اور نہ وہ شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ علم کے عالم میں ان کی شان ایک شاعر کے درجہ سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھی"۔[1]

اگرچہ یہ "اجتماع ضدّین" ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن جو شخص ایک شاعر و عالم کے مابین موازنہ و تفریق کر سکتا ہو وہ بہرحال ایسی رائے رکھنے کے لئے ایک حد تک معذور سمجھا جا سکتا ہے۔

بمبئی ۱۰ر جنوری ۱۹۳۶ء

---

[1] سیر المصنفین جلد دوم ص ۴۰۷ - ۶۴۴۔

اسلامی ادبیات کا ناشر اعظم

منشی نول کشور

برصغیر پاک و ہند میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا آدمی ایسا ہوگا جو منشی نولکشور کے نام اور ان کے مطبع سے واقف نہ ہو۔ یوں تو ملک میں مشرقی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے سیکڑوں مطبعے قائم ہوئے لیکن مطبع نولکشور کے برابر کسی کو اس قدر شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی علوم و فنون پر بھی زوال آیا۔ حکومت اور دولت کے ساتھ علم بھی رخصت ہوا۔ صدیوں کے علمی ذخیرے برباد ہونے لگے۔ جواہرات کوڑیوں کے مول بکنے لگے۔ اس علمی سرمایہ کا کچھ حصہ ملک میں تتر بتر ہو گیا اور بہت سا غیر ممالک میں پہنچ گیا اور مسلمان اپنے آبا و اجداد کی تصانیف کی نایابی پر کف افسوس ملنے لگے۔ جو یورپ کے کتب خانوں کی زینت بن چکی تھیں۔ بقول علامہ اقبال:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

مسلمانوں میں یہ استطاعت اور ہمت تو نہ تھی کہ وہ اسلامی ادبیات کے بچے کھچے جواہر پاروں کی حفاظت کرتے اور ان کی نشر و اشاعت کے بارگراں کے متحمل ہوتے۔ ابتدا میں بعض اشخاص نے مطابع قائم کرکے کچھ نوادرات شائع کئے مگر وہ زیادہ عرصے تک ان کو نہ چلا سکے۔ یوں تو اٹھارویں صدی کے اواخر میں یکے بعد دیگرے کئی مطابع

وجود میں آئے اور مختصر کام کر کے ختم ہو گئے، لیکن کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ بزرگان سلف کی علمی میراث کو عام دسترس کے قابل بناتا۔ آخر میں یہ شرف ہندی الاصل قوم کے ایک فرد کے لئے مقدر تھا جس نے اپنے ذاتی شوق اور علم وادب کی اشاعت کی خاطر ایک ایسے مطبع کی داغ بیل ڈالی جو تقریباً ایک صدی سے اب تک جاری ہے اور آیندہ بھی اس کے جاری رہنے کی امید کی جاتی ہے۔ ذاتی منفعت کی خواہش تو ہر کاروبار میں ہوتی ہے لیکن جس قسم کا اعلیٰ اسلامی لٹریچر منشی نول کشور نے شائع کیا اس میں تجارتی منفعت کے خیال کے ماسوا خود ان کے ذاتی علمی مشاغل کو بھی بہت کچھ دخل تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ منشی صاحب نے مسلمان علماء اور ادباء و شعراء کی صحبت اور ہمنشینی سے متاثر ہو کر ملک و قوم کے فائدے کے لئے یہ زبردست خدمت اپنے ذمے لی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے نامور علماء و فضلا، شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی فرما کر ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی اور ان کی علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد دیکر ان کو تصنیف و تالیف کا زریں موقع عنایت کیا۔ اس حیثیت سے ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کی اشاعت خصوصاً اُردو ادب کی خدمت کے لئے منشی صاحب کا نام برصغیر پاک و ہند کی علمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ اسلامی علوم کے اس قدرشناس اور مسلمان اہل علم کے سرپرست کے متعلق اب تک بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت سرسری طور پر ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ سوائے ان کے مختصر "جیون چرتر" کے جو مطبع کی جانب سے دو چار ورق میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کے تفصیلی حالات کا علم نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا ہے کہ منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے منشی صاحب کی ایک ضخیم سوانح عمری تیار کی تھی جو مطبع کے قلمی کتب خانے میں موجود ہے۔

لیکن وہ غیر مطبوعہ ہے کتب خانہ مطبع کے دو وارثوں کے درمیان تقسیم ہوگیا اور تقسیم کے دوران میں جو الٹ پلٹ ہوئی ہے اس کی وجہ سے اس سوانح عمری کا پتا نہیں چلتا۔ ایسی صورت میں یہ مضمون اس خیال سے لکھا گیا ہے کہ منشی صاحب کے مطبع اور ان کے ذاتی حالات کے علاوہ ان کے علمی ذوق وشوق، اہل علم وفضل کی سرپرستی، بعض مشہور ادیبوں اور شاعروں سے ان کے دوستانہ روابط اور علوم اسلامی کی نشر واشاعت میں ان کی کوششوں کا مختصر جائزہ لیا جائے اور اسلامی ادبیات کے اس ناشر اعظم کو اور ان کی بیش بہا خدمات کو پاکستان کے عوام سے روشناس کرایا جائے۔

ذاتی حالات

منشی صاحب کے خاندانی اور ذاتی حالات خود ان کے ورثا نے مطبع نولکشور سے "جیون چرتر" نام کے ایک مختصر سے کتابچہ میں ہندی زبان اور اُردو رسم الخط میں چھپوا کر شائع کئے تھے جن کو مسٹر رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ ادب اُردو میں اور مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ نے اپنی کتاب سیر المصنّفین جلد دوم میں نقل کیا ہے[1] ذیل میں ان کے مختصر حالات اسی ذریعہ سے اخذ کر کے پیش کئے جاتے ہیں:

منشی صاحب سنہ ۱۸۹۲ سمت (بکرمی) مطابق سنہ ۱۸۳۶ء میں بستوی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے[2] ان کا آبائی وطن علی گڑھ کے قریب ایک موضع ساسنی ہے جہاں ان کے والد منشی جمنا داس بھارگو ایک خوشحال زمیندار تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے جن میں منشی نولکشور نے نام پیدا کیا اور اہل علم میں ان کا شمار ہوا۔ ابتدائی تعلیم اسی موضع ساسنی میں پائی

---

[1] تاریخ ادب اُردو حصہ دوم صفحہ ۹۹، [2] سیر المصنّفین جلد دوم صفحہ ۵۸۸ - ۵۸۷،

اس کے بعد آگرہ کالج میں پانچ برس زیر تعلیم رہے اور امتحانات پاس کئے ابتدا ہی سے ان کو مضمون نویسی کا شوق تھا، چنانچہ اخبار "سفیر آگرہ" میں مضامین لکھتے رہے۔ گورنمنٹ نے ان کی علمی قابلیت دیکھ کر ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اسی زمانے میں وہ آگرہ سے لاہور چلے گئے اور منشی ہرسکھ رائے کے مطبع کوہ نور میں ملازم ہو گئے۔ ان کے حسن خدمات سے خوش ہو کر مالک مطبع نے سب کام ان کے سپرد کر دیا۔ اخبار کوہ نور کے دفتر میں تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے فن طباعت اور اخبار نویسی کا کافی تجربہ حاصل کر لیا اور چند مدّت کے بعد وہ ملازمت ترک کر کے لکھنؤ پہنچے اور وہاں سنہ ۱۸۵۸ء میں اپنا مطبع اپنے نام سے جاری کیا۔ اس مطبع میں انہوں نے قرآن مجید کے علاوہ عربی، فارسی، اُردو، ہندی اور سنسکرت کی عمدہ اور نایاب کتابیں چھاپ کر شائع کیں۔ اس سے مطبع کی کافی شہرت ہوئی اور ملک کا ہر پڑھا لکھا شخص منشی صاحب کے نام سے واقف ہو گیا۔ ان کی ملکی خدمات کی بنا پر گورنمنٹ نے ان کو اودھ کے درباریوں میں شامل اور سی۔ آئی۔ ای کے خطاب سے سرفراز کیا۔ وہ لکھنؤ اور الٰہ آباد کی میونسپلٹیوں کے ممبر بھی رہے۔ جیل اور اودھ روہلکھنڈ ریلوے کے اعزازی انسپکٹر بھی مقرّر ہوئے اور الٰہ آباد کا گورنمنٹ پریس ان کی نگرانی میں رکھا گیا۔ امیر عبدالرحمٰن خان فرمانروائے افغانستان شاہی دربار (کورونیشن) کے سلسلے میں جب ہندوستان تشریف لائے تو منشی صاحب کو شرف باریابی بخشا اور ان کے کام کی بہت تعریف کی۔ منشی صاحب کے حسن اخلاق، مروّت، سیر چشمی اور خدمت خلق اللہ کی ان کے معاصرین اور احباب نے بڑی تعریفیں کی ہیں ان کی فیاضی اور دوست نوازی کے متعلق ایک واقعہ بعض اہل علم سے سنا گیا ہے کہ منشی صاحب کے ایک ہم سبق دوست مولوی ابوالحسن صاحب فرید آبادی مرحوم تھے جو بہت ذی علم اور صاحب تصنیف بزرگ

تھے جب منشی صاحب کے مطبع کا کاروبار پھیل گیا ان کے دوست نے ان سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے مطبع میں ملازمت میں رکھ لیں لیکن انہوں نے اس کو پسند نہیں کیا اور مولوی صاحب کا اپنے کاروبار کے منافع میں ۲ر آنے یا کچھ حصہ مقرر کر دیا۔ مولوی صاحب کے عین حیات تک تو ان کو ہر سال اپنے حصہ کی رقم مل جایا کرتی تھی۔ ان کے بعد ان کے ورثار کو کچھ معلوم نہ تھا اس لئے ان میں سے کبھی کسی نے تقاضا نہ کیا۔ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کے ورثار ایک مرتبہ سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے اور کہیں سے کوئی صورت امداد کی نہ تھی۔ ادھر کئی سال سے مطبع کے حسابات میں ان کے حصہ کی جو رقم تھی وہ بہت زیادہ ہو گئی تھی جو ان کو بھیجی گئی۔ اس طرح غیر متوقع طور پر کئی ہزار روپیہ ان کو وصول ہو گیا [1]

منشی صاحب نے ۵۹ برس کی عمر میں سمت ۱۹۵۱ مطابق ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا اور ۵۵ ہزار روپے کا زرخیز علاقہ وقف کر گئے۔ وفات کے وقت انہوں نے تقریباً ایک کروڑ روپیہ کی جائداد اور کاروبار چھوڑا۔ ان کے بعد ان کے لائق فرزند رائے بہادر منشی پراگ نرائن آنجہانی نے ادب اردو و ہندی کی بڑی خدمت کی ان کے بعد ان کے ہونہار فرزند منشی بشن نرائن صاحب بھارگو اپنے والد کے قدم بقدم چلے اور ان کے بعد راجہ رام کمار اس وقت مطبع نولکشور کے مالک ہیں اور اپنے جد امجد کے نقش قدم پر چل کر مطبع کی تجدید و توسیع میں مصروف ہیں اور اسلامی مطبوعات کی دوبارہ اشاعت کر کے منشی نولکشور آنجہانی کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔

مطبع نولکشور ۱۸۵۸ میں یہ مطبع لکھنؤ میں قائم ہوا تھا اور اب تک جاری ہے اس مطبع نے اسلامی علوم و فنون اور

---

[1] مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی اس واقعہ کے معتبر راوی ہیں۔

ادبیات کی جو خدمات انجام دی ہیں اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اس مطبع نے کیا کیا اور کتنی کتابیں چھاپ کر شائع کیں ان کی تفصیل ملنی دشوار ہے۔ تاہم اس مطبع نے گزشتہ ۹۵ سال میں جتنی کتابیں شائع کی ہیں اتنی شاید ہی ہندوستان کے کسی مطبع میں چھپی ہوں۔ عربی، فارسی اور اُردو کی درسی کتابیں عربی میں تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، حکمت، طب کی مشہور اور نصابی کتابیں اس مطبع نے چھاپی ہیں۔ فیضی کی مشہور بے نقط تفسیر سواطع الالہام اگر اس مطبع میں نہ چھپتی تو وہ گوشۂ گمنامی میں پڑی رہتی۔ اسی طرح ملّا جیون کی تفسیرات احمدیہ کو بھی اسی مطبع نے شائع کیا ہے۔ مولوی امیر علی مرحوم کی تفسیر مواہب الرحمٰن کی ۳۰ ضخیم جلدیں یہی مطبع شائع کر سکتا تھا۔ حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کی فارسی شرح مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، فقہ کی ضخیم کتابیں ردالمختار اور فتاوی عالمگیری وغیرہ انہی مطبوعات میں شامل ہیں۔ فارسی میں شعرائے فارسی کے دواوین اور منشآت کی بے شمار کتابوں کے علاوہ تاریخ کی نادر اور نایاب کتابوں کی نشر و اشاعت اسی مطبع کا قابل فخر کارنامہ ہے۔ اس سلسلہ میں سہ دفتر ابوالفضل، آئین اکبری، اکبرنامہ، تاریخ فرشتہ، سیرالمتاخرین، تاریخ ٹاڈ راجستان تو اریخ راجگان اودھ، صحیفۂ زرین وغیرہ اُردو کی داستانوں اور افسانوں میں داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش رُبا کی ضخیم جلدیں بوستان خیال، فسانۂ آزاد اور بے شمار افسانے، قصے، ناول، طب، کیمیا، نجوم جفر، رمل کی سیکڑوں کتابیں اسی مطبع کی پیداوار ہیں۔

درسی، نصابی اور بے شمار مذہبی اور قانونی کتابوں کے علاوہ مختلف فرقوں امامیہ اہل تسنن، اہل حدیث، ہندو دھرم شاستر وغیرہ کی کتابیں بھی کثیر تعداد میں چھپتی رہی ہیں۔ اس مطبع نے قرآن مجید کی طباعت کا خاص اہتمام کیا اور اس کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اس کتاب مقدس کی طباعت میں ادب و طہارت اور احترام کا ایسا اہتمام رکھا جسکی نظیر اسلامی

مطابع میں بھی ملنا مشکل ہے۔ اس مطبع کی کتابوں کی مانگ ممالک اسلامیہ اور روسی اور چینی ترکستان تک سے آتی تھی اور آج بھی مصر و عراق ایران افغانستان، پاکستان اور دیگر ممالک میں اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابوں کی مانگ ہے۔ دنیا کے کسی حصّہ میں بھی مطبوعہ اسلامی لٹریچر کا کوئی کتب خانہ نولکشور پریس کی مطبوعات سے خالی نہ ہوگا۔

غدر کے بعد جبکہ لکھنؤ اور اودھ کے شریف مسلمان گھرانے تباہ و برباد ہو گئے تھے اور پڑھے لکھے لوگ مارے مارے پھرتے تھے تو اسی مطبع نے ان سب کو بڑا سہارا دیا اور سیکڑوں اشخاص کو کام پر لگایا اس مطبع میں مشہور اور نامور اہل علم تصحیح اور کتابت کے کام پر مامور تھے اور یہ منشی صاحب کی علم دوستی اور معارف پروری تھی کہ انہوں نے قابل ترین علما، ادبا، شعرا اور خوشنویسوں کو جو بیکار اور تنگی معاش سے پریشان حال تھے اپنے مطبع میں جگہ دی۔ سید غلام حسین قدر بلگرامی جو فارسی کے بڑے نامی ادیب انشا پرداز اور مرزا غالب کے شاگرد اور کئی کتابوں کے مصنّف تھے اسی مطبع کے زمرۂ ملازمین میں منسلک تھے اور تصحیح کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اُردو کے نامور شاعر منشی امیر اللہ تسلیم اس مطبع میں کاپی نویسی پر مامور تھے[1] ان کے علاوہ اور بھی کئی حضرات تھے جن کے نام معلوم نہ ہو سکے۔

اس مطبع کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی اور اس کی مطبوعات مصر و یورپ تک جاتی تھیں۔ مشہور مستشرق اور اُردو زبان کے دلدادہ پروفیسر گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں اس مطبع کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اودھ اخبار کا ذکر کرتے ہوئے فرانسیسی فاضل رقم طراز ہے:

---

[1] تذکرۂ کاملان رامپور از مولوی احمد علی شوق رامپوری صفحہ ۶۵۔

"اس (اودھ اخبار) میں انجمن آگرہ کے متعلق حالات درج ہوتے ہیں"
"اس انجمن کا نصب العین یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کو اہلِ ہند میں رواج دے"
منشی نولکشور بھی اس انجمن کے رکن ہیں جو لکھنؤ کے مشہور مطبع کے مالک ہیں جہاں سے اودھ اخبار شائع ہوتا ہے"[1]

ایک اور جگہ لکھتا ہے:-

"مسٹر بیمز نے از راہ عنایت مطبع نولکشور کی مطبوعات کی فہرست بھیجی ہے۔ اس مطبع کے مالک اودھ اخبار کے مدیر ہیں۔ اس فہرست میں چھ سو کتابوں کے قریب مذکور ہیں"[2]

اس مطبع کی تعریف و توصیف میں تمام اہلِ علم رطب اللسان ہیں اور اس کی علمی خدمات کے معترف سنہ ۱۹۳۹ء میں علامہ سید سلیمان ندوی ہندوستان کے مطابع کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"سب سے آخر لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسی کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس سے میری مراد لکھنؤ کا مشہور نولکشور پریس ہے۔ یہ غدر کے بعد سنہ ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا۔ ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی مطبع سے چھپ کر نکلیں۔ شعرا کے دواوین مثنویاں، قصائد، مرثیے، قصے، افسانے، داستانیں اور

---

[1] خطباتِ گارساں دتاسی (اُردو ترجمہ مطبوعۂ انجمن ترقی اُردو) صفحہ ۴۷۲۔
[2] خطباتِ گارساں دتاسی صفحہ ۶۲۵۔

درس عام کی کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں، تاہم غلط نویسی اور غفلت جو کثرت کا نتیجہ ہے، اس کی شہرت کے چہرے کا بدنما داغ ہے۔ شعرائے قدیم میرؔ، سوداؔ، ناسخؔ، آتشؔ مصحفیؔ، انشاؔ، رندؔ، وزیرؔ، صباؔ، انیسؔ، دبیرؔ، میر مونسؔ، اسیرؔ اور امیرؔ وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے اور ملک کے گوشے گوشے میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے"۔[1]

سیّد صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے کہ اس مطبع کی کتابیں، خصوصاً فارسی عربی کی درسی کتابیں جو چھپی ہیں ان میں کافی غلطیاں پائی جاتی ہیں، لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ سیکڑوں کتابیں جو بالکل نایاب تھیں یا جن کو کوئی چھاپتا نہ تھا، اس مطبع کی بدولت شائقین علم و ادب کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں اور اس طرح محفوظ ہو گئیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ کتابت اور لیتھو کی طباعت میں مکمل صحت کا التزام قریب قریب ناممکن ہے پھر قلمی کتابوں کو صحیح طور سے نقل کر کے یا ایڈیٹ کر کے شائع کرنے کا رواج نہ تھا اس سے اکثر مخطوطات جو غلط سلط لکھے ہوئے تھے وہ ویسے ہی چھپ گئے۔ مصححین نے تاحد امکان و قابلیت ان کی تصحیح کی، لیکن جب ایک کتاب کے زائد نسخے نہ ہوں تو تصحیح کا کام بڑا دشوار ہو جاتا ہے۔ ان تمام وجوہ پر غور کیا جائے تو مطبع کی شہرت کے چہرے کا داغ بہت ہلکا نظر آئے گا۔ گذشتہ پچیس تیس برس میں بہت سی کتابیں اس مطبع نے بڑے اہتمام سے شائع کی ہیں، جن میں کلیات میرؔ کلیات سوداؔ، ہماری شاعری، وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور ان میں صحت

---

[1] نقوش سلیمانی صفحہ ۸۷ (مطبوعہ سنہ ۱۹۳۹ء)

کا کافی اہتمام نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اُردو کتابوں کی نشر و اشاعت میں اس مطبع کے برابر کسی نے حصہ نہیں لیا۔ اس کے احسانات اُردو زبان پر بہت ہیں اور جب تک یہ زبان زندہ رہے گی، منشی نولکشور اور ان کے مطبع کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اودھ اخبار

سنہ ۱۸۵۰ء میں لاہور سے اخبار کوہ نور جاری ہوا۔ یہ پنجاب کا اوّلین اخبار تھا۔ سنہ ۱۸۵۸ء تک منشی صاحب اس اخبار کے عملے میں کام کرتے تھے۔ کوہ نور کے دفتر میں پریس اور اخبار چلانے کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد منشی صاحب نے اسی سال اپنا مطبع لکھنؤ میں قائم کیا اور وہاں سے اودھ اخبار ہفتہ وار جاری کیا جو سنہ ۱۸۷۴ء میں روزانہ ہوا۔ یہ اپنے صوبے کا یا بقول پنڈت کیفی صاحب کل اُردو دنیا کا پہلا روزنامہ ہے۔ اُردو کا مشہور فسانۂ آزاد اسی اخبار کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ ملک کے بعض قابل اور نامور اہلِ قلم اس اخبار کی ادارت کرتے رہے مثلاً مولوی غلام محمد تپش تلمیذ غالبؔ، مولوی سید احمد علی اشہری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شررؔ[1]، منشی نوبت رائے نظرؔ، میرزا حیرت

---

[1] مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ لکھنوی کو سنہ ۱۸۸۱ء میں منشی صاحب نے ۳۰ روپے ماہوار پر اودھ اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا تھا۔ دو سال بعد منشی نولکشور نے مولانا کو خاص نامہ نگار بنا کر ریاست حیدر آباد دکن میں بھیجا۔ وہاں اخبار ہزار داستان کی ایڈیٹری ان کو پیش کی گئی، چنانچہ وہ اس شرط پر راضی ہو گئے کہ واپس لکھنؤ جا کر اودھ اخبار کی ملازمت سے مستعفی ہوں اور پھر وہاں سے حیدر آباد جائیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھنؤ واپس جا کر اودھ اخبار سے قطع تعلق کر لیا، مگر مطبع کے حسابات کا تصفیہ نہ ہونے پایا تھا کہ ہزار داستان بند ہو گیا اور مولانا کو حیدر آباد جانے کی ضرورت نہ رہی۔ (سیر المصنّفین جلد ۲ صفحہ ۵۸۷-۵۸۹)

دہلوی، جالب دہلوی، میرزا یاس عظیم آبادی، شوکت صاحب تھانوی، مرزا محمد عسکری اور مسٹر پیارے لال شاکر وغیرہم[1] اودھ اخبار اپنے سنجیدہ سیاسی، علمی و ادبی مضامین کی وجہ سے بہت مقبول ہوا اور اس نے طویل عمر پائی۔ اُردو کے اخباروں میں شاید ہی کوئی اخبار اس عمر کو پہنچا ہو۔

اس اخبار کے متعلق رام بابو سکسینہ اپنی "تاریخ ادب اُردو میں لکھتے ہیں:

"اودھ اخبار کا شمار صوبۂ اودھ کے اعلیٰ درجہ کے اور مشہور اخباروں میں ہے۔ شروع میں جب منشی صاحب موصوف کے زمانے میں یہ اخبار نکلتا تھا تو یہ زیادہ تر اُن خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخباروں کے تاروں یا نوٹوں سے ترجمہ کر کے چھاپی جاتی تھیں اور اس کی کوئی معیّنہ پالیسی بھی نہ تھی سوائے اس کے کہ سیاسی شورش کے یہ ہمیشہ خلاف رہا۔ پہلے ہفتہ وار تھا بعد کو روزانہ ہو گیا۔ اس کا ساز و سامان اور اسٹاف اعلیٰ درجے کا تھا"[2]

اہل علم سے تعلقات

منشی صاحب کو علم و ادب سے جو دلچسپی اور شغف تھا اس لحاظ سے نیز ان کے مطبع اور علمی و ادبی کتابوں کی نشر و اشاعت کی بنا پر اکثر اہل علم سے ان کے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں سے اُن کی خط و کتابت رہتی تھی اور وہ ان کی علمی صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے۔ منشی صاحب کو علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے خاص دلچسپی تھی اور وہ مدرسۃ العلوم کے پُر جوش حامی تھے۔ اس وجہ سے سر سید اُن سے بہت خوش تھے

---

[1] "اب سے آدھی صدی پہلے کے "اُردو اخبار" از پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی مطبوعۂ رسالہ اردو ستمبر ۱۹۳۴ء"

[2] تاریخ ادب اُردو حصہ دوم صفحہ ۹۶۔

چنانچہ مدرسۃ العلوم کے قیام کے زمانے میں ملک کے جن اخبارات نے اُس کی حمایت اور تائید میں مضامین لکھے تھے ان میں منشی صاحب کے اودھ اخبار کا خاص حصّہ تھا۔ ان اخباروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سرسید رقم طراز ہیں:

"ہمارے ملک کے بہت سے نامی اخباروں نے ہمارے ساتھ صرف اپنی خیر خواہی اور پیٹریاٹزم کے جوش سے ہمدردی بھی کی ہے۔ پس ہم ان اخباروں کا اور اُن کے اڈیٹروں کا جن میں سے ہم کو پنجابی اخبار لاہور اور کلکتہ اُردو گائیڈ اور پٹیالہ اخبار اور علی گڑھ سین ٹیفک سوسیٹی اخبار اور اودھ اخبار کا نام لینا چاہیئے، دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ درحقیقت ہم اودھ اخبار کے اس آرٹیکل کے جو اُس کے ایڈیٹر عالی قدر نے نہایت نیکی اور صاف دلی محبت قومی سے اپنے اخبار مطبوعہ ۲۱ جنوری ۱۸۷۳ء میں چھاپا ہے، بہت کچھ ممنون ہیں"۔[1]

اسی مضمون میں سرسید لکھتے ہیں:

"اودھ اخبار اور اس کے مالک اور شفیق ایڈیٹر صاحب دل و جان سے مدرسۃ العلوم کے حامی ہیں۔ ان کے شکریہ میں یہی کہنا بس ہے کہ ہم ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے"۔[2]

اودھ اخبار نے 'مسلمانوں کی تہذیب' پر نواب محسن الملک کا ایک مضمون جو تہذیب الاخلاق میں چھپا تھا، نقل کیا، چنانچہ ۱۲۹۰ھ کے اختتام اور شروع سال ۱۲۹۱ھ کے فاتحہ میں سرسید لکھتے ہیں:

---

[1] مجموعہ مضامین سرسیّد (تہذیب الاخلاق) جلد دوم ص ۴۸۴۔
[2] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۵۶۲۔

"ہمارے ہمعصر اڈیٹر اودھ اخبار نے اس کی ویسی ہی قدردانی کی ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ ہم کو نہایت فخر ہے کہ ایسا عالی مضمون ہمارے اس ناچیز پرچہ کے ذریعہ سے مشتہر ہوا، جو ہماری قوم کی اگلی حالت کو یاد دلاتا ہے اور پچھلی حالت بتا کر شرمندہ کرتا ہے۔"[۱]

منشی صاحب نے مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ کو ۱۸۸۱ء میں تیس روپے ماہوار پر اودھ اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا تھا اور وہ دو سال تک اسی اخبار کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ ان مضامین میں ایک مضمون 'روح' پر مولانا نے لکھا تھا۔ اس کو پڑھ کر سرسید نے منشی نولکشور کو اس مضمون کا خط لکھا کہ 'اودھ اخبار میں روح پر جو مضمون چھپا ہے بہت اعلیٰ درجے کا ہے، میں اپنی تفسیر میں اس کے چند خیالات کو لینا چاہتا ہوں لہٰذا ان صاحب سے جن کا وہ مضمون ہے مجھے اخذ کرنے کی اجازت دلوا دیجیے'، چنانچہ منشی صاحب نے مولانا سے دریافت کر کے سید صاحب کو ان کی خواہش کے مطابق اجازت دے دی[۲]۔

مرزا غالبؔ سے تعلقات

مرزا غالبؔ کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان تعلقات کی ابتدا مرزا صاحب کی بعض تصانیف کی مطبع نولکشور میں اشاعت کے باعث ہوئی اور رفتہ رفتہ آپس کے یہ تعلقات اور وسیع ہوتے گئے۔ مرزا صاحب منشی صاحب سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ اُن کے حسن سیرت اور حسن صورت دونوں کے قائل اور مداح تھے اور وہ اپنے خطوط میں اُن سے گہری محبت اور دلی اُنس کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مکتوب بنام مردان علی خاں رعناؔ میں لکھتے ہیں:

---

[۱] مجموعہ مضامین سرسید ص ۴۸۸۔ [۲] سیر المصنفین ج ۲۔ ص ۵۸۷۔

"منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت اور خوش سیرت سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں تمہارے مداح اور میں ان کا ثناخواں" ۱؎

۱۔ مرزا علاؤ الدین خان بہادر کے نام مکتوب مورخہ ۳ر دسمبر ۱۸۶۳ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خان سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے گویا بجائے خود قران السعدین ہیں۔ میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت ۵۰ مان لئے تھے۔ اب جو ان سے ذکر آیا تو انہوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار یعنی قبول کی یعنی ۱۲-۳ فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے ۳۲ آٹھ آنے میں دول اور ۳۲ آٹھ آنے تم دو۔ ہمگی ۶۵ مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔" ۲؎

۲۔ اس کے چند روز بعد انہی مرزا علاؤ الدین خان کو لکھتے ہیں:

"پانچواں دن ہے کہ منشی نولکشور بہ سواری ڈاک رہگزائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں گے یا آج پہنچ گئے ہوں گے۔ آج روز یکشنبہ ۱۳ر دسمبر کی ہے۔ ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار شہاب الدین خان بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر میں دنیادار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا۔ مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا

۱؎ اردوئے معلی ص ۱۲۴ (طبع ۱۸۶۹ء) ۲؎ اردوئے معلی ص ۴۰۵۔

روزینہ دار ہوں، ساڑھے باسٹھ روپے یعنی ۷۵۰ سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رامپور سے اور چوبیس روپیہ سال ان مہاراج سے، توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے، مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیا کرتا ہوں۔" [۱]

۳۔ اپنے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط مورخہ ۲ فروری ۱۸۶۵ء میں لکھتے ہیں:۔

"ہم تو آپ کو سکندر آباد قانون گویوں کے محلہ میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راجہ مانسنگھ کی حویلی مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدار یہ حقہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نولکشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا منشی صاحب کو میرا سلام کہنا"۔ [۲]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے بعض احباب اور شاگردوں سے بھی منشی صاحب کے دوستانہ روابط تھے جن سے منشی صاحب کے اہل علم اور شعرا سے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

۴۔ منشی صاحب سے مرزا کو جو اُنس و اتحاد تھا اس کے ثبوت میں مرزا کا وہ خط پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کے دہلی میں تشریف لانے اور ۱۳؍ مارچ ۱۸۶۳ء کو مرزا صاحب کو خلعت عطا کرنے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"منشی صاحب جمیل المناقب جناب منشی نولکشور صاحب کو دولت واقبال وجاہ وجلال روز افزوں نصیب ہو۔ چونکہ احباب کامیابی وشادکامی سے شاد ہوتے ہیں اس واسطے مجھے ان

---

[۱] اردوئے معلیٰ ص ۴۳۳۔ [۲] اردوئے معلیٰ ص ۱۱۰۔

دونوں یاوری اقبال سے ایک امر خوشی کا پیش آیا ہے آپ کی خوشی کے واسطے لکھتا ہوں بلکہ نظر باہمدگر کے اتحاد کے تم کو تہنیت دیتا ہوں۔

آپ کو مبارک ہو کہ آخر ماہ گزشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلی القاب لیفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دہلی میں تشریف لائے تو سہ شنبہ کے دن ۳۱ر مارچ ۱۸۶۳ء کو اس گمنام گوشہ نشیں کو یاد فرمایا اور از راہ بندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا۔ سبحان اللہ جو لوگ متعلق ہیں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سے وہ قسمتوں کے کتنے اچھے ہیں۔ جناب نواب معلی القاب کے مکارم اخلاق وہ روح فزا کہ جس سے مردہ زندہ ہو جائے صاحب والا مناقب تامس ڈگلس فورسائتھ صاحب بہادر سکرٹر کے کلمات شفقت آمیز وہ روح آسا کہ جس کو سن کر بیمار شفا پاتے ہیں: میں شاد ماں آیا، بلکہ بوڑھا گیا جوان آیا۔

وزیرے چنیں شہر یارے چناں
جہاں چوں نہ گیرد قرارے چناں الخ "[1]

یہ خط ۲۵ر اپریل ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں چھپا تھا۔

۵۔ انہی گہرے مراسم کی بنا پر مرزا صاحب جو فرمائشیں منشی صاحب کو کرتے تھے وہ پوری ہوتی رہتی تھیں۔ اس سے منشی صاحب کی دوست نوازی اور وسعت اخلاق کا اظہار ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے ایک مرتبہ اپنے شاگرد سید غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھا کہ:

"صاحب تم بہت دن سے بیکار ہو۔ ایک جگہ مساعدت

---

[1] خطوط غالب ج ۲ ص ۳۸۵-۳۸۴۔ مرتبہ مولوی غلام رسول مہر صاحب۔

روزگار کی صورت ہے تم بے تکلف میرا یہ رقعہ مہری لے کر لکھنؤ چلے جاؤ مطبع اودھ اخبار میں میرے شفیق دلی یعنی منشی نولکشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ ان کو پڑھوا دو، اپنی نظم ونثر ان کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم ان پر ظاہر کرو۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کارگزار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمہارے سپرد کر دیں گے۔ مشاہرہ خاطر خواہ تم کو مقرر ہو جائے گا۔ معزز و مکرم رہو گے، زندگی کا لطف اٹھاؤ گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جلد چلے جاؤ۔ لکھنؤ تم سے نزدیک ہے۔ اتنی راہ کا قطع کچھ دشوار نہیں اگر نوکر نہ ہو جاؤ گے پھر چلے آنا، قسمت آزمائی ہے'' [1]

بعد کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب نے غالبؔ کی سفارش پر قدرؔ بلگرامی کو اپنے مطبع میں نوکر رکھ لیا چنانچہ قدرؔ مرحوم نے کچھ روز وہاں مصحح کی خدمات انجام دیں۔

۶ ۔ مرزا غالبؔ کا کلیاتِ فارسی سب سے پہلے منشی صاحب نے سنہ ۱۸۶۳ء میں منگایا اور اسے اپنے مطبع میں شائع کیا۔ چنانچہ مرزا صاحب سید بدرالدین احمد المعروف بفقیر کو لکھتے ہیں:

وہ فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا۔ مگر ہاں سال گزشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین کو لکھ کر کلیاتِ فارسی جو ضیاء الدین خان نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس فرد ہیں۔ کوئی مصرع میرا اس سے خارج نہیں۔ اب سنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپیہ کی فکر میں ہوں ہات آجائے

---

[1] خطوط غالب، مرتبہ مہیش پرشاد ص ۱۹۰۔

• تو ۵۶ (روپے) بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔ جب آجائیں گی ایک آپ کو بھیج دوں گا۔" [1]

اس سے پیشتر مرزا کا کلیاتِ نثر بھی منشی صاحب نے اپنے مطبع سے شائع کیا تھا جو بڑی تقطیع پر خوش خط چھپا ہے۔ اس کے شروع میں "گزارش" کے عنوان سے منشی صاحب نے فارسی میں مختصر سا دیباچہ لکھا ہے جس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

گزارش

بر ضمائر خورشید نظائر، ارباب علم و کمال و مرآت خواطر، دبیران عطارد مثال مخفی و مستتر مباد کہ از دیر باز چناں بدل داشتم کہ کلیات نثر جناب مستطاب عالی خطاب معلی القاب مہر نیمروز آسمان ریاست ماہ نیم ماہ برج امارت، حاتم سخا دریا عطا نہنگ بحر جلالت جوہر تیغ شجاعت افصح الفصحا وابلغ البلغا شیر بیشۂ سخنوری نوی بخش زباں دری مضمون آفریں بے عدیل دبیر عطارد تحریر شاعر نامی و جلیل محسود شعرائے زماں علامہ دوراں رفیع المراتب عظیم المناصب حضرت نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسد اللہ خان بہادر متخلص بہ غالب سلمہ تعالیٰ را کہ چوں شاہد شیریں ادا عزیز دلہائے جوہر شناساں و مطبوع طبائع [illegible] سنجان است طبع نمایم واز روائح و فوائح آں گلِ سر سبد گلستان فصاحت و بلاغت مشام جان خود بل ہم شائقاں را معنبر و معطر سازم، مصرع

کہ حلوا بہ تنہا نہ بایست خورد

از انجا کہ ہر سہ نثر جناب نواب صاحب موصوف یعنی پنج آہنگ و مہر نیروز

---

[1] اردوئے معلیٰ ص ۱۳۰۔

ودستنبو درشش جہت کالشمس فی النصف النہار محتاج اظہار او صاف نیست اگر ہوس است بوصفش ہمیں قدر بس است۔ (مصرع)

حاجت مشاطہ نیست روے دلا رام را

الحمدللہ والمنۃ کہ مرادم از قوۃ بفعل آمد وانطباعش موجب از دیاد افتخار در ہمعصراں گردید لیکن در ایلمے کہ طبع می شود از مدے چند مزورت اکثر اوقات عزیز باسفار دہلی و آگرہ و میرٹھ و کلکتہ و کانپور وغیرہا گذشت اہتمامے و انتظامے کہ مکنون خاطر بود بظہور نرسید و معشوقۂ تمنا از کتم عدم بمنصۂ شہود نخرامید ازانجا کہ بیمن نام نامی و برکت اسم گرامی حضرت استادی ممدوح الصدر کہ وصفش قطعہ مولوی شاہد معجز کلامیش ہست قطعہ:۔

از سر انصاف مُنّصف را نشاید درگذشت
حق تعالیٰ رتبہ انصاف بالا کردہ است
پارسیٔ مردہ را بخشید جانِ تازہ
غالبؔ معجز بیاں کارِ مسیحا کردہ است

یقین میدانم کہ ایں نقش اوّل خریداراں را چوں ہدیۂ گل از دست یکے بدست دیگرے خواہد رسید و کلیاتِ نظم جناب ممدوح کہ عنقریب مطبوع خواہد شد در صورت خوش خریداری حضرات شائقاں ہمیں کلیاتِ نثر کلیاتِ نظم لباس انضمام وانطباع خواہد پوشید فقط

العبد

راقم نیاز مند نولکشور مالک مطبع اودھ اخبار۔

اس دیباچہ میں مرزا کے کلّیاتِ نظم کی اشاعت موعودہ کا ذکر ہے۔ اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ منشی صاحب کے دل پر غالبؔ کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا ہے اور وہ ان کی مدح میں نہایت جوش وخروش

کے ساتھ رطب اللساں ہیں، اسی میں وہ ان کو اپنا "استاد" بھی لکھتے ہیں۔ غالباً جوش عقیدت میں لکھ گئے ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب کے تعلقات بسلسلۂ اشاعت کتب دربار رامپور سے بھی تھے اور غالباً انہوں نے اپنی دختر کی شادی کے سلسلہ میں کوئی دعوت نامہ نواب کلب علی خان والی رامپور کو بھیجا تھا اس کے متعلق غالب نے نواب صاحب کے جود و کرم کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا ہے۔

منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی"۔ [۱]

تصانیف

منشی صاحب کی علمی و فنی قابلیت کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملی لیکن ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی اور اردو زبانوں میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ کوہ نور اور اودھ اخبار کی ادارت اردو میں ان کے صحافی اور انشا پرداز ہونے کا بین ثبوت ہے اگرچہ اب تک ان کے کسی علمی یا ادبی کارنامہ کا حال معلوم نہیں ہوا، لیکن ان کی تالیف سے دو کتابوں کا پتا چلا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب تحفۂ کرنیل ایبٹ مسمی بہ "تواریخ نادر العصر" ہے اس کا یہ نام تاریخی ہے جس سے سنہ ۱۸۶۳ء نکلتا ہے۔ یہ کتاب انہی کے مطبع میں چھپی ہے اور ۱۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ منشی صاحب کی طرز تحریر کا اچھا نمونہ ہے۔ اس میں اودھ کی مختصر تاریخ زمانۂ قدیم سے لے کر عہد واجد علی شاہ تک مع حالات تعمیرات شاہی و نقشۂ خاص شہر لکھنؤ مرتبہ کرنیل ایبٹ صاحب اور شاہان اودھ کی قلمی تصاویر ہیں [۲]

---

[۱] اردوئے معلیٰ ص ۹۸-۹۹۔ [۲] اس کتاب کا ایک نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

دوسری کتاب پاکٹ بک آف کریمنل اینڈ پولیس لا۔ صفحات ۵۳و۹۶۷۔ اُردو مطبوعۂ سنہ ۱۸۶۹ء۔ یہ قوانین فوجداری و پولیس پر ایک ضخیم کتاب ہے[1]

---

[1] فہرست مطبوعات اُردو انڈیا آفس مرتبۂ بلوم ھارٹ ج ۲ حصہ ۲ ص ۳۴۔

اُردو زبان

صحیح تلفظ اور صحیح ترجمہ

اُردو زبان کے بولنے میں تین چیزیں نہایت ضروری ہیں مخرج، تلفظ اور لہجہ۔ مخرج یعنی حروف کی صحیح آوازیں پوری طرح ادا کرنا۔ ہر لفظ کو اس کے اعراب یعنی ساکن اور متحرک یا زیر زبر پیش اور سکون کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنا چاہیئے۔ اسی طرح لہجہ سے مراد ہے بولتے وقت متکلم کی آواز اور زبان کی گردش، اُردو زبان کے لہجے ہر صوبے کے لحاظ سے مختلف ہیں اس لئے جن شہروں کی زبان مستند ہو وہاں کا لب ولہجہ اختیار کرنا چاہیئے۔

دُنیا کی تمام زبانوں میں صحیح تلفظ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جب تک صحیح تلفظ نہ ادا کیا جائے لفظوں کے معنی اور مفہوم سمجھنے میں دقّت پیش آتی ہے عربی زبان میں جب تک اعراب یعنی زیر زبر پیش ایجاد نہیں ہوئے تھے اُس وقت تک لوگ غلط لفظ بول جاتے تھے۔ یہاں تک کہ قرآن شریف کی آیتوں کو غلط پڑھ جاتے تھے جس سے لفظوں کے معنی بدل جاتے تھے، اس لئے اعراب ایجاد کئے گئے۔ حروف کی آوازیں اور ان کو مخفف اور پُر پڑھنے نیز خاص لہجہ میں ادا کرنے کے لئے علم قرأۃ اور تجوید ایجاد ہوا۔ الفاظ کو غلط بولنے اور حروف کی غلط آوازیں ادا کرنے سے زبان کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اور بولنے والے کا مفہوم صاف طور پر سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ بعض اوقات مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ اس لئے انگریزی زبان کے ماہروں نے اس

پر خاص کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جدید تعلیم کے مختلف طریقوں میں تلفظ پر خاص زور دیا گیا ہے اور اس کے لئے ابتداہی سے بچوں کو تلفظ سکھانے کی غرض سے ابتدائی جماعتوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار سکھانے والوں کو مقرر کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح جدید آلات گراموفون، ریڈیو اور بولتی فلموں کے ذریعہ صحیح تلفظ مخرج اور لب ولہجہ کی خاص تعلیم دی جاتی ہے۔ اُردو زبان میں صحیح تلفظ پر خاص کتابیں نہیں ملتیں اور نہ اس کے لئے اب تک کوئی خاص کوششیں عمل میں لائی گئی ہیں۔ حالانکہ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اس کا سکھانا نہایت ضروری ہے۔ جس پر ہمارے مدرسوں اور مکتبوں میں بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

اُردو زبان میں کئی زبانوں کے الفاظ آ گئے ہیں، مثلاً عربی، فارسی ترکی، سنسکرت، ہندی، انگریزی، پُرتگالی وغیرہ ان زبانوں کے کئی الفاظ اپنا اصلی تلفظ چھوڑ کر اُردو میں گھُل مِل گئے ہیں۔ جیسے عربی میں صحیح کی جگہ سہی، افراط وتفریط کی بجائے افراتفری، مصالح کی جگہ مسالہ، سنسکرت دُگدہ کی بجائے دودھ، دُل سے دال، ہستی سے ہاتھی، وواہ سے بواہ اور بیاہ وغیرہ۔ انگریزی میں ڈیوٹی، کنسٹر، آرڈلی، اور لینٹرن کی جگہ ڈیوٹی کنستر، اردلی، لالٹین، پُرتگالی میں کامرہ، لیلاؤس بالڈی اور بوتاؤں کی بجائے کمرہ، نیلام، بالٹی، اور بوتام اس قسم کے الفاظ غلط نہیں کہے جا سکتے کیونکہ یہ اُردو زبان میں آکر اس کا جزو بن چکے ہیں۔ اور اب ان کو ان کے اصلی تلفظ میں استعمال کرنا صحیح نہ ہو گا۔ اس کے باوجود ان زبانوں کے اکثر الفاظ اب تک اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں جن کو اُردو کے مصنّفوں نے جس طرح استعمال کیا ہے وہ ہمارے لئے سند ہے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ الفاظ کو عوام تو عوام اکثر خواص بھی صحیح تلفظ کے ساتھ ادا نہیں کرتے جس سے اہل زبان کو ان کی قابلیت پر حرف رکھنے اور ان کا مذاق اڑانے کا

موقعہ مل جاتا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اُردو میں لفظوں کے غلط تلفظ سے زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، ان کی خدمت میں یہ مؤدبانہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ غلط تلفظ سے زبان کے خراب ہونے اور بگڑنے کا اندیشہ ہے اوّل تو کئی لفظ لوگوں کی زبان پر مختلف تلفظ کے ساتھ چڑھ جاتے ہیں اور ان میں یکسانی قائم نہیں رہتی۔ دوسرے غیر ملکی لوگ جو ہماری زبان سیکھنا چاہتے ہیں وہ بھی غلط بولنے لگتے ہیں۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ تلفظ کے بارے میں اہلِ علم اور تعلیم یافتہ لوگوں کے تلفظ کا تتبع کیا جائے، جیسا کہ اُردو زبان کے مشہور شاعر اور ماہر زبان سیّد انشاء اللہ خاں انشاؔ نے دریائے لطافت (صفحہ ۲۷۰) میں لکھا ہے۔

"ایسا ہر لفظ جس کو اہل شہر دو تلفظوں میں ادا کریں ان دونوں میں جو لفظ کہ دوسری جگہ تعلیم کے سوا مُروّج نہ ہو زبان اُردو ہے۔"

اِس کے علاوہ اردو میں کئی لفظوں میں تجنیس خطّی پائی جاتی ہے۔ یعنی وہ دیکھنے میں یکساں ہوتے ہیں اگرچہ ان کی حرکات مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً عربی الفاظ میں عالَم اور عالِم، مُصوِّر اور مُصوَّر، نَقل اور نُقل، سِحر اور سَحَر نَفَس اور نَفس، قِسم اور قَسم، یا فارسی الفاظ میں دَر اور دُر، سُم اور سَم، دَم اور دُم، خَم اور خُم، شِکوَہ اور شُکوہ، یا ہندی میں بَری اور بُری، دھری اور دُھری، سَر اور سُر، سِن اور سَن وغیرہ اگر ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا نہ کیا جائے تو ان کے معنی بدل جائیں گے اور بولنے والے یا پڑھنے کا مطلب خبط ہو جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ غیر زبانوں کے سیکڑوں الفاظ جو اُردو میں آ گئے ہیں ان کا تلفظ اُردو میں بدل گیا ہے اور بعض کی شکلیں بھی بدل چکی ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کے سوا دوسرے لفظوں کو بھی جو اپنی حالت پر قائم ہیں غلط پڑھا یا بولا جائے، جس کے لئے

کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ان عربی الفاظ کو لیجئے جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے لَغْو، مَحْو، سَہْو عوام اس کا تلفظ عموماً لَغُو مَحُو اور سَہُو کرتے ہیں۔ اہلِ زبان اس کو ہرگز پسند نہ کریں گے کہ یہ الفاظ اس طرح غلط بولے جائیں، اگر کہیں کوئی لفظ یا الفاظ بعض شاعروں نے قافیہ یا وزن کی رعایت سے غلط باندھے ہوں تو وہ عام بول چال کے لئے سند نہیں ہو سکتے۔

اُردو زبان کے کئی لفظ ایسے ہیں جو غلط بولے اور پڑھے جاتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں شُکوہ کو شِکوہ، فُضُول کو فَضول، خاطِر کو خاطَر، عَرَق کو عَرْق، مَرَض کو مَرْض، غَرَض کو غَرْض وغیرہ۔ غیر زبانوں کے الفاظ صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے اعراب نہایت ضروری ہیں، جن کے بغیر لوگ عموماً ان کو غلط پڑھتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ مُعَنْوَن ہے جو انتساب یا ڈیڈی کیشن کے معنوں میں رائج ہے۔ یہ عام طور پر مَعْنُون پڑھا جاتا ہے اسی طرح باب مفاعلۃ سے جتنے الفاظ آئے ہیں ان کو عموماً زیر کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے مثلاً مُحاوِرہ مشاعِرہ، مشاہِدہ، جو اصل میں مُحاوَرَہ، مُشاعَرہ اور مُشاہَدہ ہیں۔ اسی وزن پر اور لفظ مباحثہ، مناظرہ، مکالمہ وغیرہ بولے جاتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان بولنے والوں کے لئے صحیح تلفظ سے واقف ہو کر الفاظ کو صحیح طور پر ادا کرنا نہایت ضروری ہے، اور اس کے لئے زبان اُردو کے حامیوں اور بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے تمام الفاظ کے صحیح تلفظ سے عوام کو واقف کرتے رہیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ :-

۱۔ جب کوئی پڑھا لکھا شخص کسی کو غلط تلفّظ کے ساتھ بولتے سُنے تو اس کی صحت کر دیا کرے۔

۲۔ الفاظ کے صحیح تلفظ پر مختصر رسالے لکھے جائیں۔

۳۔ ریڈیو پر تلفظ کی صحت پر مختصر تقریریں کرائی جائیں۔
۴۔ گراموفون کی تعلیمی ریکارڈیں صحت تلفظ کے متعلق تیار کرائی جائیں اور ان کو مدرسوں اسکولوں اور تربیت گاہوں میں سنایا جائے۔
۵۔ اخبارات اور رسائل میں وقتاً فوقتاً اس پر مختصر مضامین لکھے جائیں۔

زبان کی اصلاح اور ترقی کا ایک ذریعہ صحیح ترجمہ ہے۔ ایک زبان کی ترقی کے لئے دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنا نہایت اہم اور ضروری ہے کیونکہ غیر زبانوں کے علم وادب کے بیش بہا خزانے ترجمے ہی کے ذریعہ سے منتقل کئے جاسکتے ہیں۔ اردو زبان کی نشو ونما اور ترقی میں غیر زبانوں کے ترجموں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں صحیح طور پر ادا کرنا بہت دشوار ہے۔ کسی غیر زبان کے الفاظ اور محاورات کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس کے لئے اپنی زبان کا ویسا ہی لفظ یا محاورہ تلاش کرنا جو اس مفہوم کو پوری طرح ادا کر سکے بہت مشکل ہے جب تک دونوں زبانوں پر پوری قدرت نہ ہو اور الفاظ و محاورات سے پوری واقفیت نہ ہو صحیح ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

ترجمہ کے لئے عام طور پر دو طریقے مروج ہیں۔ ایک تو یہ کہ ترجمہ بالکل لفظی ہو۔ دوسرے یہ کہ صرف مفہوم ادا کر دیا جائے۔ ان دونوں طریقوں سے صحیح ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ کہیں تو لفظ کا ترجمہ اس کے صحیح مترادف سے کیا جائے ساتھ ہی اس کا مفہوم بھی پورا پورا ادا ہو جائے۔ ترجمہ صرف لفظی پابندیوں سے جکڑا ہوا نہ ہو جیسے مکھی پر مکھی مار دی۔ صرف لفظ بہ لفظ ترجمہ کی کوشش بیکار ہے اس لئے سب سے اہم چیز جملے کا اصل مفہوم ادا کرنا ہے اور اس کے معنی اور مطلب کو صحیح طور سے بیان کرنا ہے خواہ اس جملے کی ترکیب اور ساخت کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ صحیح ترجمہ میں اس بات کا خیال رکھنا

ضروری ہے کہ جس زبان سے جو محاورہ یا روزمرہ، ضرب المثل یا تلمیح کا ترجمہ کیا جائے تو اس کے لئے اپنی زبان کے محاورے استعمال کرنے چاہییں تاکہ مفہوم واضح طور پر ادا ہو اور لوگوں کی سمجھ میں آ جائے۔

ہر زبان کے الفاظ کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے علاوہ کچھ ایسی خصوصیات بھی رکھتے ہیں جو دوسری زبان کے الفاظ میں نہیں پائی جاتیں، اور اگرچہ بعض اوقات ترجمہ میں اصل کی خصوصیات قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس سے ترجمہ کی زبان محاورے اور روزمرّے کے خلاف ہو جاتی ہے اور مطلب بھی صاف ادا نہیں ہوتا۔ یہاں چند مثالیں ایسے انگریزی جملوں کی پیش کی جاتی ہیں جن کا عموماً غلط ترجمہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ کسی چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر ادا کرنے کے لئے انگریزی میں ایک محاورہ (STORM IN THE CUP) بولا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کا ترجمہ بات کا بتنگڑ، رائی کا پہاڑ، وغیرہ سے کیا جائے صرف لفظی ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے چنانچہ اس کا لفظی ترجمہ "چائے کی پیالی میں طوفان" سے کیا جاتا ہے جو روزمرّے اور محاورے کے خلاف ہے۔

۲۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے (TO EXCHANGE SMILES) اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے:۔

"مسکراہٹ کا تبادلہ کرنا"، اس کی جگہ یوں کہہ سکتے ہیں "دل لگی کرنا" ہنسنا ہنسانا، یا مذاق کرنا وغیرہ

۳۔ حال میں ایک اخبار نے (TO SAVE THE SKIN) کا ترجمہ "چمڑی بچانا" کیا ہے۔ یہ یقیناً اردو نہیں ہے اس کی جگہ جان بچانا، اپنی ذات کو محفوظ رکھنا، صحیح ہوگا۔

۴۔ ایک کتاب میں (TO TAKE LUNCH) کا ترجمہ "ظہرانہ کھانا"

کیا گیا ہے، غالباً یہ "عصرانہ" کی نقل ہے جو از روئے محاورہ غلط ہے۔

۵۔ کسی کو ایک نظر دیکھ لینا، اس کو انگریزی میں TO CATCH A GLIMPSE کہتے ہیں ۔ایک صاحب نے اس کا ترجمہ "ایک جھلک حاصل کرنا کیا ہے۔

۶۔ قائد اعظم مرحوم کے متعلق ایک مضمون میں لکھا گیا ہے۔

THE NATIONAL SOLIDARITY MADE IT SELF MANIFEST IN HIS PERSON

اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے :۔

"ان کی ذات میں قوم کا استحکام اپنا مظاہرہ کرتا تھا"

۷۔ (WEEKLY) یا ہفتہ وار اخبار کے لئے "ہفتگی" ایک نیا لفظ تراشا گیا ہے، جو غلط ہے اس میں یائے فاعلی نہیں بلکہ مصدری ہے

اردو میں غیر ملکی زبانوں مثل عربی، فارسی اور انگریزی سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ کی گئی ہیں، خصوصاً انگریزی ادب، فلسفہ اور سائنس وغیرہ کی سیکڑوں کتابیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں، ان میں کئی بہترین کتابیں ایسی ہیں جو محض صحیح ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ہو کر رہ گئی ہیں چنانچہ انگریزی ادب کے جو شاہکار اردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جو صحیح طور پر ترجمہ نہیں ہوئے لبعض ترجمے بہت اچھے ہوئے ہیں۔ مثلاً مشہور اسپینی مصنف سروانٹیز کی کتاب "ڈان کوئکساٹ" جس کا ترجمہ اردو میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے خدائی فوجدار کے نام سے کیا ہے یا آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام از مولوی عنایت اللہ، یا اسپنسر کی کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ از خواجہ غلام الحسنین اسی طرح ڈریپر کی کتاب کانفلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس کا ترجمہ "معرکۂ مذہب و سائنس" از مولوی ظفر علی خان۔ یہ ایسے صحیح ترجمے ہیں جو اصل تصنیف معلوم ہوتے ہیں۔ صحیح ترجمہ کیلئے ایسی کتابوں کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ہوگا۔

گذشتہ سو سال کا اردو ادب

گذشتہ سو سال کا اُردو ادب دراصل اس قدیم دَور کی نشاۃ ثانیہ ہے جس کو اُردو کا "انقلابی دور" کہنا چاہیئے۔ دولت مُغلیہ کے زوال خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں کی زندگی میں جو زبردست انقلاب آیا۔ اس نے ملک میں ایک عام بیداری کی لہر دوڑا دی۔ جدید حکومت کے ماتحت مسلمانوں کو بھی اُن حالات اور واقعات سے دو چار ہونا پڑا جو عموماً ایک محکوم قوم کو پیش آتے ہیں۔ یہ حالات نہ صرف ان کے معاشی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوئے، بلکہ ان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ان کے دینی اجتماعی، سیاسی، علمی اور ادبی میلانات بھی ان سے کافی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزی تعلیم اور تہذیب و تمدن سے گہرے تعلق کی بدولت قوم کا مطمح نظر بدلنے لگا اور تقریباً نصف صدی کے اندر روایات اور قدامت پرستی کے اثرات زائل ہوتے چلے۔ یہ حالات ملک کی اجتماعی زندگی کے لئے مفید ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ وہ ادب کے لئے بہت ساز گار ثابت ہوئے زندگی کے جدید تقاضوں نے ادب پر بھی قبضہ جمایا اور اس میں مختلف قسم کے رجحانات پیدا کر دیئے۔ زندگی کے ساتھ ادب کا گہرا تعلق ہے۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں ادب زندگی کا مظہر ہے اگر آپ گزشتہ ایک صدی کے اُردو ادب کا جائزہ لیں گے تو آپ کو اس میں زندگی کی قدریں بہت کچھ بدلی ہوئی نظر آئیں گی۔ زندگی کے طبعی میلانات وقت کے تقاضوں

پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اردو ادب میں اظہار زندگی کے بکثرت مواقع پیدا ہوگئے ہیں اور ہمارے ادیبوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ گزشتہ نصف صدی میں ادب کا داخلی پہلو زیادہ تر افادی رہا ہے۔ جس کا قومی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

ادب قوموں کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ جس میں ان کے خیالات و افکار ہیئت اجتماعیہ اور تہذیب و تمدن کے خط و خال نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اردو ادب کے گزشتہ ایک سو سال کے ذخیرے میں قومی اور اجتماعی زندگی کی ایک جھلک پائی جاتی ہے۔

"زندگی برائے ادب" کا قدیم مطمح نظر بڑی حد تک بدل گیا ہے۔ اور اب اس کی جگہ "ادب برائے زندگی" کے نظریہ نے لی ہے۔ موجودہ اردو ادب زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ اردو ادب ایک زندہ ادب ہے جس میں ترقی کرنے کی کافی صلاحیت موجود ہے۔ صرف گزشتہ پچاس سال میں خصوصاً جنگ عظیم کے بعد اس نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ وہ اس کی آئندہ ترقی اور بقاء کی ضامن اور کفیل ہیں۔ عام طور پر ادب کا اطلاق کسی قوم کے ان تمام خیالات اور افکار پر ہوتا ہے جو ضبط تحریر میں آچکے ہوں۔ لیکن اگر اس کو محدود معنوں میں لیا جائے تو ادب سے مراد ایک قوم کا وہ ادبی فنی اور علمی سرمایہ ہے جو نثر یا نظم میں لکھا گیا ہو۔ اس لحاظ سے اردو کے موجودہ ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ اصل تصنیفات اور تالیفات کا ہے اور دوسرا حصہ مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے تراجم کا ہے۔

پہلے ہم نثری ادب کا جائزہ لیتے ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے پہلے مرزا غالب نے اپنے رقعات اور خطوط میں سادہ نثر نگاری کی ابتداء

کی چنانچہ ان کی "اُردوئے معلیٰ" اور عود ہندی وغیرہ اس پر شاہد ہیں۔ سر سید احمد خاں نے بھی غالب کی پیروی کی اور سادہ مگر پُر زور نثر کی بنیاد ڈالی جو ان کی تصانیف مضامین اور لکچروں سے ظاہر ہے۔ انھی کے اثر نے ان کے ہم مشربوں اور دوسرے عالموں اور ادیبوں کو بھی اس طرز کی طرف مائل کر دیا۔ ان میں آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی نے اپنے خاص طرز تحریر ایجاد کئے ان کی تصانیف اُردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

سر سید کے رفقاء میں محسن الملک، وقار الملک چراغ علی اور سید محمود بھی اُردو کے اہل قلم اور مصنّف تھے۔ ان کے معاصرین میں عماد الملک، سید علی بلگرامی اور عزیز مرزا اُردو کے اچھے ادیب اور مصنّف گزرے ہیں۔ اسی طرح دیگر معاصرین میں سید احمد دہلوی، مولوی سراج الدین مولوی ممتاز علی وغیرہ اچھے لکھنے والوں میں تھے۔ سر سید اور ان کے رفقا کے تربیت یافتہ لوگوں میں وحید الدین سلیم اور مولوی عبدالحق خاص طور سے قابل ذکر ہیں

یہ دونوں سر سید اور حالی کے دبستان کے نمائندہ ہیں۔ آزاد کا طرز بہت مقبول ہوا، مگر ان کا کامیاب تتبع کسی سے نہ ہو سکا۔ تاہم بعض ادیبوں نے اس رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ہے، جن میں نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی بہت ممتاز ہیں شبلی کے شاگردوں میں سید سلیمان اور عبدالسلام اور شبلی کے متبعین میں عبدالرزاق کانپوری شبلی اسکول کے نمائندہ ہیں۔ ان کے بعد اس طرز میں سیکڑوں لکھنے والے پیدا ہوئے۔ سادہ مگر پُر زور نثر نگاروں میں خواجہ غلام الثقلین اور غلام الحسنین بھی اچھے ادیب اور مصنّف تھے۔ میر ناصر علی ناصر نذیر فراق حکیم برہم، پروفیسر شہباز، ریاض خیر آبادی، مہدی حسن افادی ظفر علی خاں، سجاد حیدر، سلطان حیدر جوش عبدالماجد، خواجہ حسن نظامی، مسعود حسن ادیب، امیر نقاد بدایونی اور نیاز فتحپوری جدید نثر اُردو کے مسلم انشا پردازوں

میں شمار ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں اُردو کے کئی نامور ادیب اور صاحب انشاء پرداز ہوئے۔ ان میں پنڈت سرشار، جوالا پرشاد برقؔ، لالہ سری رام چکبست، پنڈت کیفی منوہر لال، زتشی، دیا نرائن نگم، سپرو، کشن پرشاد کول وغیرہ اُردو کے مایہ ناز ادیب اور بلند پایہ مصنّف مانے گئے ہیں۔ جدید اُردو کا نثری ادب زیادہ تر ادب لطیف افسانوں اور ناولوں پر مشتمل ہے اسمیں شررؔ اور سرشارؔ نے مغربی طرز میں ناول نویسی کی بنیاد ڈالی سرشار کے فسانۂ آزاد اور شررؔ کے اسلامی تاریخی اور معاشرتی ناولوں نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی، اگرچہ اُن سے پہلے نذیر احمد نے ناول لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے اخلاقی اور معاشرتی ناول اپنے موضوع اور زبان کے لحاظ سے قبول عام کی سند پا چکے تھے۔ نذیر احمد کا کامیاب تتبع راشد الخیری نے کیا اور زنانہ محاوروں اور بول چال میں کئی ناول لکھے اسی طرح محمد علی طیبب کے ضخیم تاریخی اور عشقیہ ناولوں نے بھی فروغ پایا۔ مرزا رُسوا، ناصر نذیر، مرزا محمد سعید، خواجہ محمد شفیع سلطان حیدر جوش، ظفر عمر، فیاض علی، پریم چند اور لطیف اکبر آبادی وغیرہ نے اُردو کے بہترین ناول اور فسانے لکھے ہیں۔ جدید طبقہ کے ناول نویسوں اور مختصر افسانہ نگاروں میں پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری ایم۔ اسلم رشید اختر ندوی، اکرشن چندر، بلونت سنگھ اور رئیس احمد جعفری اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ عورتوں میں صغرا ہمایوں، نذر سجاد، حجاب امتیاز علی، اے آر خاتون، بیگم احمد علی، عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشید جہاں اور مسز عبدالقادر کے ناول اور مختصر افسانے بہت دلچسپ اور قابلِ قدر ہیں اور ادبی لحاظ سے ان کے مرد معاصرین سے کسی طرح کم نہیں۔ انقلابی عہد کے دورِ اوّل میں اُردو کا نظمی ادب تمام تر قصائد مثنویوں اور غزلیات وغیرہ اصنافِ سخن پر مشتمل ہے اس دور کے شعراء میں مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور ان کے شاگرد، انیسؔ دبیرؔ اور ان کے تلامذہ داغؔ، امیرؔ، جلالؔ، تسلیمؔ اور ان بے شمار شاگردوں

میں ریاض، جلیل، سائل، بیخود، شاد عظیم آبادی، ثاقب بدایونی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ دوسرا دور جسے "اصلاحی" کہا جاتا ہے۔ اس میں حالی، شبلی اکبر، اسماعیل، محسن کاکوروی، نظم طبا طبائی، شرر لکھنوی اور شوق قدوائی وغیرہ نے قدیم رنگِ تغزّل کو چھوڑ کر دیگر اصنافِ نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ انگریزی شاعری کے تتبع میں جدید اور نیچرل شاعری بہت مقبول ہوئی۔ اس صنفِ سخن میں اقبال، نادر کاکوروی، ناظر کشمیری، سرور جہاں آبادی، جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کی نظمیں اُردو کے جدید ادب میں سنگِ میل کا حکم رکھتی ہیں۔ قومی اور سیاسی زندگی کے اثر سے اس رنگ میں لکھنے والوں میں حالی، شبلی اکبر، اسماعیل، اقبال، ظفر علی خاں، میر نیرنگ اور حفیظ جالندھری کا کلام کافی مقدار میں موجود ہے۔ تغزل کے دورِ جدید کے علم برداروں میں حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، عزیز لکھنوی، فانی بدایونی، آرزو لکھنوی یاس یگانہ، اثر لکھنوی اور فراق گورکھپوری بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ ان کے دیوان اور کلام کے مجموعے جدید اُردو شاعری کی گراں بہا پونجی ہے۔ شاعری میں جدید رجحانات نے شعرا کی اچھی خاصی جماعت پیدا کر دی ہے۔ ان میں احسان دانش، ن۔م راشد، فیض احمد فیض، میراجی وغیرہ کے کلام نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ انگریزی کے اکثر شعرا شکسپیئر، ملٹن، بائرن، شیلی، ٹینی سن ورڈز ورتھ اور تھامس مور وغیرہ کی بہترین نظموں کے منظوم اردو ترجمے ہو چکے ہیں۔

اُردو ادب کی ایک صنف ڈرامہ نگاری نے اگرچہ خاطر خواہ ترقی نہیں کی تاہم اس میں آغا حشر کاشمیری، شوق قدوائی، طالب بنارسی، نرائن پرشاد بے تاب، عبداللطیف شاد، احسن لکھنوی کے ڈرامے ادبی لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ عبدالماجد، عابد حسین، احمد شجاع وغیرہ نے انگریزی طرز پر نثر میں ڈرامے لکھے ہیں۔ ان میں اشتیاق حسین قریشی، فضل حق قریشی اور امتیاز علی تاج کے ڈرامے

خاصے کامیاب ہیں۔ اُردو کا تنقیدی ادب جو پچھلے دور میں حالیؔ کے مقدمہ شعر و شاعری یادگارِ غالب اور شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر تک محدود تھا۔ اس میں گزشتہ نصف صدی میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔ اس صنفِ ادب میں تنقیداتِ عبدالحق، بیخود موہانی کی گنجینۂ تحقیق، حامد حسن کی نقد و نظر، مباحثہ چکبست و شرر، مسعود حسن رضوی کی ہماری شاعری، امیر نقاد کی اردو شاعری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یورپین ادب سے متاثر جدید طبقہ میں اگرچہ ناقدانہ اصابت رائے اور پختگی کی کمی ہے۔ تاہم اسمیں بعض اچھے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ احتشام حسین کے جدید ادبی رجحانات، اثر لکھنوی کے تنقیدی مضامین، سروری کی جدید اُردو شاعری زورؔ کے تنقیدی مقالات اور اختر حسین رائے پوری کی تصانیف اردو کے تنقیدی ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح غالبؔ، سرسید، حالیؔ، شبلیؔ، اکبرؔ، نذیر احمد اقبالؔ اور دوسرے قدیم و جدید ادیبوں اور شاعروں پر کئی مستقل کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں۔ کردار نگاری میں چراغ حسن حسرت کی مردم دیدہ اور شوکت تھانوی کی شیش محل نے اُردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

خطبات کے سلسلہ میں سرسید، محسن الملک، اور نذیر احمد کے لکچر ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبات عالیہ، خطبات عبدالحق، اور محمد علی کی تقاریر اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ فن انشا میں غالبؔ کی اردوئے معلیٰ کے علاوہ سرسیّد آزاد اور نذیر احمد کے خطوط شبلی، اکبرؔ، امیر مینائی مہدی حسن وغیرہ کے مکاتیب بہترین مجموعے خیال کئے جاتے ہیں مزاحیات اور طنزیات میں بھی اُردو ادب پیچھے نہیں رہا۔ اودھ پنچ کے مشہور لکھنے والوں میں منشی سجاد حسین، اکبر الہ آبادی، مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجرؔ، سید محمد آزاد اور محفوظ علی بدایونی بہترین

مزاح نگار گزرے ہیں۔ انگریزی کے جدید تعلیم یافتہ گروہ نے مغربی طرز پر مزاحیات میں " طنز " کا عنصر شامل کیا۔ ان میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، احمد شاہ بخاری، عظیم بیگ چغتائی، مُلّا رموزی، شوکت تھانوی اور کنھیا لال کپور بہت مشہور ہیں جن کی تصانیف نے اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں آزاد کی آبِ حیات، صفیر بلگرامی کی جلوۂ خضر لالہ سری رام کی خمخانۂ جاوید عبدالحیٔ کی گل رعنا تنہا کی سیر المصنفین، سکسینہ کی تاریخ ادب، عبدالسلام کی شعر الہند، نصیر حسین خیال اور حامد حسن کی داستان اردو استاد کا درجہ رکھتی ہیں قدیم اردو ادب پر مولوی عبدالحق کے مضامین، شمس اللہ قادری کی اردوئے قدیم اور شیرانی کی پنجاب میں اردو تحقیقات کا بہترین نمونہ ہیں۔ دکنی ادبیات پر مولوی عبدالحق کے علاوہ شیخ چاند مرحوم، پروفیسر زور اور سید محمد وغیرہ کے مضامین نے قدیم دکنی ادب کے سرمایہ کو کافی طور پر روشناس کرایا ہے۔ اردو زبان کی لغت میں کتابیں نام کو نہ تھیں۔ جان گلگرسٹ، فیلن اور جان شکسپیر وغیرہ اردو نواز انگریزوں کی کوششوں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ لیکن اردو میں سب سے پہلی اور ضخیم لغت سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ ہے۔ دوسری کتاب ناتمام امیر اللغات امیر مینائی کی تالیف ہے۔ نور الحسن نیرّ نے چار ضخیم جلدوں میں نور اللغات لکھی اور شیخ عبدالمجید نے لاہور سے جامع اللغات کے نام سے اردو کی ایک جامع لغت شائع کی ہے۔ اردو کے محاورات، ضرب الامثال اور اصطلاحات پر کئی کتابیں اور متعدد مشہور شعراء کے کلام کی فرہنگیں لکھی گئی ہیں۔

تاریخ اور سیر میں اردو ادب کا ذخیرہ کافی ہے۔ شبلی کی تاریخی تصانیف اور رفقائے دار المصنفین کی معیاری مطبوعات کے علاوہ اسلامی تاریخی اور مختلف ممالک کی تاریخ پر کئی مستقل تصانیف اور ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

عربی تاریخ و سیر میں ابن قتیبہ، طبری، مسعودی، ابن اثیر، ابوالغدا، ابن خلکان اور ابن خلدون کی مشہور کتابوں کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے پیغمبر اسلامؐ، خلفاءؓ اور سلاطین اسلام سے لیکر مشاہیر اسلام نیز مختلف ممالک کے نامور علماء، حکما، ادبا اور شعراء کی سوانح عمریاں اور تذکرے بکثرت موجود ہیں سفرناموں میں سرسید، آزاد اور شبلی کے سفرناموں کے علاوہ محبوب عالم، غلام الثقلین اور ولی محمد کے سفرنامے معلومات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ گو ادبی اعتبار سے بلند پایہ نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ کئی سفرناموں کا انگریزی اور عربی سے ترجمہ ہو چکا ہے۔ جن میں ابن بطوطہ اور ابن جبیر اندلسی کے سفرنامے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ہر زبان کا ابتدائی دور غیر زبانوں کے ترجمے سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اردو میں بھی متعدد ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے کثرت سے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ادب، تاریخ، فلسفہ، اخلاق، تعلیم، قانون، سیاسیات، معاشیات، سائنس میں طبیعات، ریاضیات، ہیئت، مناظر، طبقات الارض، وغیرہ اور مختلف صنعتوں مثلِ زراعت و دباغت، رنگ سازی، عکاسی، فلم سازی اور دستکاری وغیرہ پر بھی کئی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ دہلی کالج، سائنٹیفک سوسائٹی، انجمن ترقی اردو اور دار الترجمہ عثمانیہ، ہندوستانی اکیڈیمی اور جامعہ ملیہ کی کوششوں سے دوسری زبانوں کے ادبیات کی بہترین کتابیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ جن سے اردو ادب کا خزانہ مالا مال ہے۔

صحافتی ادب میں بھی اردو کا میدان وسیع ہو چلا ہے۔ اگرچہ فن کے اعتبار سے اس نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی۔ گذشتہ سو سال کے اندر سیکڑوں بلکہ ہزاروں اخبارات اور رسالے شائع ہوتے رہے ہیں، جن کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔

ادب کے علاوہ تعلیم، سائنس، معاشیات، نفسیات اور طب کے بھی کئی رسالے نکلتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں اور بچوں کے رسالے اور صنعتی اور فلمی پرچوں کی اشاعت کثرت سے ہو رہی ہے۔

گزشتہ سو سال میں اردو ادب کا جو ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے۔ وہ کافی طور پر امید افزا ہے اور اس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں اس کو غیر متوقع ترقی نصیب ہوئی ہے۔ خصوصاً پچھلے پچاس سال کا ادب جس میں قومی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں اور اگر یہی رفتار جاری رہی تو یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ جس طرح اس کا ماضی قریب شاندار رہا ہے اس کا مستقبل قریب بھی عظیم الشان ہوگا۔

انگریزی ادبیات اور ہندوستان

ممالک مشرقیہ میں قدامت کے لحاظ سے ملک ہندوستان کو جو عظمت اور فضیلت حاصل ہے وہ اس کے مذاہب، سلطنتوں، تہذیب و تمدن اور آثارِ قدیمہ سے صاف ظاہر ہے۔ قدیم الایّام میں دنیا کی مختلف اقوام کا تعلق ہند اور اہلِ ہند سے رہ چکا ہے جس کے آثار ان قوموں کی تواریخ اور ادبیات میں موجود ہیں، چنانچہ قرونِ وسطیٰ میں انگلستان کا جو تعلق ہندوستان کے ساتھ رہا ہے اس کی نسبت کئی جزئی اور تفصیلی اشارات انگریزی ادبیات میں پائے جاتے ہیں۔ قاعدہ کی بات ہے کہ دنیا کے اہم واقعات کا اثر معاصر اہلِ قلم پر زیادہ ہوتا ہے، مگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزی ادب میں ہندوستان کا اثر بہت قلیل مقدار میں پایا جاتا ہے۔

متعدد انشا پردازوں اور شاعروں نے ہندوستان کے سحر اور شعبدہ بازی کی نسبت کچھ حالات لکھے ہیں اور ہندوستانی زندگی کے مختلف مناظر پیش کئے ہیں، مثلاً عورتوں کا رنگین اور زریں ملبوسات میں ندی کے کنارے پانی بھرنا، سفید پوش مقتدایانِ مذہب کا کسی مذہبی جلوس کے سامنے پنکھے ہلانا۔ زر بفت کی جھولوں سے لدے ہوئے ہاتھیوں اور ہودہ والے اونٹوں کا بازار سے گزرنا، بازار کا شور و شغب، صحرا کی خاموشی اور سکوت، یہ اور اس طرح کی کئی باتوں کا نقشہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کھینچا ہے۔ ان مصنفین میں زیادہ تر مؤرخین اور محققین ہیں۔

اور اگر ان کو علیحدہ کر دیا جائے تو صرف چند ایسے مصنّف نکلیں گے جنہوں نے ہندوستان کا موضوع خاص طور پر اپنے لئے پسند کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ولایت سے آنے والے سیّاحوں کا مقصد ہندوستان آنے سے محض سیرِ عجائبات اور تفریحِ طبع تھا یا تحصیلِ مال و زر، سیّاحوں کا کام اِدھر اُدھر چکّر لگانا یا روپیہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ تخیّل سے کام لینے اور شاعری سے بہرہ وَر ہونے کی نعمت بہت کم لوگوں کو عطا ہوتی ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا تو ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے انگریزی ادیبوں کی صف اوّل میں جگہ دی جا سکے اور بالفرض اُن میں سے کوئی بالکل ہندوستانی طرز پر ہندوستان کی نسبت کچھ لکھتا بھی تو انگریزی داں طبقہ اس سے مُستفید نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ہندوستان ممالکِ مغرب سے ایک دُور ترین ملک ہے اِس لئے اِس مُلک کے اندرونی حالات، مذاہب عوائد و رسوم اور طرزِ معاشرت سے اُن لوگوں کو برائے نام بھی آگاہی نہیں ہو سکتی تھی۔

ادب قدیم

انگریزی ادب کا دارومدار تمامتر رومی (لاطینی) اور یونانی ادبیات پر ہے، اس لحاظ سے وہ قدیم رومی اور یونانی روایات کا حامل ہے، لہذا ہندوستان کے متعلق ابتدائی معلومات کا سرچشمہ تمام تر یونانی اور رومی مصنّفین کے وہ بیانات ہیں جو ہندوستان کی فتوحاتِ اسکندری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بنا پر بعض معلومات یونانی اور رومی ذرائع سے انگریزی ادب میں داخل ہو گئیں۔ قدیم شعرا میں چاسر نے (جو انگریزی شاعری کا باوا آدم ہے) اپنے بعض منظوم قصوں[1] میں

---

[1] قصص کنیٹربری CANTERBURY TALES

ہندوستان کے متعلق بعض امور کا ذکر کیا ہے، چنانچہ
(قصۂ ریکس) میں اس نے ایمپرتیوس اعظم بادشاہِ ہندوستان کا تذکرہ کیا ہے اسی طرح PARDONER'S TALE (قصۂ خطا بخش) میں بیدپا برہمن کی کلیلہ و دمنہ سے ایک حکایت نقل کی ہے جو ابن المقفع کے عربی ترجمہ کے ذریعہ یورپ میں پہنچی تھی[1] اس سے زیادہ چاسر کے کلام میں ہندوستان کے متعلق کچھ نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح پندرہویں صدی کے ایک اور فسانۂ منظوم میں جس کا نام GESTE OF ALEXANDER (کارنامۂ سکندریہ) ہے ہندوستان کی نسبت ایک اور اشارہ پایا جاتا ہے اس کا مصنّف غالباً انگلستان کے جنوب مشرق کا باشندہ تھا جو ۱۴۳۰ء میں گزرا ہے وہ ہندوستانی فوج کے ہاتھیوں اور دیگر عظیم الجثہ حیوانات کے خیال سے بہت دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ نیز اُن جواہرات کے نام بھی اس نے گنوائے ہیں جو اسکندر کو ہندوستان سے ہاتھ لگے تھے۔ سونے کے منقش ستون جن میں جواہرات مروارید، زمرد اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ ہاتھی دانت کی تراشی ہوئی ہندو دیوتاؤں کی مورتیں، جامہائے بلّورین، صدف کے پھول، پرندے اس طرح ان تمام بیش بہا خزانوں کا اس نے ذکر کیا ہے جو اسکندر اعظم کو ہندوستان سے ہاتھ لگے تھے۔

اس کے سو سال کے بعد ایک اور نظم لکھی گئی جس کا نام ING ALYSAUNDER (سکندر بادشاہ) ہے اس میں ہندوستان کو ایک متمول اور کثیر آبادی والا ملک بتایا گیا ہے جس میں کئی شہر اور قلعے ہیں۔ دریائے گنگ کے ذکر میں تین سو فٹ کی مچھلی کا اس میں ہونا بتایا گیا ہے۔ بہر حال سولہویں صدی کے

---

[1] ابن المقفع کے عربی ترجمہ کا عبرانی میں ترجمہ ہوا تھا، اسی کا لاطینی ترجمہ جان آف کپوا نے ۱۲۷۰ء میں کیا۔ (ادبیات ایران جلد ۲ ص ۳۵۰) اسی لاطینی ترجمہ کی بدولت کلیلہ و دمنہ کی حکایات یورپ میں پہنچیں۔

آغاز تک ہندوستان کے متعلق انگریزی ادب کے دامن میں ان چند خزف پاروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

تعلقات کی ابتدا | انگلستان کا تعلق ہندوستان سے جب کبھی قائم ہوا ہو، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ چودھویں صدی میں انگریزوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوگئی تھی۔ پھر بھی صحیح طور پر یہ تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے جب سولہویں صدی میں انگریزوں کے دلوں میں ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرنے کی تحریک پیدا ہوئی چنانچہ اسی دھن میں انہوں نے بحری سفر کی تیاریاں کیں اور کولمبس اور واسکوڈگاما جیسے اولوالعزم سیّاحوں نے ہندوستان کے جزائر کا رُخ کیا۔ اوّل الذکر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دراصل وہ جزائر ہند کی تلاش کو نکلا تھا، مگر غلطی سے امریکہ پہنچ گیا اور اسی وجہ سے وہاں کے "سرخ رو وحشیوں" کو اس نے "ریڈ انڈین" کا لقب دیدیا۔[1] بہرحال اور مہتم بالشّان تحریکات کی طرح ہندوستان پر قبضہ کرنے کی یہ تحریک خاص طور پر قابل لحاظ ہے جس کا اثر انگریزی ادبیات پر پڑنا لازمی تھا۔ جب ڈگاما نے نہر سویز میں داخل ہو کر ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کر لیا تو اہل انگلستان کو ہندوستان کی نسبت مزید معلومات حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کے بعد انگریز سیّاح یکے بعد دیگرے ہندوستان آنے لگے۔

عہد الزابیتھ | انگلستان کے حکمرانوں میں الزابیتھ ایک نامور اور شان و شوکت والی ملکہ گزری ہے، جس کا عہد ادب کے لئے عہدِ زریں سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہدِ حکومت میں پانچ سیّاح اسٹیونس، نیوبری، لیڈز، اسٹوری اور فچ ہندوستان کے جواہرات خریدنے اور یہاں کے عجائبات دیکھنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ ہندوستان میں اس وقت

---

[1] تاریخ امریکہ ص ۱، از مولوی محمد یحییٰ تنہا، مطبوعہ الناظر پریس۔

عہدِ اکبری کا دورِ دورہ تھا، ملکۂ انگلستان نے اپنے معاصر بادشاہ کے نام رقعہ لکھ کر نیوبری کے حوالہ کیا جس کا مضمون یہ تھا[1]:

"چونکہ ہماری رعایا کو دنیا کے دُور دراز ممالک کی سیر و سیاحت کا بیحد شوق ہے جس سے ان کا مقصد حتی الامکان تمام اقوام عالم کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرنا ہے تاکہ اس ذریعہ سے باہمی دوستانہ روابط قائم کئے جا سکیں۔ اسی لئے حامل رقعۂ ہٰذا جان نیوبری مع اپنے رفقا کے نہایت ادب اور دیانت داری کے ساتھ آپ کی حدودِ مملکت میں داخل ہونے کی جرأت کر رہا ہے۔"

انہی سیاحتوں کا یہ نتیجہ تھا جس کا اثر انگلستان کے شعرا اور مصنّفین کے تخیّل پر پڑا۔ اس عہد کے ابتدائی شعرا میں اسپنسر (SPENSER ۱۵۹۹ء) نے اپنی مشہور نظم THE FAERY QUEENE (پری جمال ملکہ) میں تقریباً سات جگہ ہندوستان اور اس کے دریاؤں گنگا اور سندھ کا ذکر کیا ہے اور گو اس فسانۂ منظوم میں مشرقی تخیّل کا اثر بہت بڑی حد تک پایا جاتا ہے تاہم ہندوستان کے متعلق اس میں مزید حالات نہیں ملتے۔ اسی طرح اس عہد کے نامور شاعر اور ڈرامانویس ولیم شیکسپیئر نے ہندوستان کی نسبت بعض اشارات اپنے ڈراموں میں کئے ہیں۔ مثلاً:

"بوقت تبسم اس کے چہرے پر کئی لکیریں نمودار ہو جاتی ہیں جتنی کہ جدید نقشہ میں باضافۂ ہندوستان موجود ہیں[2]"

---

[1] مسٹر ونسنٹ اسمتھ اپنی محققانہ تاریخ "اکبر" میں (ص ۲۲۹) لکھتے ہیں کہ ملکہ کا اصلی خط بعینہٖ محفوظ نہیں ہے، صرف اس کے بعض فقرے ملتے ہیں مندرجہ بالا خط کے الفاظ جو اصل تحریر کا مفہوم ادا کرتے ہیں، سیّاحوں کے بیانات سے لئے گئے ہیں۔

[2] ہنری ہفتم ایکٹ ۵ - ۳۔

"وہ جس کے ہاتھ نے ایک بدتر ہندوستانی کی طرح ایک موتی کو پھینک دیا"[1]

سترھویں صدی کا نامور ادیب اور شاعر جان ملٹن جو بقول ڈرائیڈن اپنی بلند خیالی اور بلند نظری کے لحاظ سے انگریزی کے تمام قدیم و جدید شعراء انشا پردازوں پر فوقیت رکھتا ہے، اس کے کلام میں ہندوستان کے متعلق بعض حوالے ملتے ہیں، مگر اس کی معلومات کا تمام تر سرمایہ اُن سیاحوں کے بیانات ہیں جو عہد الزابیتھ میں ہندوستان آئے تھے، چنانچہ اپنے شاہکار PARADISE LOST (فردوس گم شدہ) میں لکھتا ہے:

"کسی دور ترین سمندر میں ایک جہاز جو خاموش پڑا ہوا۔ معتدل ہواؤں کی وجہ سے بادلوں میں لٹک رہا ہے۔ بنگالہ سے چلتا ہوا، یا جزائر ٹرینٹ اور ٹائیڈ ور سے، جہاں سے تاجر مسالہ دار ادویہ لاتے ہیں"[2]

ہندوستان کے شہروں میں آگرہ اور لاہور کا ذکر سلاطین مغلیہ کے پایۂ تخت کے طور پر کیا گیا ہے[3]۔ ملیبار اور دکن کا نام بھی لیا گیا ہے[4]۔ دریائے گنگا اور سندھ کے نام بھی بعض اشعار میں ملتے ہیں[5]

عہد الزابیتھ کے مشاہیر شعراء میں سے کسی نے ہندوستانی موضوع پر کوئی مستقل چیز نہیں لکھی البتہ مارلو MARLOW نے اپنے ایک ڈرامے کے لئے فاتح اعظم امیر تیمور کو پسند کیا اور اس کا نام بھی TAMBUR LAEINE (تیمور لنگ) رکھا، گو ہندوستان سے اس کو کوئی خاص تعلق نہیں ہے، تاہم اس میں تیمور کی زبانی ایسٹ انڈیا اور بعد کے انکشاف شدہ جزائر کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت میں انگریزوں کا کارخانہ قائم کرنے کا خیال مارلو

---

[1] آتھیلو ایکٹ ۵-۲ ، [2] پیراڈائز لاسٹ، باب ۲ (کلیات ملٹن صہ ۱۱۶ چنڈوس کلاسکس) [3] ایضاً باب ۱۱ (کلیات صہ ۳۳۴، [4] ایضاً باب ۹ (کلیات صہ ۲۹)
[5] ایضاً باب ۹ (صہ ۲۶۴)

کے دل میں بھی موجود تھا۔

سترھویں صدی کے آخر میں انگلستان کے ملک الشعرا ڈرائیڈن DRYDEN (۱۶۷۰-۸۹ء) نے "اورنگ زیب" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا۔ یہ پہلا ادیب ہے جس نے اپنے ڈرامے کے لئے خالص ہندوستانی پلاٹ پسند کیا لیکن اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی ہندوستان کی نسبت انگریزوں کی معلومات بہت محدود تھیں۔ بعض باتیں تو اس میں اس قدر غلط اور مضحکہ انگیز لکھی گئی ہیں کہ اگر خود اورنگزیب یہ ڈرامہ دیکھتا تو وہ اپنے تئیں بھی مشکل سے پہچان سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈرائیڈن نے مغلیہ سلطنت کی نسبت چند باتیں سنی ہوں گی۔ انہیں کی بنیاد پر اس کے تخیّل نے ایک مشرقی تاجدار کی نسبت ایک من گھڑت پلاٹ تیار کر کے رکھ دیا۔ اس کی غلطیوں کا اندازہ صرف اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ ہندو مذہب کو اسلام کے ساتھ گڈمڈ کر دیتا ہے: چنانچہ اس نے مراد کی چتا پر اس کی بیگم ملیسندا کا (یہ نام بجائے ہندوستانی کے یونانی معلوم ہوتا ہے) ستی ہونے کے لئے جاتا بیان کیا ہے اسے کیا معلوم تھا کہ مردہ جلانے اور بیوہ عورت کے ستی ہونے کی رسم خاص ہندوؤں کی ہے اور مسلمانوں کو اس سے قطعاً کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے اورنگ زیب جیسے پکے مسلمان بادشاہ کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں جن سے اس کا مسئلہ تناسخ کا قائل ہونا ثابت ہوتا ہے:

"تناسخ ہوا گر آئندہ روحِ غیر فانی کا
بنے تو رتھ یا شیر اپنی پچھلی زندگانی کا[1]"

ایسی اہم غلطیوں کے بعد اگر اس ڈرامے میں عالمگیر اور شاہجہاں یونانیوں

---

[1] کلیات ڈرائیڈن (ڈراما اورنگ زیب)

کے علم الاساطیر کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیں تو کیا تعجب کیا جاسکتا ہے۔

ملکہ این کا عہد اس عہد میں انگریزی ادب نے نیا چولا بدلہ، اگرچہ اس وقت تک سفرناموں اور روزناموں میں ہندوستان کے متعلق کافی مواد مہیا ہو چکا تھا تاہم پوپ اڈیسن جیسے مشرقی تخیل کے ادیب کے ہاں بھی چند معمولی باتوں کے سوائے اور کچھ نہیں پایا جاتا۔ ٹامسن THOMSON شاعر نے اپنی نظم "سال کے موسم" SEASONS میں دو ایک جگہ ہندوستان کا ذکر کیا ہے[1]۔ اسی طرح ISSAC WATTS آئزک واٹس (۱۷۴۸ء) نے ہندوستانی فلسفی INDIAN PHILOSOPHER کے نام سے ایک نظم لکھی ہے، انگریزی میں یہ پہلی نظم ہے جس میں ہندوستان کا مذہبی اثر پایا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کی نسبت اس سے زیادہ انگریزی ادبیات میں کچھ نہیں پایا جاتا کہ وہ ایک گرم ملک ہے جہاں ہاتھی چیتے اور کیلے کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں، نیز یہ کہ یہاں کے بادشاہوں کے درباروں میں ہر وقت موتی، زمرد اور سونا ہی چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ انگریزی کا مشہور ادیب JOHNSON (جانسن) تو ہندوستانیوں کو "وحشی" کا لقب عطا کرتا ہے، جو بجائے ان کے افریقہ کے غلاموں کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ لیکن انگلستان سے آنے والے سیّاحوں میں بعض ایسے علماء اور مؤرخ بھی تھے جن کے سفرناموں اور روزناموں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان جواہرات اور درندوں سے بھرا ہوا ایک گرم ملک ہی نہیں ہے بلکہ اس میں "عقل و مذہب اور بلند تخیل رکھنے والے انسان بھی بستے ہیں"۔

---

[1] موسم بہار اور موسم گرما میں ہندوستان کے غروب ہونیوالے سورج اور ہندوستانی انجیر کا ذکر ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگلستان کی نمایندگی کرنے والی ایک تجارتی کمپنی کے ذریعہ ہندوستان کے حالات انگریزوں کو معلوم ہوتے رہے۔ مگر جب لارڈ کلائو بہت بڑی دولت لیکر وطن پہنچا اور اس کے بعد اور لوگ بھی ہندوستان سے مالامال ہو کر جانے لگے تو لوگوں کی نگاہیں عام طور پر ہندوستان کی طرف اُٹھنے لگیں، باوجود اس کے[1] زمانہ میں ہندوستان کے ساتھ انگلستان والوں کے رسل و رسائل اور تجارت کی بدولت مستحکم روابط قائم ہو گئے تھے۔ تاہم ہندوستان کی اندرونی زندگی کی نسبت اہل انگلستان کو کچھ معلوم نہ ہوا اور وہاں کے امرا یہاں کے دولتمند انگریزوں کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ عام اہلِ انگلستان بھی رشک کی وجہ سے اُن کو بُرا بھلا ہی کہتے رہے اس لئے کہ انہوں نے ہندوستان میں رہ کر "تباہ شدہ صوبجات" اور متعدد مقتولین سے اپنی ناجائز دولت حاصل کی تھی اور "ہزاروں کے کھنڈروں پر اپنی عمارتیں تعمیر کی تھیں[1]"

آخر کار مظلوم ہندوستان کے ساتھ ہمدردی کا زمانہ آیا اور BRKE (برک) جیسے آتش بیان مقرر اور مفنن نے دار العوام میں وارن ہیسٹینگز پر طرح طرح کے سنگین الزامات قائم کرتے ہوئے ایک جذبات انگیز تقریر کی اور ان تمام مظالم کی تشریح کی جو ہیسٹینگز اور اس کے ساتھیوں نے ہندوستانیوں پر کئے تھے۔ "برک کی تقریر وارن ہیسٹینگز کے الزام[2] پر" انگریزی ادبیات کا ایک شہپارہ ہے اور اگرچہ یہ تقریر محض وقتی دلچسپی کی چیز تھی۔

---

[1] یہ فقرے دراصل برک کے ہیں جو اس نے اپنی تقریر میں استعمال کئے ہیں۔

[2] دیکھو تصانیف برک (BURKE) جلد چہارم و پنجم ص ۲۲۰ تا ص ۵۳۳، اور ص ۶۶ (طبع جارج بیل ۱۹۱۰ء) برک نے اپنی رپوٹ ۴ اپریل ۱۷۸۶ء کو دار العوام میں پیش کی تھی۔

تاہم انگریزی ادب میں ادبی حیثیت سے یہ تقریر بہترین پیرایہ میں ذاتیات پر سخت ترین حملہ کرنے کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اور نہ صرف موقع کی اہمیت کے خیال سے بلکہ زبان کی شوکت اور بلاغت کے لحاظ سے بھی وہ ایک غیر فانی چیز ہے۔

فتوحات ہند کے بعد اگرچہ ہندوستان کی فتوحات سے انگریزی ادب میں کوئی مہتم بالشّان اضافہ نہیں ہوا تاہم اس کی بدولت مشرقی مباحث پر لکھنے والوں کی ایک خاصی جماعت ضرور پیدا ہوگئی، مگر ہندوستان کی اندرونی زندگی کا راز سربستہ ہی رہا اور اس کی نسبت کسی نے کچھ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ انگلستان والوں نے ہندوستان سے جو دلچسپی لینی شروع کی تو وہ خاص ہندوستان اور اس کے باشندوں کے دلی جذبات وخیالات سے واقفیّت حاصل کرنے کی غرض سے نہ تھی، بلکہ ان کا مقصد تمام تر ANGLO INDIAN (ہندوستانی انگریزوں) سے واقف ہونا تھا۔ اگرچہ اکثر انگریز سیّاحوں نے ہندوستان کے حالات اپنی کتابوں میں صحیح اور معتبر درج کیے ہیں، لیکن بعد کے مصنّفین کی طرح انہوں نے بھی ہندوستانیوں کے دلی جذبات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی وجہ سے عرصہ دراز سے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان اجنبیّت کا پردہ حائل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی خود ہندوستان کے انگریزوں (یعنی اینگلو انڈین طبقے) میں بھی لکھنے والے پیدا ہوگئے اور انہوں نے ہندوستان کی نسبت بہت ٹھوس مواد اکٹھا کرکے عام معلومات میں اضافہ کیا۔ اسی زمانہ میں سر ولیم جونس[1] JONES جیسا علوم مشرقیہ کا متبحر عالم ہندوستان آیا جس

---

[1] سر ولیم ۱۷۸۳ء میں فورٹ ولیم کی عدالت عالیہ کا جج بنکر ہندوستان آیا، یورپی السنہ کے علاوہ فارسی اور سنسکرت زبانوں پر کافی عبور رکھتا تھا۔ ۱۷۸۴ء میں اس نے کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جو ابتک قائم ہے۔ اس علمی انجمن کے رسالہ (جرنل) میں ہندوستان کی ادبی، تاریخی اور عصری تحقیقات پر بہت بلند پایہ مضامین شائع ہوچکے ہیں۔

نے اس کے رخِ روشن سے ناواقفیت اور جہالت کے تاریک پردہ کو اُٹھایا۔ اور اُس کے حسنِ اصلی کا جلوہ اپنے ہم قوموں کو دکھایا، چنانچہ اس کی محققانہ تحریرات ان کی شاہد ہیں، بایں ہمہ اُن کا شمار کسی طرح انگریزی ادبیات میں نہیں ہو سکتا، بہر نوع اس طرح انگلستان والوں کو ہندوستان کے صحیح اور معتبر حالات معلوم ہونے لگے جس سے دونوں ملکوں کے درمیان صحیح مفاہمت کے ذرائع پیدا ہو گئے۔

لارڈ میکالے

ہندوستان کے متعلق لکھنے والے انگریز مصنفین میں لارڈ میکالے مستثنیٰ قابلیت کا مسلمہ انشاپرداز ہے جو اپنی پُرزور اور رواں طرزِ تحریر کی وجہ سے بہت مقبول ہوا اور ہندوستان میں قیام کی بنا پر ہندوستانی مباحث پر اس کی تحریریں مستند سمجھی جانے لگیں۔ کلائیو اور ہیسٹنگز پر اس کے مضامینؔ آج بھی "کلاسیکل" شمار کئے جاتے ہیں، حالانکہ مابعد کی تحقیقات نے ان کی تاریخی اہمیت کو بہت کچھ گھٹا دیا ہے۔ تعجب ہے کہ ہندوستان سے اس قدر دلچسپی رکھنے کے باوجود میکالے ایک جگہ ہندوستانی ادب کی تحقیر کرتا ہے جس سے اس کو برائے نام بھی آگاہی نہیں ہے، چنانچہ اس کے نزدیک یونانی شاعر ہوریس (HORACE) کی ایک نظم تمام مہابھارت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور انجیل کی کتاب پیدائش رگ وید اور قرآن مجید سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی ہےؔ۔

اس میں شک نہیں کہ میکالے نے ہندوستان کے انگریزی تخیل پر جو اثر ڈالا ہے وہ بہت کم لوگ ڈال سکے تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے اثرات تمام تر اچھے ہی تھے۔ اسی شاندار طرزِ تحریر کی بدولت

لہ ملاحظہ کیجئے HISTORICAL ESSAYS   ؔ قدیم روم کے گیت (لیز آف انشنٹ روم)

اس کو وہ پایۂ استناد ملا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔ ہندوستان سے اس کی سچی ہمدردی صرف اس موقعہ پر ظاہر ہوئی جبکہ اس نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"انگلستان کے لئے وہ دن نہایت قابل فخر ہوگا جب وہ اعتماد اور رضامندی کے ساتھ ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ سپرد کر دے گا"۔ [۱]

کمپنی کے عہد تک ہندوستان کا حصّہ انگریزی ادبیات میں صرف یہی تھا کہ چند سفرنامے بعض تاریخی مضامین، نثر و نظم میں بعض حوالہ جات و اشارات پائے جاتے تھے۔ برک اور میکالے کے بعد اسکاٹ اور تھیکرے کے ناولوں میں اور ٹینی سن کی نظموں میں ہندوستان کا صحیح تخیّل پایا جاتا ہے جو براہ راست حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی اس موضوع پر بہت صریح اور ضخیم تھا۔ مستشرقین کی تحقیقات نے انگریزی شعراء کو صحیح ہندوستانی تخیّل بہم پہنچایا تھا چنانچہ رابرٹساؤتھے SOUTHEY نے سر ولیم جانسن کی تصانیف کو پڑھ کر THE CURSE OF KEHAMA (کہامر کی بد دعا) کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں افسانہ کے پیرایہ میں ہندو اساطیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح BYRON (بائرن) نے اپنی نظموں GIAOUR (گیاور) اور BRIDE OF ABYDOS (عروس عبیدوس) [۲][۳] میں، اور SHELLY (شیلی) نے ALASTOR (الاسٹر) [۴] میں ہندوستانی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نیز اپنی ایک مختصر نظم INDIAN AIR ("نسیم ہند") میں اس نے خاموش اور ساکن چشمہ کو

---

[۱] تقاریر میکالے۔ [۲] و [۳] یہ دونوں ترکی قصّے ہیں جن میں مشرقی خصوصاً اسلامی خیالات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دو ایک جگہ ہندوستان کی نسبت بعض اشارے پائے جاتے ہیں۔ دیکھو کلیات بائرن (چنڈوس کلاسکس) صفحات ۱۷۷ تا ۱۸۷۔ اور صفحات ۱۸۷ تا ۱۹۹۔ [۴] یہ نظم بھی مشرقی تخیّل کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں دریائے سندھ اور وادی کشمیر کا ذکر ہے۔ کلیات شیلی ص ۵۴ (چنڈوس)

ہواؤں کا چھیڑنا، چمپا کی خوشبوئیں مہکنا بلبل کے زار و نالے وغیرہ کا نقشہ کھینچا ہے[1] آئرلینڈ کے مشہور شاعر ٹامس تمور نے "لالہ رخ" نام کی ایک طویل نظم لکھی ہے[2] جس کا پلاٹ پنجاب اور کشمیر کی سرسبز و شاداب سرزمین ہے۔ اس منظوم فسانہ کی ترکیب میں بہ نسبت ہندوستانی کے مشرقی عناصر زیادہ ہیں اور اگرچہ تمور کے زمانہ کے سیّاحوں کے روزنامچوں اور مورخین کی تصانیف میں ہندوستانی تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق کافی ذخیرہ موجود تھا تاہم اس نے ان سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ اس کے بیانات میں بجائے اصلیت کے زیادہ تر افسانویت کا رنگ بھر گیا ہے اور غیر ہندی عناصر اس میں شامل ہو گئے ہیں اور اگرچہ ادبی لحاظ سے یہ ایک شاہکار کہی جا سکتی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مشرقی تخیّل نے اس کی وقعت کو مغربی نقادوں کی نظروں میں گرا دیا ہے، چنانچہ اس کی نسبت یہ قول مشہور ہے کہ "اس کو نہ پڑھنے سے کوئی زیادہ تہی مایہ نہیں ہو جاتا" اسی طرح "کہامہ کی بد دعا" بھی ایک روکھی پھیکی نظم خیال کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ والٹر اسکاٹ جیسے کامیاب افسانہ نویس کا ناول SURGEN'S DAUGHTER (جرّاح کی لڑکی) جو ایک اینگلو انڈین افسانہ ہے اس کی دیگر شاہکار تصانیف کے مقابلہ میں بہت پست سمجھا جاتا ہے۔

مسیحی مبلّغین کی ادبی کوششیں

عیسائی مشنریوں نے جو مذہبی اور مناظرانہ لٹریچر پیدا کر دیا ہے اس کو انگریزی ادبیات میں جگہ نہیں دی جا سکتی لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انہوں نے لسانی تحقیقات کے ذریعہ سے

---

[1] کلیات شبلی صفحہ ۵۱۵ (چندوس کلاسکس)

[2] اس نظم کا پہلے اردو میں نادر کاکوروی نے ترجمہ کیا جو ان کے مجموعہ منظومات جذبات نادر حصہ دوم کے ساتھ چھپکر شائع ہو چکا ہے دوسرا ترجمہ نثر میں لطیف احمد صاحب اکبرآبادی نے کیا ہے جو پہلے نگار میں باقساط اور پھر مستقل کتابی طور پر شائع ہوا ہے۔

ہندوستانی معاملات کو جاننے اور سمجھنے کا راستہ نکالا۔ اور گو مسیحی مبلّغین کی ان ادبی کوششوں کا نتیجہ کچھ زیادہ قابلِ تحسین نہیں نکلا، تاہم ہندوستانی خیالات پر مسیحی اثرات کے پیدا کرنے میں ان کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں، ان کی سب سے قابلِ قدر کوشش انگریزی زبان کی اشاعت و ترویج تھی اور اس لحاظ سے انہیں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔

مؤرّخین ان سے بھی زیادہ انگریزی ادبیات میں اضافہ کرنے کا باعث وہ مؤرخین ہوئے ہیں جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے اور اگرچہ ان کی تصانیف انگریزی کے نامور مورخین کے ہم پلہ نہیں سمجھی جاتی ہیں تاہم وہ مستند تصانیف تسلیم کرلی گئی ہیں ان مؤرخین میں مِل، ہنٹر، الیٹ اور الفنسٹن نے ہندوستان کی تاریخ کے متعلق مفصّل اور ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ کننگھم نے سکھوں کی تاریخ اور ٹاڈ نے راجستھان کے حالات لکھے ہیں۔ مالیسن، ایڈورڈ ڈیز کے سوائی اور مورخین کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا جاسکتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شعراء کے خیالی افسانوں اور سیّاحوں کے سفرناموں کی جگہ علمی تحقیقات اور تاریخی تفتیش نے لے لی تھی۔

فنون ہندوستانی فنونِ لطیفہ کی طرف بھی توجہ کی گئی، ہندوؤں کی شاعری اور فنِ ڈرامہ پر انگریزی زبان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے چنانچہ سر ولیم جونس کی تصانیف اور ایشیاٹک ریسرچز کی جلدیں اس کی شاہد ہیں۔ اس سلسلے میں ہندو ڈرامہ پر وِلسن کی زبردست تصنیف خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور غالباً اسی کتاب کے مطالعہ نے زمانۂ حال کے سنسکرت کے سب سے بڑے ماہر فرانسیسی مستشرق سلوین لیوی کو ہندوستانی آرٹ کے متعلق طولانی تحقیقات پر آمادہ کیا۔ مشہور انگریزی ادیب اور ماہر فنونِ لطیفہ جان رسکن بھی ہندوستان کے آرٹ سے ناواقف نہیں تھا، مگر اس کی حالت بالکل میکالے کی سی ہے جو استاد ماہر کی حیثیت سے لکھنے کا تو مدعی ہے مگر اس فن سے ذرا بھی واقف نہیں ہے۔

ادب اور افسانہ ہندوستان سے اس قدر واقفیت، میل جول اور سیاسی و تمدنی تعلقات کے باوجود اہل انگلستان نے اہل ہند کے متعلق جو قصے اور ناول لکھے اُن میں وہ ہندوستانی معاشرت کا کوئی قابل قدر نمونہ پیش نہ کر سکے۔ ان فسانہ نگاروں نے اپنے ناولوں کو زیادہ تر ہندوستانی انگریزوں ہی تک محدود رکھا ہے جن میں کبھی کبھی ایک آدھ ہندوستانی کیرکٹر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسکاٹ اور تھیکرے نے اس کو بہت ترقی دی مگر ان کے بعد کے مصنفین نے صحیح ہندوستانی زندگی کا کوئی مرقع پیش کرنے کی کوشش نہیں کی، اگرچہ رڈیارڈ کپلنگ ابتدا میں اینگلو انڈین قصے لکھتا رہا لیکن اس نے اپنے مشہور ناول KIM (کم) میں حسن زبان و بیان کے علاوہ ہندوستانی زندگی کی صحیح تصویر کھینچی ہے۔

MRS DIVER (مسز ڈائیور) اور MRS DELL (مسز ڈیل) خاص کر اُن افسانہ نگاروں کے طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جو اپنے قصوں میں ایک آدھ ہندوستانی بھی داخل کر دیتی ہیں۔ اور مسز فلورا اسٹیل کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے پر ان کی تصویریں اکثر غیر صحیح معلوم ہوتی ہیں بغرض انگریزی افسانوں سے ہندوستان کی نسبت صحیح معلومات نہیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ آئے دن ہندوستان پر تصانیف کا سیلاب امڈا چلا آ رہا ہے۔

صنعت صنائع لطیفہ خصوصاً تعمیراتِ ہند پر سر جان مارشل اور مسٹر ہاویل اس گروہ کے نمایندے کہے جا سکتے ہیں، جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ کا صنعت اور تعمیرات کے ذریعہ مطالعہ کیا ہے۔ ہندوستان کی بعض خاص اقوام کی نسبت لکھنے والوں میں آسام کی ناگا قوم پر مسٹر ہوٹن نے ایک کتاب بطور مونوگراف لکھی ہے۔ جو اس موضوع پر پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے۔

تاریخ و سیاسیات سیاسیات کے دائرہ میں زمانۂ حال کے مصنفین میں سر ویلنٹائن شرول کا نام کافی طور پر گوش آشنا

ہو چکا ہے۔ ان کی کتاب "ہندوستان میں سیاسی اضطراب" بہت مشہور ہے۔ اسی طرح قدیم ہندوستان کی تاریخ پر ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ بہت مستند مانے جاتے ہیں، چنانچہ ان کی کتابیں اکبر اور اشوک کے متعلق ہندوستانی حکمرانوں کے سلسلہ میں بہت محققانہ اور مستند مانی جاتی ہیں۔

ان بے شمار ناموں میں سے جنہوں نے ہندوستان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ یہ چند نام خاص طور پر مشہور ہیں اور اگر اب مصنفین کی مکمل فہرست پیش کی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ اس لئے اس مختصر سے مضمون میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

ہندوستانی مصنفین

اس سلسلہ میں خود ہندوستانی مصنفین اور انشا پرداز بھی "واسطۃ العقد" سمجھے جا سکتے ہیں خصوصاً پچھلے چند برسوں میں ہندوستانیوں نے اپنے ملک کی نسبت انگریزی ادب میں معتدبہ اضافہ کیا ہے۔

شاعری اور ادب میں بہت کم ہندوستانیوں نے نام پیدا کیا ہے۔ اس لئے کہ ایک غیر زبان میں شعر اور اچھے شعر کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے تاہم اس فہرست میں طبقۂ رجال میں سر ٹیگور اور طبقۂ نسواں میں مس تورودت[1] اور مسز سروجنی نائیڈو نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ حیدر آباد کے ایک مسلمان بزرگ "نظامت جنگ" بھی انگریزی شعر کہنے پر قدرت رکھتے ہیں، گو اُن کی نظمیں عموماً بہت مختصر ہوا کرتی ہیں۔

ہندوستان کے انگریزی ادیبوں میں ایس۔ ایم۔ مترا[1]، بابو رومیش چندر دت[2]

---

[1] انہوں نے ہندو پور نام کا ایک نیم سیاسی ناول لکھا ہے جو انگریزی حلقوں میں بھی بہت مقبول ہوا ہے۔

[2] بنگال کا یہ نامور مصنف اپنے تمام معاصرین میں بہت ممتاز تھا، وہ نہ صرف ایک قابل ادیب تھا بلکہ ایک سیاسی، تاریخی قانونی اور ادبی انشا پرداز بھی تھا۔ اس وقت متعدد تصانیف انکی یادگار ہیں جن میں ایک ناول "کنز آگرہ" ہندوستان کا قدیم تمدن، راماین اور مہابھارت کے انگریزی تراجم ہیں۔ مس تورو دت انہی کی بھتیجی تھیں۔

(آنجہانی) سردار جوگیندر سنگھ[1] اور اقبال[2] علی شاہ افسانوی ادب میں امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے مشاہیر اہلِ قلم ابھی تحقیقات کے میدان میں سرگرمِ خرام ہیں اور اہم ہندوستانی موضوعات مثلاً ویدوں کی قدامت، آریاؤں کا خروج، ہندوستانی تاریخ کا آغاز، عہدِ گپتا کی شان و شوکت، اشوک اور سری ہرش کی سلطنتیں، مرہٹوں کا عروج، ہندوستان قرونِ وسطیٰ میں، عہدِ مغلیہ کی تاریخی تحقیقات، وغیرہ ہیں جنہوں نے جنیسوال اور تلک، بھنڈارکر اور کرشن سوامی آئنگر، جادوناتھ سرکار، اور عبداللہ یوسف علی جیسے مشہور انشا پردازوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں آنریبل سید امیر علی مرحوم (رکن پریوی کونسل) انگریزی کے ایک نامور انشاپرداز تھے، چنانچہ لنڈن یونیورسٹی نے آپ کو ایل۔ایل۔ڈی کی اعزازی سند دیکر آپ کی ادبی قابلیت کا اعتراف کیا تھا۔ آپ کی تصنیف میں کئی ضخیم کتابیں ہیں جن میں اسپرٹ آف اسلام، ہسٹری آف سارا سین بہت مشہور ہیں۔ قانون پر ان کی کتابیں بہت مستند مانی جاتی ہیں، سیاسیات اور تعلیم پر لکھنے والوں میں نواب عماد الملک بلگرامی اچھے انگریزی انشا پرداز تھے۔ قرآن مجید کے چند پاروں کا ترجمہ بھی آپ نے انگریزی میں کیا تھا۔ اسلامی موضوعات پر مسٹر صلاح الدین خدابخش (مرحوم) کی تصانیف اور تراجم بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

دنیائے صحافت میں مولانا محمد علی مرحوم (سابق مدیر کامریڈ) سید حسین (سابق مدیر کرانیکل) مسٹر عبداللہ بریلوی، بابو راما نند چٹرجی (ایڈیٹر ماڈرن ریویو) مسٹر

---

[1] کسی وقت یہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" کے ایڈیٹر تھے تین چار ناول ان کے قلم سے نکلے ہیں جو انگلینڈ میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں "نسرین" پنڈت رتن ناتھ در کے "جام سرشار" کا چربہ ہے ان کا ایک اور ناول "نور جہاں" کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

[2] انگریزی رسائل میں ان کے مختصر قصّے چھپتے رہے ہیں، دو ایک کتابیں ان کی تصنیف سے ہیں۔

نیشن (ایڈیٹر انڈین ریویو) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہندوستانی صحافت کی بہت بڑی خدمات انجام دی ہیں۔

اسی طرح فلسفہ، اقتصادیات، معاشیات وغیرہ پر ہمارے ہندوستانی علماء نے مغربی تعلیم سے استفادہ کر کے لکھنا شروع کر دیا ہے لیکن ان چند ناموں سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ملک میں دوسرے انگریزی زبان کے اچھے لکھنے والے نہیں ہیں، یہ صرف چند مشہور نام ہیں جو ہم نے پیش کئے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس معاملہ میں اہل مغرب ہی ہمارے رہنما ہیں۔ وہی مارلو اور ڈرائیڈن کی لغویات سے اٹھا کر برک اور میکالے کی محدود معلومات سے گزرتے ہوئے ہمیں اس وسیع النظری اور بصیرت کی طرف لے گئے ہیں۔ جس سے ہم ہندوستانی فلسفہ، ہندوستانی ڈرامہ اور اسلامی تاریخ و تمدن کی عظمت سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اب یہ برادران وطن کا کام ہے کہ وہ اہل مغرب کو اپنے صحیح علوم اور صحیح تہذیب و تمدن سے آگاہ کریں اور بتا دیں کہ دنیا کے تمام ممالک میں ہندوستان ہر حیثیت سے علوم و فنون سے مالا مال ہے اور اس کے باشندے ہر لحاظ سے دنیا کی تمام بڑی بڑی اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہیں۔

اُردو کا صحافتی ادب

اُردو صحافت نے ہماری زبان اور ادب پر زبردست اثر ڈالا ہے چنانچہ گذشتہ سو سال میں ہمارے ادب نے جو تیز رفتار ترقی کی ہے۔ اس کا سب سے بڑا محرک اور سبب اُردو کے اخبارات اور رسائل ہیں۔ تعجب ہے کہ اب تک اردو صحافت کے متعلق ہماری ادبی تاریخوں میں چند اخباروں اور رسالوں کا ذکر کرنے کے سوا کوئی تفصیلات نہیں ملتیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے مورخین ادب نے اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں سمجھی اور اس لئے ان کو اپنی تصانیف میں جگہ نہیں دی، حالانکہ کوئی تاریخ ادب اردو رسائل و اخبارات اور ان کے مدیروں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ اردو صحافت ہمارے ادب کے ایک جزو اعظم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور زبان اُردو کی ترویج و اشاعت کا زبردست آلۂ کار ہونے کے اعتبار سے اس کی مفصّل تاریخ مرتّب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ جہاں علمی و ادبی نیز تاریخی لحاظ سے اس کی اہمیت آشکارا ہے؛ وہاں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ہماری ملکی اور قومی تاریخ اور ہمارے معاشرے کے مذہبی اخلاقی تعلیمی سیاسی اور علمی و ادبی محرکات اور عوامل کو معلوم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہو گی۔

ہندوستان میں صحافت کا آغاز انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت سے ہوتا ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمرانوں وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس

کے عہد میں وہ انگریزی اخبارات کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اگرچہ یہ صحافت تمام تر انگریز اخبار نویسوں کے ہاتھوں میں تھی اور انگلستان اور یورپ سے آنے والے یورپیوں کے تجارتی اور معاشی مقاصد اور حکومت کے سیاسی مفاد کے لئے وقف تھی تاہم اس نے تعلیم یافتہ طبقہ میں جدید خیالات کی اشاعت اور ان کی تعلیمی اور سیاسی بیداری میں بڑا حصّہ لیا گو ساتھ ہی عام رعایا کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی اور حکمرانوں تک ان کی آواز پہنچانے کے لئے یہ اخبارات زیادہ مؤثر نہ تھے اور اسی لئے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ ملکی زبانوں میں اخبار جاری کئے جائیں، چنانچہ رفتہ رفتہ مختلف صوبوں میں زیادہ تر اردو میں اور بعض صوبوں کی زبانوں میں اخبارات جاری ہوئے۔ روز بروز اخبارات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور ہندوستان کا کوئی صوبہ بلکہ کوئی بڑا شہر خالی نہ رہا جہاں سے دیسی زبانوں میں اخبارات نہ نکلتے ہوں ان میں اردو کے اخبارات ورسائل تعداد کے لحاظ سے سب زبانوں سے زیادہ تھے کیوں کہ یہی ملک کے بہت بڑے حصّے میں بولی جاتی تھی اور اس کو ایک عام ملکی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اردو اخبارات بھی شروع میں صرف سیاسیات اور اجتماعیات تک محدود تھے، لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے مختلف ضروری موضوعات کا احاطہ کر لیا اور اس معاملے میں وہ انگریزی اخبارات سے بھی آگے نکل گئے چنانچہ سیاسیات اور قومیات کے علاوہ مذہبی اور تعلیمی و علمی ادبی موضوعات بھی ان کے دائرہ عمل میں آگئے۔ ان جرائد ورسائل کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کہ ان کی بدولت انگریزی تعلیم اور اسکی وجہ سے جو تحریکات وجود میں آئیں۔ ان سے ہندوستان کے عوام کو باخبر رکھنے اور جدید مغربی تعلیم و تمدن کے اثرات سے جو خیالات پیدا ہوئے ان کی اشاعت کرنے کا وہ بڑا مفید اور کارآمد ذریعہ ثابت ہوئے۔ لیکن اس مختصر مضمون میں ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ان اخبارات ورسائل نے ہماری زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور

ان کی ترقی میں کس قدر حصّہ لیا؛ خصوصاً زبان اُردو کے ارتقاء کے لئے یہ کس حد تک موثر عوامل ثابت ہوئے۔ ہماری رائے میں شستگی روانی اور ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کی جو وسعت اور قدرت گذشتہ ایک صدی میں اُردو کو حاصل ہوئی ہے۔ اس میں اُردو صحافت کا زبردست حصّہ ہے اور اس لحاظ سے ہمارا صحافتی ادب اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی مفصّل تاریخ سے ملک و قوم کو روشناس کیا جائے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ڈچ عیسائی مبلّغین کی بدولت مدراس میں پریس قائم ہوا جس کا ٹائپ رومن رسم الخط کا تھا۔ ۱۷۹۶ء میں گوٹن برگ کے ایک موجد نے لیتھو یعنی پتھر کا چھاپا ایجاد کیا اور ۱۸۳۶ء میں ہندوستان میں بھی لیتھو پریس قائم ہوا۔ اسی سال سے اُردو صحافت کی ابتدا ہوئی؛ چنانچہ اُردو زبان کا پہلا اخبار اُردو اخبار تھا، جسے مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے جاری کیا۔ خود آزاد کا بیان ہے کہ "۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلّی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا"۔ اسی زمانے میں سرسید احمد خان اور ان کے بڑے بھائی سید محمد نے مل کر "سید الاخبار" کے نام سے ایک اخبار نکالا اور جیسا کہ مولانا حالی کا بیان ہے کہ اس میں بیشتر مضامین سرسیّد ہی کے ہوتے تھے۔

اُردو کا پہلا رسالہ خیر خواہ ہند بھی دہلی سے ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا جو دہلی کالج کے پروفیسر رام چندر داس کی ادارت میں "مطبع دہلی اُردو اخبار" سے نکلتا تھا۔ انہی پروفیسر رام چندر نے محب ہند کے نام سے ایک دوسرا رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ اس کے بعد سے چند برسوں کے اندر کئی اخبارات اور رسائل نکلنے لگے۔

اُردو اخبارات کے اعداد و شمار معلوم کرنے کے لئے ہمارے

پاس سب سے بڑا ذریعہ مشہور فرانسیسی مستشرق اور شیدائے اردو موسیو گارساں دی تاسی کے خطبات اور مقالات ہیں جو اردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ یہ بوڑھا فرانیسی آج سے ایک صدی بیشتر سات سمندر پار بیٹھے بیٹھے ہندوستان کے اخبارات و رسائل کے ناموں سے واقفیت بہم پہنچاتا اور ہر سال ان پر تبصرہ کیا کرتا تھا ہندوستان میں صحافتی ادب کی روز افزوں ترقی اور اخبارات کی طرف ہندوستانیوں کے میلان کا ذکر کرتے ہوئے یہ فاضل مستشرق رقمطراز ہے:

" چھپائی کے ذکر سے خود بخود میرا خیال ایک مضمون کی طرف پہنچا جس کا تعلّق بھی ایک طرح ادب سے اور جو پہلے ایشیا میں ناپید تھا۔ مگر اب ہندوستان میں ترقی کر رہا ہے۔ میرا مطلب پریس (اخبار و رسائل) سے ہے جس کی حکومت روز بروز پھیلتی جاتی ہے اور جس نے فارغ البال بے فکرے ہندوستانی کو بھی اپنا غلام بنا لیا ہے۔ پانچ سال ہوئے (۱۸۴۸ء میں) کلکتہ میں سولہ اخبار ایسے تھے جو دیسی باشندے نکالتے تھے پانچ ہندوستانی میں نو بنگالی میں اور دو انگریزی میں۔ بمبئی میں تین یا چار ہندوستانی اخبار ہیں بمبئی کا ہرکارہ، اخبار دفتر، جزیرہ بمبئی، تازہ بہار وغیرہ، چند اخبار سری رام پور، مرزا پور، بھرت پور، ملتان، بریلی، اندور وغیرہ میں بھی ہیں۔ (خطبات ص ۱۸۰) چنانچہ اس فاضل محب اردو کا بیان ہے کہ ۱۸۴۹ء میں صرف ایک صوبہ جات مغربی و شمالی میں ۲۳ اخبار اور رسالے اردو کے شائع ہوتے تھے اور ۱۸۵۲ء میں یہ تعداد ۳۱ تک پہنچ گئی تھی۔ ان اخبارات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مستشرق موصوف لکھتا ہے کہ " آگرہ سے مطبع الاخبار جو شہر آگرہ میں خوب بکتا ہے۔ اخبار الحقائق جو ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ اور اسد الاخبار جو ہفتہ میں ایک بار شائع ہوتا ہے ایک اور اخبار اسی شہر سے نکلتا ہے جس کا نام قطب الاخبار ہے جس میں مذہب

اسلام کے متعلق بحث ہوتی ہے۔اس میں اخبار (احادیث) اسلام انبیاء شہدا اور اولیائے اسلام کے حالات شائع ہوتے ہیں اور قدیم مصنّفین کی کتابوں سے اقتباسات بھی درج کیے جاتے ہیں۔ معیار الشعراء ایک ادبی رسالہ ہے جس میں قدیم و جدید شعرا کا کلام درج ہوتا ہے۔ اخبار النواح پہلے ایک علمی پرچہ تھا۔ مگر اب معمولی خبروں کا اخبار ہے۔ اگر اب ہم دلی کی طرف رجوع کریں تو وہاں سراج الاخبار ہے جو اس شہر کا سب سے پرانا اخبار ہے دہلی اردو اخبار۔اردو میں چھپتا ہے۔ مظہر الحق کے ایڈیٹر ایک صاحب محمد علی ہیں قران السعدین ایک باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے ہفتہ میں ایک بار پیر کے روز شائع ہوتا ہے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی جس کا نام فوائد الناظرین ہے اس میں علاوہ خبروں کے مضامین بھی چھپتے ہیں جو انگریزی ذرائع سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

" میرٹھ میں دو ہندوستانی اخبار ہیں۔ ایک مفتاح الاخبار ہے جس کے ایڈیٹر محبوب علی ہیں۔ دوسرا جام جہاں نما ہے۔ بنارس میں جو ہندوستانی اخبار ہیں۔ ان میں سے دو اخباروں کا ایک ہی ایڈیٹر ہے۔" بنارس" ہندی اور اردو میں نکلتا ہے۔ بنارس کا ہرکارہ ۱۸۵۱ء سے اب تک نکل رہا ہے۔"

" بریلی سے عمدۃ الاخبار شائع ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر لکشمن پرشاد ہیں۔ مرزاپور سے خیر خواہ ہند نکلتا ہے، شملہ اخبار شملہ سے شائع ہوتا ہے۔ اسے شیخ عبداللہ مرتب کرتے ہیں۔ اندور کا اخبار جو مالوہ کا دارالحکومت ہے مالوہ اخبار ہے۔ ۸ صفحوں کا ہفتہ وار ہے ایڈیٹر دھرم نرائن ہیں۔ بھرت پور صوبہ آگرہ میں ہے۔ وہاں کا اخبار مظہر السرور راجہ بھرت پور کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔"

پنجاب کے اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے دتاسی لکھتا ہے کہ

"دریائے نور لاہور کا اخبار ہے۔ دوسرا جو ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے کوہ نور ہے۔ لدھیانہ کا اخبار نور علیٰ نور ہے جسے محمد حسین نے ۱۸۵۱ء میں جاری کیا تھا۔ امرتسر سے باغ نور اور ملتان سے ریاض نور نکلتا ہے۔"

۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے دہلی میں آٹھ اخبار شائع ہوا کرتے تھے مگر وہ سب کے سب شورش کے دوران میں ختم ہو گئے تھے۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق صوبجات مغربی و شمالی میں ۲۶ ہندوستانی اخبارات شائع ہوتے تھے۔ پہلی جنوری ۱۸۵۳ء تک ان اخبارات کی تعداد ۳۰ ہو گئی تھی اور ۱۸۵۴ء تک ۳۳ اخبارات ان صوبجات میں موجود تھے ان اخبارات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر دتاسی لکھتا ہے۔

"یہ اخبار بہت کامیاب ہوتے کیونکہ ان میں دلچسپ مضامین اور خبریں شائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور تاریخ و جغرافیہ، ریاضیات اور تعلیم پر اکثر پرمغز اور مفید مضامین نکلتے رہتے ہیں ان اخبارات کا طرز تحریر بہت پاکیزہ ہوتا ہے لیکن پرتکلف نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان میں بڑے اور شاندار الفاظ و استعارات کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ جیسے مشرقی لوگ عام طور سے استعمال کرتے ہیں۔

۵۳ء میں بنارس سے ایک اردو اخبار آفتاب ہند کے نام سے جاری ہوا تھا۔ یہ اخبار اپنے مخصوص طرز تحریر اور اعلیٰ علمی اور ادبی مضامین کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اسی سال ضلع علی گڑھ کے قصبہ کول سے ایک اردو جریدہ فتح الاخبار کے نام سے نکلا۔ جو بہت سادہ اور سلیس زبان میں شائع ہوتا تھا۔ گوالیار سے ۱۸۵۳ء سے ایک سرکاری اخبار نکلتا تھا جس کا ایڈیٹر ایک لکشمی پرشاد تھا۔ اس سے قبل ہی ایڈیٹر بریلی سے ایک اخبار نکالتا تھا جس میں اکثر تحقیقی ادبی دلچسپی کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ مثلاً ایک مضمون میں دہلی

اور لکھنؤ کی زبان اُردو کا مقابلہ کیا گیا تھا۔"

۱۸۵۳ء سے ملتان سے ایک اور اُردو اخبار شائع ہوا اس کا نام شعاع شمس تھا جو مہاراجہ ہلکر کی سرپرستی میں ایک لائق درویش غلام نصیر الدین کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۵۳ء سے سیالکوٹ سے ایک اخبار چشمۂ فیض کے نام سے جاری ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ۵۷ء کے غدر کے بعد کچھ مدت تک اُردو اخباروں پر بھی مصیبت نازل ہوئی اور ان میں سے اکثر بند کر دیئے گئے لیکن اس کے بعد دو تین سال کے اندر ہی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ سے دوگنی تعداد میں اخبارات نکلنے لگے تھے۔ چنانچہ پروفیسر دتاسی کا بیان ہے کہ:

"۱۸۵۹ء میں میں نے جو تقریر کی تھی اس کے بعد مجھے اطلاع ملی ہے کہ اردو اور ہندی زبانوں کے متعدد اخبارات شائع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ سورت میں جہاں سے کوئی اُردو کا اخبار شائع نہیں ہوا تھا مئی ۱۸۶۰ء سے باقاعدہ ایک ہفتہ وار جاری ہوا ہے۔ اس کی زبان نہایت فصیح ہے اس سورت کے اخبار کا نام منظور الاخبار ہے۔ مدیر کا نام محمد منظور ہے۔"

اس کے پانچ سال کے بعد ہمارا فرانسیسی مستشرق اردو اخبارات کی کثرت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"۲۷ فروری ۱۸۶۴ء کے ٹائمز میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے اخبارات نکل رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی ادارت کے فرائض اچھے طریقے سے ادا کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض اخبارات کے مضامین دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مضمون نگاروں کی نظر وسیع ہے اور وہ انگریزی ادبیات اور انگریزی فن صحافت سے واقفیت رکھتے ہیں۔"

۱۸۶۵ء میں اُردو اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوا جو غیر معمولی تھا اس کو دتاسی نے اُردو کی ترقی سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

"ہندوستانی زبان کی ترقی کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ برابر ہر سال اس زبان کے نئے اخباروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پچھلے سال ۱۸۶۴ء نئے اخبارات غیر معمولی طور پر زیادہ نکلے ہیں۔ چنانچہ صوبہ شمالی مغربی کے بعض شہروں میں جہاں سے ایک اخبار بھی نہ نکلتا تھا۔ اب کئی نکلتے ہیں۔ یہی حال پنجاب اور بمبئی کا ہے۔ افغانستان اور سندھ سے بھی اُردو اخبارات نکلنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد اس نے اخبارات کی حسب ذیل تفصیل بیان کی ہے:۔

۱۔ دلکشا۔ اُردو میں فتح گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔

۲۔ شعلۂ نور۔ کانپور سے شائع ہوتا ہے۔

۳۔ احسان الضیا بریلی سے نکلتا ہے ہفتہ وار ہے مدیر کا نام احسان محمد ہے۔

۴۔ آئینۂ ہند۔ بریلی سے شائع ہوتا ہے۔ مدیر کا نام ہرداس سنگھ ہے۔

۵۔ رفاہِ خلائق۔ شاہ جہاں پور سے۔

۶۔ نورِ نظر، بلند شہر سے نکلتا ہے۔ اس کے مدیر شیو پرشاد ہیں۔

۷۔ مظہر العجائب۔ رُڑکی سے شائع ہوتا ہے ہفتہ وار ہے مدیر کا نام نجف علی خاں ہے۔

۸۔ لارنس گزٹ میرٹھ سے نکلتا ہے۔ ہفتہ وار ہے اس کے مدیر اسمٰعیل خاں ہیں۔

۹۔ روضۃ الاخبار۔ بمبئی سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔

۱۰۔ مفرح القلوب۔ یہ اخبار شکارپور سے نکلتا ہے۔

۱۸۶۵ء ۱۸۶۶ء میں دتاسی نے اپنے خطبات میں حسب ذیل اخبارات کی فہرست پیش کی ہے۔ جو ملک کے مختلف مقامات سے جاری ہوئے تھے۔

۱۔ نجم الاخبار۔ میرٹھ سے شائع ہونا شروع ہوا۔

۲۔ کانپور گزٹ۔ منشی نولکشور اس کے مدیر ہیں۔

۳۔ مجمع البحرین ۔ لدھیانہ سے شائع ہوتا ہے اس کے مدیر بنسی دھر ہیں۔

۴۔ کارنامۂ ہند۔ خواجہ محمد ہاشم کے زیرِ ادارت سوہنہ ضلع گوڑگانو سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ستمبر ۱۸۶۶ء میں نکلی تھی۔ اخبار عالم کے مدیر وجاہت علی نے اس اخبار کے طرزِ تحریر اور اس کے تنوع کی بہت تعریف کی ہے۔

۵۔ پنجابی۔ اس اخبار کے مدیر اور مالک محمد عظیم ہیں۔ یہ اردو اخبار لاہور سے شائع ہوتا ہے۔

۶۔ خیر خواہ پنجاب ۔ ایک جدید رسالہ دسمبر ۱۸۶۵ء سے نکلنا شروع ہوا ہے۔

۷۔ نیر۔ راجستھان جے پور سے ہفتہ وار نکلتا ہے۔

۸۔ شمس الاخبار مدراس سے ہر دسویں دن شائع ہوتا ہے۔

۹۔ عمدۃ الاخبار 〃 〃

۱۰۔ مظہر الاخبار 〃 〃

۱۱۔ اخبار صبح صادق۔ مدراس سے مہینے میں ۴ بار شائع ہوتا ہے کبھی کبھی اس کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی ہوتا ہے جس میں ادبی مضامین ہوتے ہیں۔

۱۲۔ ریاض الاخبار۔ مدراس سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے اس کے مدیر سید حسین ہیں۔

۱۳۔ برق خاطف: بمبئی ایڈیٹر مظفر حسین ۔

۱۴۔ کارنامہ لکھنؤ ۔

۱۵۔ قاسم الاخبار بنگلور ۔

۱۶۔ مجمع البحرین ۔ حیدرآباد ۔

۱۷۔ سہیل ۔ پنجاب ۔

۱۸۷۱ء میں اردو کے ۶۰ مختلف اخبارات ہندوستان کے چار صوبوں پنجاب، صوبجات شمال مغربی، اودھ اور صوبۂ متوسط سے شائع

ہوتے تھے۔ صوبجات متحدہ کے اُردو اخبارات کی تعداد ۱۸۶۹ء میں ۲۶ تھی ۱۸۷۰ء میں ۳۳ تھی اور ۱۸۷۲ء میں اس سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

۱۸۷۰ء میں صوبہ شمال مغربی میں آٹھ رسالے شائع ہوتے تھے جن میں سے ۶ رسالے اُردو کے تھے۔

(۱) چشمہ علم۔ پٹنہ، (۲) کوہ طور پندرہ روزہ لاہور (۳) منشور محمدی بنگلور، (۴) عمدۃ الاخبار بھوپال (۵) عمدۃ الاخبار بریلی (۶) اُردو گائڈ کلکتہ۔

۱۸۶۲ء میں سرسید نے علی گڑھ سے انسٹیٹیوٹ گزٹ نکالا اور ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ آخرالذکر پرچے نے ہمارے علم، خصوصاً زبان اور طرز بیان پر جو اثر ڈالا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اردو اخبارات میں سب سے زیادہ قابل قدر اودھ اخبار رہے جو ۱۸۵۸ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار نے ملک کے مشہور ادیبوں کو روشناس کرانے اور ان کو ادبی دنیا میں آگے بڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ چنانچہ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولوی عبدالحلیم شرر ایسے ایسے اُردو کے زبردست اور نامور ادیب اسی اخبار کی بدولت شہرت کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ اوّل الذکر ایک مدت تک اس کے ایڈیٹر بھی رہے اور اسی اخبار میں ان کا لاجواب اور مشہور فسانۂ آزاد بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس کے متعلق دتاسی کا بیان ہے کہ:

"اُردو کے سب اخباروں میں اودھ اخبار بہترین خیال کیا جاتا ہے اس کے مضامین دلچسپ تھے۔ اس کے اور مضامین بھی اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ جن کا مقابلہ ہمارے اخباروں کے مضامین سے کیا جا سکتا ہے" خطبات ص ۶۱۹

۱۸۶۷ء میں اُردو کے مندرجہ ذیل نئے اخبارات جاری ہوئے۔

(۱) آئینۂ علم۔ یکم اکتوبر سے آگرہ سے جاری ہوا۔

(۲) اردو اخبار۔ آگرہ مدیر بال گوبند۔

(۳) اخبار مفید الانام ۱۳ ر دسمبر سے جاری ہوا مہینے میں دو بار فتح گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔

(۴) لطیف الاخبار میرٹھ (۵) طلسم حکمت میرٹھ

۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین مرحوم نے اودھ پنچ نکالا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس نے اُردو نثر میں ایک خاص شان پیدا کر دی اور طنز و ظرافت کے مذاق سے ہمارے ادب کو آشنا کیا یہی نہیں بلکہ اس نے ایسے اچھے لکھنے والے پیدا کئے جن کے نام ہمارے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے مرزا مچھو بیگ "ستم ظریف" کے نام سے لکھتے تھے، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد برق، احمد علی کسمنڈوی، اکبر الہ آبادی اور نواب سید محمد آزاد ایسے نامور انشا پرداز اور ظرافت نگار اس کے مضمون نگاروں میں تھے۔

ہندوستانی اخبارات کی افادیت اور ان کے طرزِ نگارش کے متعلق دتاسی فاضل "محبّ، دد" کا بیان اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے۔ وہ لکھتا ہے:

"ہندوستانی اخبارات عوام کی تعلیم میں بہت مدد دے رہے ہیں اور جہالت کی تاریکی کو رفع کر رہے ہیں۔ جس قدر ان کی اشاعت بڑھ رہی ہے، اسی قدر لوگوں کی معلومات عامہ میں اضافہ ہو رہا ہے جو بغیر ان کے کسی طرح سے یہ معلومات حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یورپین لوگوں کے لئے بھی لسانیاتی نقطہ نظر سے یہ اخبارات بہت مفید ہیں جو یورپین ہندوستانی زبانوں کے متعلق تحقیق کرنا چاہتے ہیں انہیں ان اخباروں کے پڑھنے سے بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں؛ چنانچہ اسی خیال کا اظہار انڈین ڈیلی میل نے بھی (مئی ۱۸۶۷ء) کیا ہے۔ جدید انشا پردازوں کے مضامین اودھ پنچ اور اخبار عالم میں شائع ہوتے ہیں۔ ہندوستانی معاشرت کے طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ متوسط کے خیالات بھی ان اخباروں میں پیش کئے جاتے ہیں۔" (خطبات گارسان دتاسی ص ۱۴-۱۵-۶۱۴)

۱۸۸۳ء میں مشیر قیصر منشی غلام محمد خان تپش نے جاری کیا۔ اسی طرح آئینہ اور آزاد بھی اسی عہد کے مشہور ہفتہ وار اخباروں میں تھے۔ ۱۸۸۷ء میں لاہور سے مشہور اخبار جاری ہوا جس کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم تھے۔

انیسویں صدی کے اختتام پر اخبار عام پنڈت مکند رام کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس زمانے میں جو اخبارات وجود میں آئے ان میں امرتسر کا اخبار وکیل جس کے ایڈیٹر انشاء اللہ خان تھے اور گورکھپور کا ریاض الاخبار جو حضرت ریاض خیرآبادی کی ادارت میں نکلتا تھا، قابل ذکر ہیں۔ اسی صدی کے اواخر میں کئی اخبارات جاری ہوئے مثلاً دہلی سے کرزن گزٹ، اٹاوہ سے البشیر، لکھنؤ سے ہندوستانی مراد آباد سے نیّر اعظم، بدایوں سے ذوالقرنین۔ بریلی سے روہیل کھنڈ گزٹ، یو۔پی سے مہر نیم روز، پٹنہ سے اپنچ، کلکتہ سے شمس الاخبار، مدراس سے مخبر دکن وغیرہ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو صحافت کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی تھی لیکن ۱۹۱۰ء سے اس میں جوش اور حرکت پیدا ہو چلی تھی۔ ایک طرف ملک میں "قومیّت" کی تحریک خواص و عوام کے جذبات کو بھڑکا رہی تھی اور دوسری طرف سے ممالک اسلامیہ کی سیاست میں دول یورپ کے عیارانہ دخل و عمل سے مسلمانوں کے جذبات ملّی مجروح ہو رہے تھے جنگ بلقان کی سیاسی ہنگامہ آفرینیاں عام اظہار خیالات کے لئے کئی اخباروں کو وجود میں لانے کا باعث بن گئیں۔ اسی زمانہ میں (۱۹۱۰ء) میں زمیندار روزانہ نکلنے لگا تھا۔ اسی سال مسلم گزٹ لکھنؤ سے مولوی وحیدالدین سلیم کی ادارت میں جاری ہوا۔ کہتے ہیں کہ مولانا شبلی اس کے مشیر خاص اور مضمون نگاروں میں تھے۔ اس کے بعد کئی اخبارات نکلے ۱۲ء میں مولوی ابو الکلام آزاد کا الہلال کلکتہ سے ٹائپ میں باتصویر بڑی آب و تاب سے جاری ہوا۔ اس کے مخصوص طرز نگارش نے مابعد کی صحافت کا رنگ بدل دیا۔ مولانا محمد علی کا ہمدرد، سیّد جالب کا ہمدم، ظفر علی خاں کا ستارۂ صبح، سید حبیب کا سیاست، اس دور کے بہترین اخبارات میں تھے یورپ

کی جنگ عظیم کے زمانے میں اخباروں میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ میرٹھ سے عصر جدید ہفتہ وار خواجہ غلام الثقلین کی ادارت میں نکلتا تھا۔ لاہور سے انقلاب احسان، ملاپ، پرتاپ ہند اور آزاد مساوات وغیرہ امرتسر سے دہلی سے ملت، وطن، درس... تیج، لکھنؤ سے حقیقت، حق بجنور سے، مدینہ کلکتہ سے عصر جدید روزانہ بمبئی سے خلافت، اجمل، ہلال، مشیر ہند، اور اسلام، مدراس سے قومی رپورٹ، اور آزاد حیدرآباد سے پیام، صحیفہ، رہبر دکن صبح دکن، منشور، رنگون سے شیر رنگون، اور مجاہد برما، پشاور سے آزاد اور سرحد، بنگلور سے الکلام اور سندھ سے ایک روزانہ اخبار نکلتا تھا۔

ہفتہ وار اخباروں میں دیوان سنگھ مفتون کا ریاست عام لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔ دہلی سے شوکت فہمی نے طاقت نکالا، بھوپال سے ندیم، بمبئی سے صداقت اور مصور، کلکتہ سے ہند مدراس سے سہیل، بنگلور سے ملت، اور قوم، رنگون سے میونسپل گزٹ اور کراچی سے بلوچستان جدید اور الحبیب، اور ان کے علاوہ چھ اور ہفتہ وار اخبار نکل رہے تھے۔ لکھنؤ سے عبدالماجد دریا آبادی کا سچ جو بعد کو سہ روزہ صدق میں تبدیل ہو گیا، عوام و خواص میں بہت مقبول ہوا، بہار سے ۳۷ء میں اخبار آئینہ نکلتا تھا۔ ایبٹ آباد (سرحد) سے عزیزالملک نکلا، کولہ (بہار) سے البرہان، ناگپور سے مسلم، کشمیر سے النور، بمبئی سے مختلف ۱۳۱ ہفتہ وار اخبار جاری ہوئے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں اردو کے اخبارات کی تعداد جو یو۔ پی اور پنجاب میں چھپتے تھے ایک سو کے قریب تھی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ تعداد تقریباً آٹھ سو تک پہنچ گئی جن میں تین سو کے قریب ہفتہ وار اور ماہانہ رسالے ہیں۔

لاہور کے پرانے اخبارات میں سے اکثر جاری ہیں ان میں چند نئے اخبارات امروز اور نوائے وقت کا اضافہ ہوا ہے اس وقت پاکستان

سے کئی روز نامے نکل رہے ہیں۔ صرف کراچی سے دس کے قریب ہفتہ وار اور روزانہ اخبار نکل رہے ہیں۔ جن میں امروز، انجام اور جنگ عوام میں زیادہ مقبول ہیں۔ ڈان اردو کا لیتھو ٹائپ میں نکلنا ایک جدید اضافہ سمجھنا چاہیئے۔ اردو اخبارات کے ساتھ ساتھ اردو رسائل کا جائزہ لینا بھی نہایت ضروری ہے کہ انہی کی بدولت اردو زبان و ادب نے نہایت سرعت کے ساتھ اپنی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔

۱۸۸۲ء میں مولانا عبدالحلیم شرر نے سب سے پہلا ادبی رسالہ محشر لکھنؤ سے شائع کیا۔ جو دو سال کے بعد بند ہو گیا پھر ۱۸۸۶ء میں انہوں نے اپنا مشہور رسالہ "دلگداز" نکالا۔ اس رسالہ نے اردو کے کئی مضمون نگار پیدا کیئے اور ان کو نثر نویسی کا جدید طرز سکھایا۔ ہردوئی سے حکیم محمد علی طبیب نے اسی زمانے میں مرقع عالم جاری کیا تھا جو دلگداز کا حریف سمجھا جاتا تھا۔ اس میں حکیم صاحب کے مسلسل ناول چھپتے تھے۔ اس کے ابتدائی مضمون نگاروں میں مولوی ابوالکلام اور ان کے بھائی مولوی ابوالنصر تھے۔ ۱۸۸۷ء میں حیدرآباد سے پہلا علمی رسالہ مخزن الفوائد نکلا جس کے ایڈیٹر نواب عماد الملک بلگرامی تھے۔ ۱۸۸۸ء میں رسالہ حسن نواب حسن عبداللہ عماد نواز جنگ کی ادارت میں نکلا۔ اس کے مضمون نگاروں میں نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور مولانا شبلی ایسے اردو کے فاضل اور جید انشاپرداز تھے۔ بابر پر مولانا شیروانی کا انعامی مضمون، اور مولانا شبلی کا مضمون "کتب خانہ اسکندریہ" پر سب سے پہلے اسی رسالہ میں شائع ہوئے۔ یہ رسالہ ۱۸۹۴ء تک جاری رہا۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے معارف نکلا جس کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم اور محمد اسمٰعیل خاں تھے۔ یہ علمی ادبی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ تھا جو ۱۹۰۱ء تک جاری رہا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو کا پہلا علمی پرچہ مخزن ۱۹۰۱ء میں

لاہور سے سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے جاری کیا اس نے اردو کے بہترین نثر نگار اور شاعر پیدا کئے۔ نیچرل شاعری بہت کچھ اسی کی بدولت پروان چڑھی مولانا شیروانی، سید علی بلگرامی، ایسے بلند پایہ اہل قلم اس میں مضامین لکھتے تھے سر محمد اقبال، میر غلام بھیک نیرنگ، اعجاز حسین چودھری خوشی محمد خان ناظر، سید علمدار حسین واسطی، حسرت موہانی، شاد عظیم آبادی، سرور جہان آبادی اور نادر کاکوروی کا کلام اکثر اس میں چھپتا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں حسرت موہانی نے علی گڑھ سے اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ جس میں ادبی مضامین اور قدیم و جدید شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔ بعد کو یہ "تذکرۃ الشعراء" کے نام سے نکلنے لگا تھا۔ اسی زمانے میں علی گڑھ سے منتھلی میگزین میر ولایت کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اسی کے قریب علی گڑھ کے طلبائے قدیم کا رسالہ "اولڈ لوائے" بھی بڑی آن بان سے نکلتا تھا جس میں علی گڑھ کے قابل ترین "بوڑھے بچے" مضامین لکھتے تھے۔

۱۹۰۳ء میں مولوی ظفر علی خاں نے حیدر آباد سے دکن ریویو اور افسانہ جاری کیا۔ ۱۹۰۳ء میں لکھنؤ سے "الندوہ" مولانا شبلی اور مولانا شیروانی کی مشترکہ ادارت میں نکلا جو ندوۃ العلماء کا علمی رسالہ تھا۔ مولانا شبلی نے اپنے اکثر مقالات اسی کے لئے لکھے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں منشی دیا نرائن نگم کی ایڈیٹری میں رسالہ "زمانہ" کان پور سے نکلنے لگا۔ اسی سال منشی نوبت رائے نظر لکھنوی نے خدنگ نظر نکالا۔ ۱۹۰۸ء سے اردو کا مشہور ماہنامہ ادیب الہ آباد سے جاری ہوا جس نے یورپ کے اعلیٰ علمی و ادبی پرچوں کا نمونہ پیش کیا۔ ملک کے بہترین اہل قلم اس میں مضامین لکھتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں مولوی اسحاق علی علوی معروف بہ ظفر الملک نے الناظر لکھنؤ سے جاری کیا۔ ۱۹۱۱ء میں ظفر علی خاں کا پنجاب ریویو نکلا، ۱۹۱۱ء میں پیارے لال شاکر میرٹھی کا العصر لکھنؤ سے، ۱۹۱۳ء میں سید شاہ نظام الدین دلگیر اکبر آبادی کا نقاد

آگرہ سے ... ہوش بلگرامی کا ذخیرہ، ۱۹۱۶ء میں اعظم گڑھ سے۔
معارف، ۱۹۱۸ء میں چکبست کا صبح امید لکھنؤ سے شائع ہوئے یہ وہ نامی
رسالے ہیں جنہوں نے نظم ونثر دونوں سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔

اسی زمانے میں نگار لکھنؤ سے، بدایوں سے نقیب، علی گڑھ سے علیگڑھ
میگزین، اور کچھ برسوں کے بعد سہیل منشی رشید احمد صدیقی کی ادارت میں
نکلا۔ دہلی کے جامعہ ملیہ کا رسالہ جامعہ، شیخ محمد اکرم کا تمدن، شاہد احمد کا ساقی
اور لاہور کے کئی ادبی رسائل ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، عالمگیر، نیرنگ خیال
وغیرہ جاری ہوئے۔ تنویر الشرق کلکتہ سے، جادو ڈھاکہ سے، ندیم گیا سے،
اسی طرح بمبئی سے تنویر، صبح امید، مدراس سے سفینہ اور البشریٰ، بنگلور سے کوثر
شمالی ارکاٹ سے مصحف، آمبور سے مینا، پشاور سے سفیر سخن اور میزان الافکار
کراچی سے زبان ہند اور ارمغان ملتان سے نخلستان اور بہاولپور سے لالہ صحرا
۳۰ء سے ۳۶ء تک نکلے۔

کاٹھیاواڑ ایسے دور افتادہ ملک سے بھی ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۳ء میں
دو اچھے رسالے میری نگرانی اور ادارت میں جاری ہوئے یعنی زبان مانگرول
سے اور شہاب جوناگڑھ سے دو دو سال جاری رہنے کے بعد بند ہوگئے۔

سہ ماہی رسالوں میں اورنگ آباد سے اردو ۱۹۲۱ء میں مولوی عبدالحق
صاحب کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ انجمن ترقی اردو کا ادبی تنقیدی اور تحقیقی
رسالہ ہے اورینٹل کالج کا سہ ماہی میگزین پروفیسر محمد شفیع کی ادارت میں
۲۵ء سے نکلتا ہے جس میں اسلامی ادبیات تاریخ اور علوم وفنون پر
محققانہ مقالے اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اردو کا تیسرا سہ ماہی رسالہ ہندوستانی
اکاڈمی کا ہندستانی ہے جو ۱۹۳۱ء سے الہ آباد سے ڈاکٹر تاراچند کی ایڈیٹری
میں جاری ہوا۔ اردو کے بہترین رسائل میں ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں حیدرآباد دکن سے کئی علمی ادبی اور

تاریخی رسالے جاری ہوئے جنہوں نے اردو ادب کی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں صحیفہ، تاج، تجلّی، تاریخ، سب رس، مجلہ عثمانیہ، الموسیٰ، اور مجلہ طیلسانیین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس وقت پاکستان سے اردو رسائل خاصی تعداد میں نکل رہے ہیں۔ ان میں مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا، طلوع اسلام، ماہ نو، نیا دور، سنگِ میل، نقوش، فاران وغیرہ اچھے رسائل ہیں۔

اردو کے اخبارات و رسائل کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اگر ان کے ساتھ ساتھ ہم اردو کے مشہور اخبار نویسوں اور ارباب صحافت کا ذکر نہ کریں ان میں بڑے بڑے نامور انشا پرداز اور مصنّفین بھی شامل ہیں۔ ان میں بھی اولیّت کا سہرا سرسید احمد خان کے سر ہے۔ مولانا شبلی، نواب شیروانی، نواب عماد الملک بلگرامی نواب عماد نواز جنگ اور مولوی عبدالحق جیسے فاضل ادیب علمی رسائل کے مدیروں کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ ہمارے مشہور ادیب اور افسانہ نگار سرشار اور شرر کا شمار اردو کے زبردست صحیفہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم، مولوی سراج الدین، مولوی ممتاز علی، خان بہادر بشیر الدین، منشی محبوب عالم، منشی سجاد حسین، مولانا عمادی اور انشاء اللہ خاں اردو کے ممتاز اخبار نویس تھے۔ بیسویں صدی کے صحافیوں میں مولانا ظفر علی خان کا نام سرفہرست ہے۔ سید جالب گویا اس فن کے امام تھے۔ مولانا محمد علی مرحوم اردو اور انگریزی دونوں کے زبردست مسلّم اخبار نویس تھے۔ مولوی عبدالماجد دریا آبادی دنیائے صحافت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ادبی صحافت میں میر ناصر علی، حکیم برہم ریاض خیر آبادی، خواجہ حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، سر عبدالقادر، پنڈت چکبست، رشید احمد صدیقی، نیاز فتحپوری، ناظر الحسن ہوش بلگرامی، پیارے لال شاکر مشہور اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ دور جدید کے صحافیوں میں قاضی عبدالغفار، غلام رسول مہر، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، چراغ حسن

حسرت، عبدالمجید سالک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہاں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف زبان و ادب کی حد تک ہے قومی اور سیاسی یا صحافتی نقطہ نظر سے اس پر بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے امید ہے کہ ہمارے دارالعلوموں کے طلبا اس کی طرف توجہ کریں گے اور اس کو اپنی علمی تحقیقات کا موضوع قرار دیں گے۔

اُردو کے صحافتی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ ان اخبارات و رسائل کی جلدوں میں بھرا پڑا ہے جس کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض کتب خانوں اور علمی و ادبی اداروں، مثلاً مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ، انجمن ترقی اُردو اور حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اُردو میں بعض اخبارات و رسائل کی جلدیں محفوظ ہیں۔ اس آخرالذکر ادارے کے کتب خانے میں اُردو کے پہلے اخبار "اُردو اخبار" کی جلدیں ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۴ء تک محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ غدر سے پہلے کے اخبارات: عمدۃ الاخبار، اخبار مالوہ، اخبار قران السعدین، جامع الاخبار، مجمع الاخبار، اعظم الاخبار، اخبار الحقائق، احسن الاخبار اور محب ہندکی جلدیں بھی محفوظ کی گئی ہیں۔ احسن مارہروی مرحوم نے نمونہ منشورات میں اکثر اخبارات کے مضامین کے بعض حصے بطور نمونہ نقل کئے ہیں۔ بعض اُردو کے رسائل کے انتخابات کتابی صورت میں مرتب ہو چکے ہیں۔ جن میں تہذیب الاخلاق کی چار جلدیں، مرقع عالم (ہردوئی) کا انتخاب تین جلدوں میں "گلدستۂ پنچ" کے نام سے اودھ پنچ کے مضامین کا انتخاب مرتبہ پنڈت چکبست رسالۂ مخزن کا انتخاب تین جلدوں میں، الہلال کے مضامین کا انتخاب اور اودھ پنچ کے مضامین کا مجموعہ ایک مدت ہوئی شائع ہو چکے ہیں اور اُردو کے ادب العالیہ میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ اُردو کے مشہور اور چوٹی کے رسائل سے بلند پایہ مضامین کا انتخاب اور کتابی صورت میں ان کی اشاعت نہایت اہم اور ضروری کام ہے جبکی طرف ہمارے اہلِ علم اور ناشرین کو توجّہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان اخبارات و رسائل نے اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور اس کے ارتقا میں زبردست حصّہ لیا ہے جسکو اُردو ادب کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مضامین اختر جوناگڑھی

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ کراچی